زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

سہ ماہی اُردو

ثـالـث

کتابی سلسلہ..... ۱

جلد- ۱ شمارہ - ۱

اکتوبر ۲۰۱۳ تا دسمبر ۲۰۱۳ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

نائب مدیر نظام الدین قاسمی

رابطہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے تاج آفسیٹ پریس سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۱۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۲۵/روپے)

سالانہ : .....۴۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۵۰۰/روپئے)

خصوصی تعاون : .....دس ہزار روپئے یا ۲۰۰/امریکی ڈالر

''ثالث'' غیر ممالک میں

''ثالث'' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	ساٹھ (۶۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پینتس (۳۵) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پینتش (۳۵) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک۔سو (۱۰۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	دس (۱۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
قطر:	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
کویت	:	آٹھ (۲۰) کویتی دینار
پاکستان	:	بارہ سو (۱۲۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتہ پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبرشپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائز ڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Union Bank of India
Munger Branch
A/c No. 389002010003800
IFSC Code-UBINO538906

◀◀ ● ▶▶

فہرست

اداریہ	ادارہ	۵
مہمان اداریہ	مشرف عالم ذوقی	۶
حمد	شمیم فاروقی / محمد شفیع الرحمٰن شفیع	۱۱۔۱۲
نعت پاک	محمد شفیع الرحمٰن شفیع / نشتر امروہوی / منظور قاضی	۱۳۔۱۴۔۱۵

افسانے

جیرے کی روانگی	علی اکبر ناطق	۱۶
پانچ روپے کا متروک نوٹ	محمد حامد سراج	۲۶
منزل	عامر ابراہیم	۳۵
پہلی صف	عمر احمد بنگش	۳۹
پکڑ	وحید احمد قمر	۴۳
شبانہ کا شوہر	نور العین ساحرہ	۴۹
خوابوں سے ڈرا ہوا آدمی	منیر احمد فردوس	۵۳
یوڈیم سالا	نعیم بیگ	۵۷
عبدل کی قسمت	فرخ ندیم	۶۰
جرم	تبسم فاطمہ	۶۹
اک بات ذرا سی	محمد نعیم دیپالپور	۷۵
وصالِ یار	ناصر علی وارثی	۷۹
معرفت	علیم اللہ علیم	۹۱
دیوار	فرخندہ رضوی	۹۴
میاں جی	شاہین کاظمی	۹۷

غیر ملکی ادب

میدانوں میں	میکسم گورکی	۱۰۲

ناول کا ایک باب

اُڑنے دو ذرا	مشرف عالم ذوقی	۱۱۳

تنقید

ظفر کمالی کی رباعیاں	صفدر امام قادری	۱۳۶
اصغر گونڈوی: حیات اور صوفیانہ شاعری	شبنم افروز	۱۵۴
نیاز اختر کی کہانیوں کے اشاریے	اسلم بدر	۱۶۶

غزلیں

عرفان ستار / نصیر احمد ناصر / ساجد حمید / معراج رسول / ذوالفقار نقوی / مسعود حساس / واقف انصاری / اصغر شمیم / سلیم انصاری / پرویز ساحر / مسلم سلیم ۱۷۳۔۱۸۴

نظمیں

رَت جگے	علی اکبر ناطق	۱۸۵
مرگی زدہ بچہ	احمد سہیل	۱۸۶
چند نظمیں	تبسم فاطمہ	۱۸۸
زندہ ہوں میں.....	مسرت زماں	۱۹۲
موت سے پہلے	رضی شہاب	۱۹۳
روپ سروپ کا جیون دھارا	کے بی فراق	۱۹۵
ٹڈنائٹ چلڈرین	کے بی فراق	۱۹۶

گوشہ مہدی علی

کوائف		۱۹۷
مہدی علی	اہل قلم کی نظروں میں	۱۹۸
غزل اور مہدی علی	پروفیسر جابر حسین	۲۰۰
مہدی علی-ایک بہترین دوست	شفیع مشہدی	۲۰۱
ورق در ورق	ڈاکٹر سہیل	۲۰۴
مہدی ہے جس کا نام	اقبال حسن آزاد	۲۰۸
غزلیں	مہدی علی	۲۱۶

مکتوبات

نصیر احمد ناصر، عامر ابراہیم، محمد حامد سراج، علی اکبر ناطق، مشرف عالم ذوقی، صفدر امام قادری، نعیم بیگ، منیر احمد فردوس، ذوالفقار نقوی، محمد نعیم دیپالپور، علیم اللہ علیم، عمر احمد بنگش، تبسم فاطمہ، سلیم انصاری، رضی شہاب، شبنم افروز ۲۲۲

اداریہ

ثالث کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔اس میں کہنہ مشق قلم کاروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی مناسب نمائندگی دی گئی ہے۔اس میں مختلف رنگ کے افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ اپنے رنگ میں کامیاب ہے۔مشرف عالم ذوقی نے اپنے زیر طبع ناول کا ایک باب عنایت فرمایا اور مہمان اداریہ بھی تحریر کیا۔ادارہ ان کا شکر گذار ہے۔شعری حصے کا انتخاب بھی کافی چھان پھٹک کر کیا گیا ہے۔حمد اور نعت شریف کی شمولیت یقیناً بابرکت ثابت ہوگی۔

◀◀ ● ▶▶

یہ خبر نہایت رنج وغم کے ساتھ تحریر کی جارہی ہے کہ پروفیسر لطف الرحمان 31/اگست 2013ء کو رات کے ساڑھے دس بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔وہ 2/فروری 1941ء کو ضلع دربھنگہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔پٹنہ یونیورسیٹی سے اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ان کی اس ملازمت کا آغاز اے۔این کالج پٹنہ سے ہوا تھا۔وہ اس کالج کے شعبہء اردو کے پہلے استاد تھے۔ترقی کرتے ہوئے وہ بھاگلپور یونیورسیٹی کے صدر شعبہء اردو ہوئے اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔انہوں نے سیاست کے مدان میں بھی قدم رکھا اور راجد کے دور حکومت میں وزیر بھی رہے۔

وہ ایک بہت اچھے اور جدید لب ولہجے کے شاعر تھے۔انہوں نے نقاد کی حیثیت سے بھی ایک منفرد شناخت قائم کر لی تھی۔کسی زمانے میں افسانہ نگاری سے بھی ان کی دلچسپی رہی تھی۔وہ ایک اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے۔وہ باب اشرفی کے بعد خطابت کے لحاظ سے بہار میں ان کی شخصیت غنیمت تھی۔اب بہار اس سے محروم ہوگیا۔ادارہ ''ثالث'' اس غم میں برابر کا شریک ہے۔خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین!

''ثالث'' کے آئندہ شمارے میں پروفیسر موصوف ومغفور کی شخصیت اور فن پر گوشہ شامل ہوگا۔''تازگی ء برگ نوا'' کے حوالے سے ڈاکٹر منظر اعجاز کا مضمون اس گوشے کے لئے حاصل ہو چکا ہے۔دیگر قلم کار حضرات سے مضامین کی گزارش ہے۔

یہ رسالہ آپ کو کیسا لگا۔آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔(ادارہ)

◀◀ ● ▶▶

● **مشرف عالم ذوقی**

قصہ ہے، کہانی ہے، پہیلی ہے.....

روایت یوں ہے: ایک دادی اماں تھیں، بہت سے بچے تھے اور نہیں ختم ہونے والا قصہ تھا۔
رات ہوتی تو دادی اماں، بچوں کو گھیر کر بیٹھ جاتیں اور قصہ شروع ہو جاتا۔وہی نہیں ختم ہونا والا قصہ۔
روایت یوں ہے: وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔وہی دادی اماں تھیں۔وہی بچے تھے وہی قصہ تھا۔
لیکن.....اب بچے دادی اماں کا ساتھ چھوڑنا چاہتے تھے۔وہ انٹرنیٹ، گیم شو، کامکس، ڈبلیو ڈبلیو ایف یا کوئی دلچسپ فائٹ سیکوئنس دیکھنا چاہتے تھے.....
دادی اماں اپنے اس شغل، کو جاری رکھنا چاہتی تھیں۔انہیں خوف تھا وہ بالکل اکیلی اور تنہا ہو چکی ہیں.....یہ شغل بھی ہاتھ سے گیا تو ان کی اہمیت ہی کیا رہ جائے گی۔قصے کہانیوں میں اور گھر میں؟
اور قصہ — برسوں سے، بار بار ایک ہی سر میں سنائے جانے والے قصے کو اب نیند بھی آنے لگی۔
روایت یوں ہے:
دادی اماں نے کہانی شروع کی۔
بچوں نے بوجھل پن کا مظاہرہ کیا
اور قصہ....اچانک وہ اچھل کر دادی اماں کے ہونٹوں سے نکل کر، پھدکتا ہوا دادی اماں اور بچوں کے سامنے آ گیا۔
''سنو میں جارہا ہوں''
لیکن کہاں جارہے ہو؟ دادی اماں بوکھلا کر چیخیں۔
''تم سب سے دور۔تمہیں اب میری ضرورت نہیں رہی۔قصہ جاتے جاتے رکا — سنو، میں اب کبھی واپس نہیں آؤں گا۔
دادی اماں مغموم ہوگئیں۔
دادی اماں اس دن سے کسی بھی گھر میں نہیں پائی جاتیں۔
روایت یوں ہے کہ اس دن سے قصہ کبھی گھر میں دیکھا نہیں گیا۔
اور روایت یہ بھی ہے کہ اسکول کے موٹے موٹے وزنی بستے اٹھانے والے بچوں کو اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی۔

۱۹۴۸ء میں ژاں پال سارتر کی اہم کتاب منظر عام پر آئی تھی۔ ادب کیا ہے۔ اس کتاب پر سارتر نے دلائل کے ذریعے اپنے موقف کا اظہار کیا تھا۔ سارتر کے مطابق عصری ادب کو جمالیات اور لفظوں کی قلابازی سے بچنا ہوگا۔ عصری ادب نئے سماجی نظام اور نئی سیاسی صورتحال سے گریز کر ہی نہیں سکتا۔ سارتر نے صاف طور پر کہا..... ایک مصنف کے طور پر ہمارا کام اپنے عہد کی نمائندگی کرنا ہے۔ اور اپنے ہونے کی گواہی دینا بھی ہے۔ سارتر نے یہ بھی کہا کہ Poetry میں ہم زبان کے ساتھ کھلواڑ تو کر سکتے ہیں، تجربے بھی کر سکتے ہیں مگر فکشن کے لئے یہ تجربے خطرناک ہوں گے۔ سارتر کی نظر میں لکھنے والے کا کام ہتھیار کو ہتھیار رکھنا ہے، یعنی جیسا کہ وہ ہتھیار ہے۔ اگر لفظ، مرض میں مبتلا ہیں تو پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس مرض (لفظ) کا علاج کریں۔ شاید اس لئے سارتر نے جدید ادب کو ایک اور نام دیا۔ لفظوں کا کینسر۔

ہم کیوں لکھتے ہیں؟ کیا لکھنا ایک میکانیاتی عمل کا حصہ ہے۔ کیا لکھنے سے کبھی ہمارے سماج یا معاشرے میں کوئی تبدیلی بھی آتی ہے۔ ترقی پسند جن تبدیلیوں کی باتیں کرتے ہوئے سامنے آئے تھے، کیا ان تبدیلیوں نے کسی حد تک سماج اور معاشرے کا چہرہ بدلنے میں کوئی کردار ادا کیا تھا؟ یا جدیدیت کو تسلیم کریں تو لکھنا محض ادب کی حد تک ہے اور اس سے کسی قسم کی تبدیلی کی امید ہی فضول ہے۔ نئی کہانی کیا ہے؟ کیا وقت کے ساتھ ادب کا منظر نامہ بھی تبدیل ہوتا ہے؟ صارفیت نے کس حد تک ہماری زندگی کو متاثر کیا ہے؟

نئی کہانی کے منظر نامہ پر غور کرتے ہیں تو ہزاروں سوال ہیں جو سانپ کی طرح کنڈلی مار کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج زندگی کی ریس میں بھاگتے ہوئے عام آدمی کو ادب کی ضرورت نہیں ہے۔ نئی تکنالوجی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی سے ہی ادب کو خارج کر دیا ہے۔ سوال یہاں سے بھی پیدا ہوتے ہیں جب عام آدمی نے ادب کو مسترد کر دیا ہے تو کیا ہم محض خوش فہمیوں کا شکار ہیں؟ ادب برائے زندگی اور سماجی حقیقت پسندی کے دعوے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ ہم کیوں لکھتے ہیں؟ کا جواب آج تک نہیں مل سکا۔ مارکیز سے لے کر مویان اور پائیلو کو لہوتک اس کے جواب مختلف ہوں گے..... اردو میں بھی اکثر ایسے سوالوں کے جواب تلاش کیے جاتے ہیں پھر بھی کیوں لکھتے ہیں، کی الجھن دور نہیں ہوتی — آغاز سے ہی اردو ادب کو تحریکوں کا ساتھ ملا اور ہر ادبی تحریک نے اچھے ادب کے لئے راستہ بھی ہموار کیا۔ رومانی تحریک سے لے کر ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تک جہاں برے لکھنے والے سامنے آئے وہیں بہتر لکھنے والے بھی تھے، جن کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس طرح کی تحریکوں کا سامنے آنا دراصل یہ باور کراتا ہے کہ ہر عہد میں ادبی تاریخ راہ نما کے فرائض بھی انجام دیتی ہے اور اس کے پس پردہ ایک زبان، اس کی روایت اور اس کے کلچر کو از سر نو تنقیدی اصولوں کی روشنی میں پرکھنا چاہتی ہے۔ عرصہ پہلے ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے رسالہ عصری ادب میں نورتن کے نام سے ادب کا جائزہ لیا تھا تو اس وقت جدیدیت کے فروغ کے باوجود ترقی پسند تحریک کا اثر زائل نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر محمد حسن دونوں اپنی اپنی سطح پر تحریک کو فروغ دے رہے تھے۔ ۲۰۱۲ء کے ختم ہونے تک اردو ادب تحریکوں سے باہر نکل کر ایک ایسی بھول بھلیاں کا شکار ہے جہاں راستہ گم ہے اور تہذیبوں کا تصادم جاری۔ ایک مردہ زبان کو زندہ رکھنے کی کوششیں اور ہندستانی لکھاڑیوں کا حال یہ، کہ مشکل سے کبھی کبھی سال دو سال پانچ سال میں کوئی ایک کہانی سامنے آجاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں کی ایک بڑی قطار سامنے

آ گئی تھی۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے بھی لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ تحریکیں کہیں نہ کہیں ادیب کو خواب سے جگانے کا کام کرتی ہیں اور تحریکوں کے سست یا کمزور ہوتے ہی ادب بھی حاشیہ پر چلا جاتا ہے تو کیا سن ۲۰۱۳ تک آتے آتے اردو ادب حاشیہ پر چلا گیا ہے؟

اردو ادب کی صحیح صورتحال کا جائزہ لیجئے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان دنوں ادب بے سمت ہے اور لکھنے والے خاموش۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ گفتگو ہندستانی منظر نامہ کو لے کر ہو رہی ہے۔ پاکستان کا منظر نامہ اٹھا لئے تو علی اکبر ناطق سے لے کر طاہرہ اقبال تک، ادب کے نئے منظر نامے میں کئی ایسے دستخط اپنی مضبوط شناخت کے ساتھ سامنے آئے ہیں جن کے بغیر نئے افسانے پر گفتگو ممکن ہی نہیں ہے۔ انور سین رائے کی کہانی کا یہ اقتباس دیکھیے —

''اسی شام جب مسخرہ کرتب دکھا کر لوگوں کو ہنسا رہا تھا ایک بلی چھولداری میں گھس آئی، طوطے نے بہت شور مچایا اور پوری آواز سے مسخرے کو پکارا، لوگوں کے قہقہوں کی آوازیں اتنی اونچی تھیں کہ کسی کو کوئی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی لیکن پھر بھی مسخرے کو طوطے کی آواز سنائی دی لیکن اس نے اس پر توجہ نہیں دی اور سوچا کہ ضرور یہ اس کا وہم ہے یا اس کی بیوی، گدھے اور ریڈیو کی کوئی نئی کارستانی۔ وہ فریاد کرتی آواز کو جھٹک کر لوگوں کو ہنسانے پر لگا رہا۔ بلی نے ایک ایسی چھلانگ لگائی کہ طوطے کے نیچے جھولے کی رسی پر ڈھیلی پڑی اور وہ نیچے زمین پر آ رہا۔ اب بلی اس کے سامنے تھی۔ آوازیں اس کے حلق سے نکلنا بند ہو چکی تھیں، اس کا جسم ایسے بے حرکت ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو، اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔

قصہ گو کی آنکھیں بند تھیں اور اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

یہ صرف ایک قصہ ہے میں کبھی کسی مسخرے سے نہیں ملا، کسی مسخرے نے کبھی اپنی بیوی کو نہیں چھوڑا، کسی گدھے نے کبھی انسانوں کی زبان میں بات نہیں کی اور کوئی ریڈیو کبھی اپنی مرضی سے نہیں چلا، یہ سب ایک قصہ ہے صرف قصہ، لیکن جب لوگ اٹھ کر جا رہے تو قصہ گو کو پھر وہی آواز سنائی دی جو ہر بار اسے اس قصے کے انجام پر سنائی دیتی تھی اور اس نے ایک بار پھر اپنے آپ سے وہی بات کہی جو وہ ہر بار کہتا تھا: کاش اس دن میں نے پر کھولنے کے لئے طوطے کی بات مان لی ہوتی۔''

— سرکس کے ایک مسخرے کا اختتام (انور سن رائے)

مسخرہ، مسخرے کی بیوی، طوطا اور گدھے کو لے کر بنے گئے اس قصے میں آج کی اردو کہانی کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ پرانے لوگ ایک ایک کر کے ہمارے درمیان سے اٹھنے لگے ہیں۔ قصہ گو خاموش ہے۔ تحریکیں بے اثر اور لکھنے والے دو چند — پڑھنے والے اور بھی کم — تخلیقی کائنات کے سوتے خشک ہوتے جا رہے ہیں — بڑے نام کنارے ہو لئے۔ کچھ باقی ہیں۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی بھی تازہ دم لیکن آپ بہتر جانتے ہیں کہ خموشی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی جمود کی کیفیت کے بعد جو ادب سامنے آتا ہے، وہ نئی تعبیروں اور نئی فکر کے ساتھ اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ نہ صرف اس میں زندگی کے نئے فلسفے شامل ہو جاتے ہیں بلکہ ایک عہد کے آئینہ کو بھی اس تخلیقی کائنات میں بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

نئی کہانی کے پس منظر میں تیز گامی کے ساتھ سائنس اور کلچر نے بھی اپنی جگہ محفوظ کر لی ہے — اس نئے صارفی سماج کی اپنی تہذیب، اپنا منظر نامہ ہے — زندگی بہت حد تک بدل چکی ہے — نوجوانوں کی فکر میں سب سے زیادہ تبدیلیاں آئی ہیں۔ عہد کی ان تبدیلیوں نے فلم اور سماج دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ہندستانی فلموں کا رخ کریں تو درخت کی چھاؤں میں گانا گانے والے ہیرو ہیروئن کا دور رخصت ہو چکا ہے۔ ملٹی پلیکس سنیما نے غور وفکر کرنے والی فلموں کا آغاز کر دیا ہے۔ سماج سے سیاست اور نئی دنیا کا چہرہ بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے اس کا اثر اردو ادب پر بھی پڑنا تھا۔ ہم ایک ایسے کنفیوژن یا Re-mix کلچر کا حصہ بن رہے ہیں جہاں مارخیز، بورخیس سے لے کر مویان تک کو بیانیہ سے الگ داستانوں، اساطیر اور Folk کہانیوں میں پناہ تلاش کرنی پڑتی ہے۔ سپاٹ بیانیہ کا دور رخصت ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ فیوژن یا اس ری مکس تہذیب میں کچھ بھی سپاٹ نہیں ہے۔ نتیجتاً کہانیاں اندھیرے، ناامیدی، خدا کی شناخت اور زندگی کے نئے فلسفوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں — رحمٰن عباس کی طویل کہانی خدا کے سائے میں آنکھ مچولی دیکھیے تو یہاں خدا حیران کرنے والے لوگوں کے درمیان سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ انور سین رائے کی کہانی دیکھیں تو خدا کی ذات مسخرے کی دنیا میں نئے سرے سے اپنی شناخت کر رہی ہے — نئی صدی کے تیرہ برسوں میں نئی کہانی کا نہ صرف مزاج بدلا ہے بلکہ نئی کہانی میں ہیئت، اسلوب اور زبان و بیان کی سطح پر بھی کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔

کہانی اپنے نئے منظر نامہ میں اتنی بھیانک کیسے ہوگئی تو اسکا سیدھا اور آسان سا جواب ہے، کیونکہ دنیا بھیانک ہو چکی ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے زمانہ پہلے ہرمن ہیسے نے کہا تھا۔ پرانی دنیا کا زوال نزدیک آچکا ہے۔ ایک نئی دنیا جنم لینے والی ہے۔ بھیانک تباہی کا اندیشہ ہے۔ غور کریں تو اس بھیانک تباہی کا اندیشہ سچ ثابت ہوا ہے۔ سن ۲۰۰۰ کی شروعات ہی ایک اغوا کیے گئے طیارے سے ہوئی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ کا دن دہشت گردی کے عروج اور دنیا کے خاتمے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ سن ۲۰۰۰ کے بعد سیاسی اور سماجی تبدیلیوں نے ایک عالم کو متاثر کیا۔ یہاں اسامہ ہیرو تھا اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملہ ایک ایسا حملہ تھا جو تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کا نیا منظر نامہ لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہندستان کے سیاسی پس منظر میں دیکھیں تو ان تیرہ برسوں میں 26/11 اور گودھرا حادثہ نے آنکھوں کی نیند چھین لی۔ سیاست کے شعلوں نے بہت حد تک تہذیب وتمدن اور سماجی ڈھانچے کو بھی متاثر کیا تھا۔ ڈپریشن اور اس سے ملے جلے امراض میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اور حاصل یہ تھا کہ بہت سے دکھوں نے اور ان کے اثرات نے انسان کو اکیلا اور بے دست و پا بنا دیا تھا۔ دیکھا جائے تو کہانیوں نے دکھ کی اسی زمین سے موضوعات تلاش کیے تھے۔

''اے لمحوں کے بخت تخلیق کرنے والے خدا!
آنے والے لمحوں کو گزر چکے لمحوں سے مختلف کر۔
انہیں ڈرون حملوں اور خودکش دھماکوں کے عذابوں سے نجات دے۔
انہیں نہ ٹلنے والے عذاب لمحوں کی پچھل پیریوں کے آسیب سے بچا۔
اے خدا!
اے خستہ بدنوں میں صوت، صوت میں بیان اور بیان میں تخیل کی مقدس اڑان رکھ دینے والے خدا!

ہمارے تخیل کی اڑان میں مقدس خواب رکھ دے۔
اور ان خوابوں کو تعبیر کی امید سے اجال دے۔
— حمید شاہد (نئے سال کی پہلی دعا)

نئی صدی کے تیرہ برسوں میں کئی بڑے نام خاموش ہو گئے۔ ایسے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جنہوں نے ادب کی سمت و رفتار کو آگے بڑھانے میں تعاون دیا ہے۔ اقبال مجید، غضنفر، حسین الحق، شوکت حیات، سلام بن رزاق، شموئل احمد، نعیم کوثر، عبدالصمد، رتن سنگھ، یاسین احمد، ترنم ریاض، شائستہ فاخری، اقبال حسن آزاد نورالحسنین، احمد صغیر، قاسم خورشید، ام مبین، اشتیاق سعید کا سفر جاری ہے۔ نورالحسنین ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، کے ذریعہ تاریخ کو آج کے حوالہ سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ احمد صغیر مسیحائی اور رات کے حوالے سے اس تبدیلی کو محسوس کر رہے ہیں جو مغرب کے درمیان سے ہوتی ہوئی ہمارے ملک پر اثر انداز ہوئی ہے۔ شائستہ فاخری کے کئی افسانوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اردو افسانہ ابھی زندہ ہے۔ اداس لمحوں کی خود کلامی، عصمت چغتائی کی کہانی لحاف کا نہ صرف ایکسٹینشن ہے بلکہ احتجاج کے نئے دروازے بھی کھولتی ہے۔ غضنفر اپنی نئی کہانیوں میں داستان اور حکایتوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ مانجھی میں بھی حکایتیں افسانے کو آگے بڑھانے میں نہ صرف تعاون دیتی ہیں بلکہ غالب کے اشعار کی طرح کہانی کو نئی معنویت سے روشناس کراتی ہیں۔ نورین علی حق کی کہانی ایک سہما ہوا آدمی میں گلوبلائزیشن کا خطرہ صاف طور پر نظر میں آجاتا ہے۔ جامع مسجد کے علاقہ میں پولس چوکی سے گزرتا ہوا ایک مسلم نوجوان آج کے ان مسلمان نوجوانوں کا چہرہ بن جاتا ہے جو بٹلہ ہاؤس جیسے حادثے کے بعد گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہاں نام گنوانا منشا نہیں ہے۔ ادب کے بارہ برسوں میں تخلیقی کائنات میں جو تبدیلیاں سامنے آئی ہیں اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ ادب بہت حد تک سمٹ چکا ہے۔ لیکن یہ کم بڑی بات نہیں ہے کہ روزی روٹی سے رشتہ استوار نہ ہونے کے باوجود اردو ابھی بھی شان سے زندہ ہے۔ یہ ہر دور میں ہوتا ہے کہ ایک قلم خاموش ہوتا ہے اور دوسرا اسے تھامنے کے لئے آگے بڑھ جاتا ہے — کبھی کبھی گہری خاموشی اور وقت کی یلغار کو سمجھنے میں کئی برس گزر جاتے ہیں۔ آج یہی ہو رہا ہے۔ کئی بڑے قلم خاموش ہیں اور ہمیں ان کے جاگنے کا انتظار ہے۔ ادب حاشیے پر ضرور ہے لیکن ادب زندہ ہے۔

کہانی کا نیا منظر نامہ مٹھی بھر ناموں کے ساتھ نئے فلسفوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ تلاش دکھ موسم سے ہوتی ہوئی کہاں پہنچے گی، ابھی کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن حقیقت کے ساتھ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نئی کہانی پریم چند یا منٹو کی طرح سپاٹ بیانیہ کا شکار نہیں ہوگی۔ ایک طرف جدت اور حقیقت پسندی کے امتزاج سے نئے کولاژ تعمیر ہو رہے ہیں اور دوسری طرف لاسمتی، کمشدگی، فرقہ پرستی، دہشت گردی اور تیزی سے تبدیل ہوتی دنیائیں ہماری کہانیوں کا موضوع بن رہی ہیں۔ اور ان کے درمیان ایک بڑی حقیقت قاری ہے، جس کی نظر وقت اور حالات پر ہے۔ جو بہت خاموشی سے کہانی کے اس بدلتے منظر نامے کو دیکھ رہا ہے۔ کون جانے وہ کس رخ کو اپنی منظوری دیتا ہے اور کس رخ کو نظر انداز کرتا ہے —

◀◀ ● ▶▶

● شمیم فاروقی

حمد

وہی نالے وہی شام وسحر دے
مرے دشت تمنا کو شجر دے

تجھے دیکھے تجھی سے چین پائے
مرے مالک مجھے ایسی نظر دے

یہ سچ ہے خود کتر ڈالے ہیں میں نے
اب اُڑنا چاہتا ہوں بال وپر دے

اگرچہ پاؤں میں طاقت نہیں ہے
مگر پھر بھی مجھے اذن سفر دے

نہ جانے کون سی وادی میں گم ہوں
مرے مولا مجھے میری خبر دے

◄◄ ● ►►

▸ Moh:- Chak Rahmat.(Behind Millat College)
P.O:- Lal Bagh,DARBHANGA-846004

● محمد شفیع الرحمن شفیع

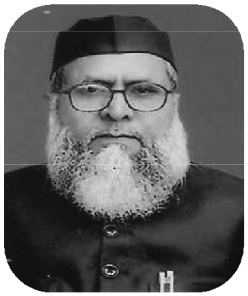

الحمد للہ!

یہ سورج میں تنویر، **الحمد للہ !** یہ پانی میں تبخیر، **الحمد للہ!**
زمیں پر یہ تصویر، **الحمد للہ !** فلک پر یہ توقیر، **الحمد للہ !**
یہ وادی میں گلزار، **الحمد للہ!**
یہ رخسارِ کہسار، **الحمد للہ!**
یہ ارض وسماوات، **اللہ اللہ!** احداس کی ہے ذات، **اللہ اللہ!**
پرندوں کے نغمات، **اللہ اللہ!** ہے رحمت کی برسات، **اللہ اللہ!**
کہستان وبحراب، **الحمد للہ!**
زمیں کا یہ مہتاب، **الحمد للہ!**
ستارے فلک پر عبادت میں رقصاں زحل، مشتری، اور زہرہ درخشاں
زمیں، مرغزار اور وادی، گلستاں بہار اور برسات، گرما، زمستاں
ہیں پابندِ فرمان، **الحمد للہ!**
سبھی میں ہیں عرفان، **الحمد للہ!**
ہمیں زندگی کا سلیقہ سکھایا شعورِ عمل اور طریقہ دکھایا
سبب اور اس کا نتیجہ بتایا سنایا، سمجھایا، پڑھایا، لکھایا
محبت عبادت ہے، **الحمد للہ!**
صداقت عبادت ہے، **الحمد للہ!**
رہے آتے اس کے رسول و پیمبر محمد ہیں آخر بزرگوں میں برتر
کتاب اور سنت، یہی اب ہیں رہبر چلیں روشنی ان کی ہم ساتھ لے کر
نظر سے ہے مستور، **الحمد للہ!**
مگر وہ نہیں دور، **الحمد للہ!**

◄◄ ● ►►

▸ Chand Manzil , Nawab Bahadur Road
Patna, City Mob. 9304856774

● محمد شفیع الرحمن شفیعؔ

نعت پاک

میرے علم و ہنر، فکر و فن سب دھواں
ہیچ میرا قلم، خاک میری زباں

میری اوقات کیا، نعتِ احمد لکھوں
پائے اقدس نہ چھو پائے وہم وگماں

آپ ہی وجہِ تخلیقِ آفاق ہیں
آپ سے آسمانوں کے اوراق ہیں

آپ ہی کے سبب پھول، خوشبو ہوا
چاند، سورج، ستارے، شفق، کہکشاں

آپ کی ذات بالا ہے ادراک سے
آینہ شانِ اعلی ہے لولاک سے

ہیں معلم کتاب اور حکمت کے بھی
آپ امی لقب اور معجز بیاں

آپ کی ہے انوکھی، نرالی ادا، چشم
و دل والے ہیں جان و دل سے فدا

درد و غم کی دوا آپ کا نام ہے
رحمتِ ہر جہاں، ہادیِ انس و جاں

بے کسوں، بے پناہوں کو مامن دیا
بے سہاروں کے ہاتھوں کو دامن دیا

ظالموں کے ہوئے خود بخود سرنگوں
دشمنوں پر ہوئے آپ یوں مہرباں

نیم وحشی درندوں کو عزت ملی
خیرِ امت میں آنے کی عظمت ملی

آدمیت کی فصلِ بہار آگئی
عدل و انصاف کا کھل اٹھا گلستاں

دشمنوں کو دیا رشتۂ دوستی
بر بروں کو دیا تحفۂ آشتی

اک مقدس نظامِ اخوت دیا
دہر کو مل گیا امن کا پاسباں

آج بھی پرسکوں زندگی کے لئے
امنِ عالم کی پابندگی کے لئے

اسوۂ مصطفے ایسا دستور ہے
جس سے بن جائے دنیا یہ جنت نشاں

نور سے تیز رفتار خیر البشر
کام آئے نہ جبریل کے بال و پر

عبد معبود کے ہو گئے رو برو
حسن ہی حسن کی جلوہ آرائیاں

اتباعِ رسولِ خدا کیجیے
اور کچھ بھی نہ اس کے سوا کیجیے

ہے یہی نسخۂ کیمیا دوستو
پورا اسلام ہے بس اسی میں نہاں

دل سے ہر آن پہنچے زباں پر دعا
ربِّ سلم علی خاتم الانبیا

ہے عبادت یہ اللہ کی بالیقیں
ہے نعتِ سرکارِ ہر دو جہاں

انس و مہر و وفا، رفق و جود و سخا
عدل و صدق و صفا، صلح و حلم و حیا

خُلق کے ان گلابوں سے آراستہ
خَلق کو دے دیا گلشنِ بے خزاں

اے شفیعِ حزیں، اپنے معبود سے کر دعا
حشر میں، جاے محمود سے

ہو شفیع الامم کی شفاعت عطا
مستقر ہو ترا جنتِ جاوداں

◀◀ ● ▶▶

● نشتر امروھوی

نعت مصطفٰی

جہاں میں کتنے رسول آئے مگر نہ آیا عظیم تم سا
ندیم تم سا، فہیم تم سا، حکیم تم سا علیم تم سا

ہزار ڈھونڈا جہاں میں دیکھا کسی نے لیکن کہیں نہ پایا
مبین تم سا، امین تم سا، حسین تم سا، وسیم تم سا

دیار لوح و قلم سے اب تک قسم خد اکی کوئی نہ آیا
ادیب تم سا، مجیب تم سا، خطیب تم سا، کلیم تم سا

چراغ ایماں جلا کے دیکھا کہیں بھی کوئی نظر نہ آیا
حمید تم سا، مجید تم سا، وحید تم سا، تمیم تم سا

خمیر آدم سے تا بہ ایں دم فراز میزاں کوئی نہ آیا
عدیل تم سا، خلیل تم سا، جلیل تم سا، حلیم تم سا

فلک کی گردش سے کیوں ڈرے وہ کہ جس نے پایا ہو زندگی میں
رفیق تم سا، شفیق تم سا، عتیق تم سا، کریم تم سا

تلاش کر کر کے تھک چکی ہے، نگاہِ عالم نہ پاسکی ہے
بشیر تم سا، نذ یر تم سا، امیر تم سا، سلیم تم سا

دلوں کی کا یا پلٹ کے رکھ دے نظام عالم کا رخ بدل دے
خبیر تم سا، کبیر تم سا، نصیر تم سا، یتیم تم سا

کرم ہو نشترؔ پہ میرے آقا کہ دوجہاں میں نہیں ہے کوئی
وقیع تم سا، رفیع تم سا، شفیع تم سا، نعیم تم سا

◀◀ ● ▶▶

595,DDA Janta Flats , GTB Enclave
Dishad GardeN , Delhi 110093

● منظور قاضی

نعت پاک

مجھے طوفاں سے چھٹکارا دلا دیجیے مرے آقاؐ
مری کشتی کنارے پر لگا دیجیے مرے آقاؐ

محمد مصطفٰےؐ ہیں آپ سب کے مشفق و رہبر
عنایت کا مجھے بھی آسرا دیجیے مرے آقاؐ

برا ہوں یا بھلا ! بس آپ ہی کا نام لیوا ہوں
مجھے اپنی نظر سے مت گرا دیجیے مرے آقاؐ

بھٹکتا پھر رہا ہوں اس جہاں میں ایک مدت سے
بلا کر اپنے قدموں میں بٹھا دیجیے مرے آقاؐ

مرے آغاز کو آساں بنایا آپ نے آقاؐ
مرا انجام بھی آساں بنا دیجیے مرے آقاؐ

اگر منظور ہو میری گذارش اے مرے آقاؐ
شفاعت کا مجھے مژدہ سنا دیجیے مرے آقاؐ

◀◀ ● ▶▶

▶ Joseph Haydn Str 32
D-84478 Waldkraiburg, Germany.

● علی اکبر ناطق

جیرے کی روانگی

قصبے اور دریا کے بیچ قبرستان پڑتا تھا لیکن اب یہ دریا وہ نہیں تھا جس کا پاٹ کبھی چار کلومیٹر کا تھا۔ اب تو یہ ایک نہر سے کچھ ہی بڑا تھا۔ جس کے بارے میں کئی ایک روایتیں مشہور تھیں۔ مثلاً ایک دفعہ یعنی آٹھ نو سو سال قبل پیر جتی شاہ دریائے بیاس کے کنارے بیٹھا تین دن تک ملاحوں کی منتیں کرتا رہا کہ اُسے پار اُتار دیں لیکن ملاح مان کے نہ دیے اور کہا کہ جب پار اُتاریں گے جب پیسے دو گے۔ لیکن اللہ والوں کے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ آخر تیسرے دن حضرت کو جلال آ گیا۔ دھوتی گھٹنوں سے اوپر کر لی اور دریا میں یہ کہہ کر قدم ڈال دیے کہ لو بھائی نہ آج سے دریا رہے اور نہ تم کشتیاں چلاؤ۔ بس پھر جیسے جیسے پیر جتی شاہ دریا میں آگے بڑھتے گئے پانی گھٹنوں گھٹنوں ہوتا گیا اور جب پار اُترے تو دریا نہر کے جتنا رہ گیا۔ پھر تو ملاحوں نے باباجی کے آگے بہت ناکیں رگڑیں ہزار منتیں کیں مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تو بھائی تب سے وہ دریائے بیاس نہر سی بہتی ہے۔ جس کا پاٹ دو سو میٹر رہ گیا اور گہرائی فقط سات آٹھ فٹ کی۔ مگر یہ سات آٹھ فٹ گہری اور دو سو میٹر چوڑی نہر بھی اطراف کے باسیوں کے لئے کم غنیمت نہیں تھی۔ مثلاً ہمارے ہی قصبے کو لیجئے ہر طرف باغ و بہاری کا عالم تھا۔ جدھر نظر پڑتی سبزہ اور چراگاہیں ہرا ہرا بکھیرتی جاتیں۔ زمینداروں نے بڑے بڑے چوڑے پائپ نہر میں پھینک رکھے تھے اور کناروں پر پیٹر انجن نصب تھے۔ وہیں سے پانی اُٹھا اُٹھا کر زمینوں کو دیتے۔ جس کے سبب دونوں کناروں پر دور تک سرسبز و شاداب کھیت، ٹھنڈی زمینیں اور ہرے بھرے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ دو طرفہ کنارے اونچے اونچے سایہ دار درختوں سے ڈھکے رہتے۔ شیشم، نیم، شریفہ، پیپل اور برگد کے پیڑوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ یعنی ٹھنڈے سائے اور سُریلی ہوائیں غنودگی پھیلاتے۔ پورے قصبے کا انحصار زراعت پر تھا اور جس کے پاس جتنا قطعہ تھا وہی گلزار تھا۔ روشوں پر قطار در قطار سینکڑوں جامنوں کے درخت چلے جاتے تھے۔ مال مویشی بے انت تھا۔ جو آٹھوں پہر نہر میں غوطے لگاتے۔ مچھلی کا شکار ایسا کہ جس کا جی چاہا دریا میں جال ڈال کر ڈمرا پکڑ لائے۔ بعضوں نے کوشش کر کے چھوٹی چھوٹی نہریں نکال لیں اور دور تک کی زمینوں کو سیراب کرنے لگے۔ قصبے کی عورتیں کپڑے بھی وہیں آ کر دھوتیں اور کھلے پانی میں خود بھی نہاتیں۔ جمعہ کے جمعہ تو کناروں پر ناریوں کی ڈاریں جاتیں اور ارد گرد سے بے نیاز تھپا تھپ کپڑے دھوتی نظر آتیں جن کی کسی ہوئی سارھیاں بھیگ کر عجب بہار بناتیں لڑکوں بالوں کی تفریح تو گویا دریا کے سبب ہی تھی۔ نیکریں پہنے ہر وقت دھما دھم ڈبکیاں لگانے میں

مگن۔ الغرض دریا کیا تھا نہرِ شداد تھی کہ بہے جاتی ہے اور سیراب کئے جاتی ہے مگر ایک قباحت اس میں ضرور تھی کہ ہر سال دو ایک آدمی ڈوب کر مر جاتے۔ کم از کم میرے ہوش میں تو کوئی ایسا سال نہیں گزرا تھا جس میں ایک یا دو آدمی ڈوب کر نہ مرے ہوں۔ دریا پر اگرچہ کسی زمانے میں ایک پل بنا دیا گیا تھا لیکن وہ پل فقط ایک پگڈنڈی تھا اور اس پگڈنڈی کے نیچے پانی بہت گہرا تھا۔ کوئی نہ کوئی بے احتیاطی میں ضرور گر جاتا اور اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ ساون بھادوں کے دنوں میں تو اکثر پل بھی ڈوب جاتا پھر دو ڈھائی مہینے کشتیاں چلتیں۔ ہم لڑکے بالے یا بھینسیں وغیرہ نہلانے والے جن کا ہر وقت دریا سے واسطہ رہتا وہ تو اس کی اونچ نیچ سے واقف تھے لیکن سال میں ایک دو اجنبی ضرور پھنس جاتے جو ڈوب کر دریا کا لقمہ بنتے۔ اس لئے یہ بات مشہور ہوگئی کہ بیاس سال میں ایک دو انسانوں کی قربانیاں لیتا ہے۔ یہ گویا آس پاس کے باسیوں سے اس کے پانی کا معاوضہ ہے۔ پھر رفتہ رفتہ تو یہ ہر ایک کا عقیدہ بن گیا۔ بعض اوقات سال کا سال خیریت سے گزر جاتا مگر سال کے عین آخری دن کوئی نہ کوئی ڈوب کے مر جاتا۔ ان واقعات نے قربانی کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں مزید راسخ کر دیا لیکن ایک سال جب نہر نے پوری دس قربانیاں لیں تو ایک قسم کا زلزلہ آ گیا اور پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ بات یہ تھی کہ ہمارے قصبے میں ایک بڑا سکول تھا۔ اس میں پڑھنے والے لڑکوں کی تعداد کوئی پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ جس میں قصبے والوں کے علاوہ اردگرد کے گاؤں سے بھی لڑکے آ کر پڑھتے تھے۔ ساون بھادوں کے دن تھے۔ بارشیں اتنی ہوئیں کہ بیاس کا پاٹ دو سو میٹر سے بڑھ کر تین سو تک ہو گیا اور گہرائی بھی دس بارہ فٹ تک چلی گئی۔ پار گاؤں کے لڑکے کشتی میں سوار چلے آتے تھے کہ اچانک کشتی اُلٹ گئی اور دس لڑکے ڈوب کر مر گئے۔ اس حادثے نے سب کو لرزا کے رکھ دیا اور اردگرد کے باسیوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بات پھیلی تو حکومت نے فوری اقدام کے ذریعے ایک بڑے پل کی منظوری دے دی۔ جو ساڑھے تین سو میٹر لمبا اور پچیس فٹ اونچا تھا۔ یہ پل دو سال میں بن کر مکمل ہو گیا جس نے دو کناروں پر بسنے والوں کو بالکل ایک کر دیا۔ اس طرح اس پل کے بننے سے حادثات میں کمی ہوگئی۔ حتیٰ کہ ساون بھادوں میں بھی پانی کبھی اتنا نہ ہو سکا کہ پل کی نچلی سطح کو چھو لیتا۔ یوں وقت خیریت سے گزرنے لگا اور حادثے نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ یہاں تک کہ پچھلے چھ سال میں کسی کی موت بھی ڈوب کر مرنے سے واقع نہ ہوئی۔

پورے قصبے میں ڈھنڈورا پٹ گیا کہ آج چاچا جیرا جانی چور کا قصہ سنائے گا۔ گلی گلی خبر ہوگئی۔ لوگ سنتے گئے اور خوشی خوشی اپنے شام کے طے شدہ پروگرام اگلی شام تک ملتوی کرتے گئے کیونکہ سال پہلے جیرے کی لن ترانیاں آنکھوں میں گھوم گئی تھیں۔ راجہ نرسلطان کی بپتا اور جانی چور کے معرکے ان آنکھوں نے بیچ چوراہے دیکھے مگر ایک بات سب کی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر جیرا قصہ جانی چور سنانے پہ تیار کیسے ہوا کہ اس سے پہلے سینکڑوں کی آفریں کیں لیکن اُس کی اپنی ایک ہی ''نہ'' تھی جو کسی صورت ''ہاں'' میں نہ بدلی تھی۔ چائے خانوں سے لے کر جواخانوں تک میں حیرانی کا دورہ تھا۔ طمبو کے ہوٹل میں تو دوپہر سے ہی یہی ذکر تھا۔

طمبو حلوائیا دودھ میں کڑچھا ہلاتے ہوئے بولا۔

''بھائی سیف دین! میں تو ایک جانتا ہوں جیرے میں لاکھ عیب سہی مگر ہے وہ ہیرا خالص ہیرا۔ میں نے تو

خدا گواہ ہے اس سے کبھی چائے کے پیسے نہیں لئے۔''

''تُو کیسے پیسے لے؟'' سیف الدین چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

''جب تک جیرا تیرے ہوٹل پر بیٹھا رہتا ہے اتنی دیر رونقیں لگی رہتی ہیں۔ چائے کے بیسیوں کپ ویسے ہی بک جاتے ہیں۔ پھر ایک کپ اگر جیرے کو مفت میں پلا دیتا ہے تو تجھے موت تو نہیں پڑ جاتی۔

طمبو حلوائیا بات بدلتے ہوئے بولا۔

''سیف الدین! یہ انقلاب کیسے آیا کہ جیرا قصہ سنانے پر راضی ہو گیا۔''

''بس جی من موجی ہے۔ نہ سنائے تو سردار کمال احمد اور ڈپٹی صاحب کے ڈرانے پر بھی نہ سنائے اور اگر جی میں آئے تو بغیر کہے مجمع لگا دے۔''

''نہ بھائی یہ بات نہیں۔'' پاس بیٹھے غلام بھٹی نے بات کاٹی۔

''پھر کیا بات ہے؟'' سیف الدین تلخی سے بولا۔

''کیا اس نے تیرے ابا کا حکم مان لیا۔ جس کی دھوتی ہمیشہ کھونٹی سے بندھی رہتی ہے۔''

''حضور یہ سب پیر مودے شاہ کی کرامت ہے۔'' بھٹی نے پہلو درست کرتے ہوئے کہا۔

''کل سب بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں جیرے کی قصہ خوانی پر بات چھڑ گئی۔ مودے شاہ نے کہا بھئی اُسے تو ہم بھی سُنیں گے۔ ہم نے کہا حضور جیرا قصہ سنانے پر راضی نہیں ہوگا۔ بابا جی کو اُسی وقت جلال آ گیا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہوگئیں اور تھر تھر کانپنے لگے۔ بولے، جیرے کی کیا اوقات ہمیں قصہ نہ سنائے، جلا کر راکھ کر دیں گے۔ بس کل شام قصہ خوانی کا انتظام کرو۔ اللہ جانتا ہے میں وہیں تھا۔ دس منٹ میں جیرا بھاگا بھاگا آیا۔ بولا حضرت میں آپ کے حضور قصہ جانی چور پڑھنا چاہتا ہوں۔ اتنی سی بات ہے۔''

''اچھا تو یوں کہو پیر مودے شاہ کا کمال ہے۔'' طمبو حلوائیا جلیبیاں میٹھے میں پھینکتے ہوئے بولا۔

''میں بھی کہوں یہ انہونی کیسے ہوگئی۔ ہوں! تو یہ بات ہے بھئی پیر مودے شاہ کی کرامت میں تو کوئی شک نہیں۔ دن کو رات کہے تو فوراً ہو۔ بس پھر یہی بات ہے۔'' سیف دین کی تلخی فوراً دور ہوگئی۔

''لو بس بھئی بات کھل گئی۔ میں بھی کہتا تھا کہ کچھ کہیں پر راز ہے۔ اب کہانی صاف ہوئی۔'' جمال کان سے میل نکالتے ہوئے بولا۔

افضال نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''لو بھائی اب کس کو بھول ہے۔ تمہیں یاد نہیں؟ دین محمد کے گھر اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اُنہوں نے مودے شاہ سے عرض کی۔ حضرت نے کہا اگلے برس تمہارے بیٹا ہوگا۔ قدرت خدا کی دیکھو اُسی رات حمل ہو گیا۔ اب ایک اور تماشا ہوا۔ دین محمد کی بیوی کہنے لگی یہ تو میرے پیر کی دعا سے ہوا۔ مودے شاہ کا کوئی کمال نہیں۔ دین محمد نے لاکھ سمجھایا، اللہ کی بندی ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ یہ سب مودے شاہ کی کرامت ہے۔ وہ نہ مانی۔ آخر دین محمد نے یہ بات مودے شاہ کو بتا دی۔ حضرت کو فوراً جلال آ گیا۔ فرمانے لگے۔ اگر حمل اُس کے پیر کی دعا سے ہوا ہے تو اُسے کہہ کہ اب وہ پیدا کر کے

دکھائے۔ پھر خدا گواہ ہے تین سال تک بچہ پیدا نہ ہوا۔ بیچاری حمل اُٹھائے اُٹھائے پھرتی تھی۔ آخر قدموں میں آ گری۔ تب جا کر لڑکا پیدا ہوا۔ بھئی اللہ والوں کو ناراض کرنے سے یہی کچھ ہوتا ہے۔'' القصہ اسی طرح کی خیال آرائیاں پورے قصبے میں عشاء تک ہوتی رہیں۔

اُدھر شام ہی سے یونین کونسل کے بڑے ہال میں کوئلے دہکا کر انگیٹھیاں روشن کر دی گئیں۔ پیر مودے شاہ کی چارپائی شاہی تخت کی طرح لگ گئی۔ جس پر سفید چادریں بچھی تھیں اور ریشمی تکیہ سنہری موج مارتا تھا۔ بڑے ہال میں چونکہ صرف تین سو کرسیاں تھیں اس لئے کرسیاں باہر نکال کر ہال میں زمین پر پیال بچھا دی گئی تا کہ کم از کم پانچ سو آدمیوں کی گنجائش پیدا ہو جائے۔ ہر آدمی اتنا پرجوش تھا جیسے سونے کی کان ہاتھ آ گئی ہو۔ خیر سب انتظام مکمل ہو گئے۔ ہال میں ایک سناٹے کا راج ہو گیا کہ اچانک چاچے جیرے کی آواز گونجی.....

سارو ماتا ایشری کرت نمو کئی بار
ہاتھ جوڑ کے عرض کراں لیو ہماری سار

اور پھر

آن کھڑے میدان وچ سورمے ہتھ وچ کمان تے بان پھڑ کے
لیّاں پکڑ کٹاریاں جُودھیاں نے پئے گرجدے وچ میدان کھڑ کے
ہنو وانگ للکاردے کھڑے سارے سُور بیر جو میگھنے وانگ گھڑ کے
مارومار میدان دے وچ ہوئی جانی چورٹا گیا سی پھیر چڑھ کے
سارے ہوئی قتلام کشور چندا سور بیر کھڑو گئے کل اَڑ کے

جیرے نے کچھ دیر تو اسی طرح اشعار میں آہستہ روی سے قصے کو آگے بڑھایا۔ مجمع ہمہ تن گوش واقعات کے پلٹنے کا منتظر تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ قصہ جیرے کی زبان پر کیسے قلابازیاں کھاتا ہے کہ میدانِ جنگ اُٹھا کر مجمعے کے بیچ میں رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص اس موقعے کا انتظار کرنے لگا کہ اچانک چاچے جیرے نے اپنے لہجے کے تیور بدلے اور بدھ سنگ کی فوج کو راجپوتوں سے بھڑا کر جانی چور کے بیان کو اُٹھا لیا۔

بدھ سنگھ دی فوج دا رتن سنگھ سی جوان
پکڑ کٹاری ہاتھ میں وڑیا وچ میدان
پہلا ہتھ آن جانی تے اُٹھالیا
چورٹے نے انگ آپدا بچا لیا
پیندے للکارے اندر میدان دے
کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
پھر جانی چورٹا چلاوے سٹ نوں
مار کے کٹاری کھول دا ہے پھٹ نوں

ہوگئی ہے گرد موہرے آن بھان دے
کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
بھوندیاں پھرن اُتے کل جوگنا ں
اج راجپوتاں نوں پوے گا بھوگنا ں
اندر کھڑک کرن نہ میان دے
کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
اکھاں وچوں چل گئے پرنالے رت دے
اُڈنے نے سیس جی سمان پت دے
سورمے گرج رہے سلطان دے
کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
چھپڑ اُٹھائی پھر دی ہے کالکا
بوندی گڑھ وچ چھڈنا نی بالکا
چار پُت مارے رحمت پٹھان دے
کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے

الغرض مجمعے کے درمیان میں بانس کی چھڑی پکڑے جیرا کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف چلتا اور آواز کے نشیب و فراز سے کہانی کو پلٹے دیتا رہا۔ کبھی عین جانی چور بن جاتا اور کبھی راجہ نرسلطان کی نقل میں شاہی حکم صادر کرتا۔ اسی طرح رات تین کا عمل ہو گیا۔ مجال ہے جو کسی نے ہلنے اور کان پر کھجلی کرنے کی بھی ہمت کی ہو۔ حتیٰ کہ تین بجے جیرے نے اچانک داستان روک دی۔ مجمع طلسم سے باہر نکلا اور پیر مودے شاہ بھی ہوش میں پلٹا۔ چاچا جیرا ابھی سنبھل کے اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہی تھا کہ اسی وقت پیر مودے شاہ کی آواز گونجی۔

''جیرے مانگ کیا مانگتا ہے؟''

جیرے نے ویسے ہی ہاتھ باندھ کے کہا۔

''حضور یہ قصہ تو آپ کی محبت میں عرض کیا۔ زر کی حاجت نہیں۔''

''پھر بھی آج جو مانگے گا، دیں گے۔'' مودے شاہ دوبارہ گرجا۔

''سرکار اگر انکار کر دیں گے تو پھر منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔'' جیرا تھوڑا سا جھجکا۔

''جیرے ہماری توہین مت کر ہم میں خدا کی صفات ہوتی ہیں۔'' پیر صاحب جلالی لہجے میں دھاڑے۔

''حضور صاحب کرامات ہیں۔'' اب جیرا نزدیک ہو کر محکم آواز میں بولا۔

''بابا جی گدھے پر سواری کرتے کرتے اُکتا گیا ہوں۔ اگر ایسے ہی اصرار ہے تو آپ کی سفید گھوڑی دل کو بھا گئی۔ آپ کی تو کرامت سے بیسیوں ایسی گھوڑیاں اور آ جائیں گی۔ پر مجھے آپ یہ دے دیجئے۔''

جیرے کا گھوڑی مانگنا تھا کہ مودے شاہ سمیت سارے مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ بلکہ مودے شاہ کے چہرے پر تو ایک قسم کی سیاہی پھر گئی اور وہ ہونّقوں کی طرح جیرے کو دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ پورے قصے کا مزہ کرکرا کر دیا۔ لوگوں میں ڈر کے مارے آہستہ آہستہ کھسر پھسر ہونے لگی اور وہ جیرے کی اس قدر بدتہذیبی اور دیدہ دلیری سے ڈرنے لگے۔ لیکن وہ استقلال سے کھڑا ہوا تھا اور ذرا بھی اپنی اس جسارت سے شرمندہ نہیں تھا۔ دوسری طرف مودے شاہ کے لئے اب گھوڑی دیے بغیر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ پورا مجمع مودے شاہ کی سخاوت کی للکار سُن چکا تھا۔ بالآخر کچھ دیر سوچ کر مودے شاہ نے جیرے کو گھوڑی دینے کا اعلان کر دیا۔ تب قصبہ والوں کو جیرے کی چال کا پتہ چلا اور وہ اس بات پر حیران ہوئے کہ آخر اُس نے پیر صاحب کو بھی نہیں چھوڑا۔

اصل میں جیرے کے بارے میں قطعی تو کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ کس قبیلے کا ہے۔ ہاں مگر بیس سال سے وہ اسی قصبے میں تھا۔

سنا ہے کہ اُس کا والد گجرات میں چھوٹا موٹا زمیندار تھا۔ جس نے اِس کے برے کرتوتوں اور آوارگی کے سبب عاق کر دیا تھا۔ تب سے گھر سے نکلا اور پھر نہ گیا۔ سواری کے لئے اس کے پاس گدھا تھا۔ جس کی بدولت اس نے دور ونزدیک کی منزلیں طے کیں اور قصبہ قصبہ پھرا۔ پورے چھ چھ مہینے غائب رہتا مگر پھر لوٹ آتا اور جیسے ہی قصبے میں داخل ہوتا ایک قسم کی رونق پیدا ہو جاتی کیونکہ جیرے کو بہت سی داستانیں اور قصے کہانیاں یاد تھیں جنہیں وہ ایسے سلیقے سے سناتا کہ لوگ سر دُھنتے رہ جاتے۔ ڈھول بادشاہ، قصہ شاہ داؤد، داستان امیر حمزہ اور قصہ جانی چور تو اُس کی دل پسند کہانیاں تھیں۔ جو اُس نے قصبے والوں کو سنا کر اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ علاوہ ان داستانوں کے جیرا اپنے سفر کے واقعات بھی سچا جھوٹا تڑکا لگا کر اِس طرح لوگوں کو سناتا کہ ہر شخص اپنا قرض بھول کر چاچے جیرے سے سفر کے واقعات سننے میں دلچسپی رکھتا۔ دراصل اس کا قصبے سے نکلنے کا سبب بھی وہ دو چار سو روپے قرض ہوتا تھا جو وہ قصبے کے کسی آدمی سے لے لیتا مگر جب تقاضے بڑھتے تو وہ کسی دوسرے سے لے کر پہلے آدمی کا چکتا کر دیتا اور اگر یہ نہ کر سکتا تو قصبہ چھوڑ دیتا پھر جب تک چاچے جیرے کی واپسی ہوتی قرض خواہ اپنے قرض سے دست بردار ہو چکا ہوتا۔ اوّل اوّل تو قصبہ والوں کو حیرانی ہوتی کہ جیرا آخر لوگوں سے اتنا قرض کیوں لیتا ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ معمہ حل ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ آدھا قصبہ خود چاچے جیرے کا مقروض تھا یعنی کسی کو سو پچاس کی ضرورت پڑتی تو وہ چاچے جیرے کو ڈھونڈتا ہوا آ پکڑتا۔ ادھر یہ بندہ خدا اُسے خالی لوٹانے میں توہین خیال کرتا اور ادھر ادھر سے مانگ کر اس کے حوالے کر دیتا۔

جیرے کو پہلے پہل تو ان کاموں میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ لوگ باتوں کے چٹخارے میں آ جاتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ اعتماد خراب ہو گیا لیکن جیرا بھی کب نچلا بیٹھنے والا تھا۔ ادھار کے معاملے میں ایک عجیب ایجاد نکالی مثلاً: حاجی عبداللہ اپنے باڑے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا، جیرا آرام سے جا کر عبداللہ کے دائیں طرف بیٹھ گیا، حقے کے دو تین کش لگائے اور بولا۔

''میاں کیا بتاؤں وہ گائے تو خدا جانتا ہے صالح کی اونٹنی کی نسل سے ہے۔ اللہ قسم ایسے ہڈ کاٹھ کی گائے تو نیلی کے پانیوں میں نہیں دیکھی۔ یہ اتنا (دونوں بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے) چٹورے کے برابر تو بھاگ بھری کا حوانہ

ہے اور قد تو میاں ایسا ہے کہ دو آدمی اوپر نیچے کھڑے کر لو تب بھی اونچی لگے۔ گلابی رنگت ناریوں کے رخساروں کو پچھاڑے۔ میں تو جانوں یہودیوں کو اسی گائے کے ذبح کا حکم تھا۔ بس بھائی عبداللہ آپ کے یہ سب جانور ایک طرف اور وہ گائے ایک طرف۔''

''میاں جیرے وہ گائے چل کے ابھی دیکھنا چاہئے۔ حاجی عبداللہ نے بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ایسی گائے تو میرے باڑے میں ہونی چاہئے۔''

''نہ حاجی صاحب، جیرے نے بے نیازی سے کہا۔ اسے خریدنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ گلزار محمد جان دے دے گا مگر گائے کا بال کھینچ کر نہ دے گا۔ میرے سامنے منظور دوآبیہ نے دس ایکڑ زمین کے کاغذ سامنے رکھ دیے۔ گلزار نے مڑ کر نہیں دیکھا اور اُٹھ کر گائے کی تھوتھنی چومنے لگا۔''

''دودھ کی کیفیت کیا ہے؟'' حاجی نے رشک سے پوچھا۔

''واہ یہ بھی اچھی ہی پوچھی آپ نے۔'' جیرا بولا۔

''میں وہاں پورے دس دن رہا اور انہی آنکھوں نے دیکھا کہ تین تین آدمی اسے دن میں تین دفعہ دوہتے ہیں۔ بھئی واللہ ایک چھٹانک اوپر نیچے بتاؤں تو دوزخ میں جاؤں۔ پورا پچاس لیٹر ایک دن میں دیتی ہے۔ بس بھائی ایسے ہی ہے جیسے کنویں سے مشکیں بھر بھر نکالتے جاؤ۔''

حاجی انتہائی بے چینی کے عالم میں کڑھتے ہوئے بولا۔

''جیرے! میں تو تب مانوں گا جب آنکھوں سے دکھاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے کل تیار ہو جاؤ۔ سویرے تاروں کی اوٹ میں ہی نکل چلیں گے اور دس 'چک مراد کے' میں جا کر گلزار کے ڈیرے پر بجائیں گے۔ یہ کہہ کر جیرا اُٹھ کھڑا ہوا پھر رُک کر کہا، مگر؟''

''مگر کیا؟'' حاجی نے بے چینی سے پوچھا۔

''لیکن میں نے تو کل صبح شہر جا کر برکت سے تین سو روپیہ لینا ہے اور نیک دین کو دینا ہے ورنہ وہ میری جان کو آ لے گا۔''

''تو پرسوں لے کر دے دینا۔ کون سی قیامت آ گئی ہے۔'' حاجی نے کہا۔

''نہ بھائی نہ! نیکا تو دھوتی اُتارنے پر تیار ہے۔ میں تو اس بچو کے منہ پر کل ہی پیسے ماروں گا۔'' جیرا بولا۔

حاجی عبداللہ نے دیکھا کہ شکار ہاتھ سے نکلتا ہے یعنی اگر یہ کل مجھے گائے دکھانے نہ لے گیا تو پھر کبھی نہ جائے گا۔ فوراً جیب سے تین سو روپے نکال چاچے جیرے کی جیب میں ٹھونس دیے اور کہا کہ پرسوں برکت سے لے کر مجھے دے دینا۔

''ٹھیک ہے میاں عبداللہ اگر تمہاری ضد ہے تو یونہی سہی (جیرے نے ایک قسم کی بیزاری سی ظاہر کی) لیکن دیکھ! کل سویرے کا سورج ہم کلاسن کی پل پر دیکھیں اور بگھی میں دو گھوڑے، بہت ہوں گے۔ یہ کہہ کر جیرا سیدھا رفیق تیلی کے ہاں پہنچا اور دو سو اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا، جا بھائی سسر کا جنازہ بھگتا اور جان لے یہ اسی مہینے یہ واپس

کرنے ہیں۔مگر سب کو پتا تھا کہ کون سا اُدھار اور کہاں کی واپسی؟ پھر دوسرے دن جیرے کو صبح سے پہلے ہی قصبے سے نکلنا پڑا مگر حاجی عبداللہ کے ساتھ دو گھوڑوں کی بگھی پر نہیں بلکہ اپنے گدھے پر کیونکہ ایسی گائے تو جیرے نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔حاجی عبداللہ کو کہاں سے دکھاتا۔

کچھ اسی پر موقوف نہیں تھا کہ شرفا ہی اس کی باتوں سے پٹ جاتے بلکہ کبوتر باز، کتے لڑانے والے، رنڈی باز اور لُچوں لفنگوں تک اس کے ہاتھوں ٹھگے جا چکے تھے۔وجہ صاف تھی کہ جیرے اور اس کے گدھے نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔اور اب سائیں مودے شاہ جو خود پورے قصبے کا پیر تھا اور ایسی کرامات والا کہ دلوں پہ لکھا پڑھ لیتا۔لوگ ہزاروں کی پونجی خوشی خوشی اس کی جھولی میں اُلٹ دیتے۔ وہ چاچے جیرے کے دل کی تختی نہ پڑھ سکا اور پٹ گیا۔دراصل واقعہ یہ ہوا کہ صادق ماچھی کی بکری رات چوری ہوگئی۔کم سے کم بھی کہوں تو پانچ سو سے کم نہ ہوگی۔کھوجی بلوایا تو اس نے شادے تیلی کا نام لیا۔حالانکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ آج چودھری الہٰ یار نے پیر مودے شاہ کی دعوت کی ہے مگر بڑوں کے جوتے بڑے۔نام کون لے؟ اس پر ستم یہ ہوا کہ سو روپے اُلٹے کھوجی نے مانگ لئے۔صادق ماچھی شام تک کا وعدہ کر کے جیرے کے پاس چلا آیا۔ یوں اس واقعے کی گانٹھ پڑی اور جیرے نے قصہ جانی چور سنا کر پیر صاحب کی گھوڑی ہتھیا لی۔کیونکہ جیرا مودے شاہ کی بڑھوں سے واقف تھا اور اپنا گدھا صادق ماچھی کو دے کر اُسی وقت قصبے سے نکل گیا کہ کہیں صبح دوبارہ نہ چھین لیں اور پیر صاحب منہ دیکھتے رہ گئے۔

اب دریائے بیاس پچھلے دو سال سے محض ایک ندی کے برابر رہ گیا۔خدا ہی جانتا تھا سب پانی کدھر گیا۔ اکثر بار اطلاع آئی کہ ہندوستان نے پانی روک لیا لیکن بزرگوں نے اس کی سختی سے تردید کر دی کہ کبھی دریا پر بھی بند باندھے جا سکے ہیں۔یہ ضرور کوئی خدا کا قہر ہے۔قربانیاں دینے میں بخل سے کام لیا گیا اُسی سبب سے دریا ناراض ہو گیا اور اُس نے اپنا پانی بند کر لیا۔قصبے کے مضافات میں جو تباہی آ رہی تھی وہ آنکھوں سے نہ دیکھی جاتی تھی۔پانی کی قلت سے ہر شے مرجھا چکی تھی۔فصلیں چوتھائی بھی نہ رہ گئیں اور اکثر میدانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ مال مویشی الگ پریشان اور بدحال تھے۔بارشوں پر دارومدار بڑھ گیا جو سال سال نہ ہوتیں۔ برگد اور پیپل کے پیڑ تو کسی طرح محفوظ تھے لیکن شیشم شرینہہ اور پاپلر تو اس طرح سوکھنے لگے جیسے کوئی آگ لگاتا چلا گیا ہو۔اگلے دو سال میں بگولوں نے پورے علاقے میں ناچ شروع کر دیا۔ ہواؤں میں جو ایک طرح کی خنکی تھی وہ جاتی رہی اور خشکی لُو دینے لگی۔اس سب کچھ کی بنا پر لوگوں کی معیشت کو ایک بڑا دھچکا لگا۔جن کا انحصار ہی زراعت پر تھا اور زراعت دریا کے سبب تھی۔ پہلے پہل تو لوگ عبادت پر مائل ہوئے اور دعائیں مانگتے رہے لیکن جب مسئلہ حل نہ ہوا تو آہستہ آہستہ عبادت چھوڑ دی اور مسجدوں میں وہی رہ گئے جو پرانے نمازی تھے۔لوگوں کی طبیعتوں میں ایک قسم کا چڑچڑا پن آتا گیا۔موسم میں اعتدال کے بجائے شدت پیدا ہوگئی یعنی سخت گرمی اور سخت سردی۔ پھر جب دو سال سے بارش کا ایک قطرہ نہ ہوا تو ندی کا بقیہ پانی بھی سوکھ گیا۔حکومت نے جو نہریں دوسرے دریاؤں سے نکالی تھیں وہ نہایت ناکافی تھیں اور پھر اِن کو تو کھلے پانیوں کی عادت تھی اس چلّو بھر پانی پر کیا اکتفا کرتے۔اس سارے سوکھے نے خاص کر باغات تو بالکل بھسم کر دیے۔ حتی کہ پانچ سال کے اندر قصبہ کے مضافات ویران ہو گئے اور قصبے والے کمال پریشانی میں مبتلا ہوئے۔ چاچا جیرا بھی

اب زیادہ عرصہ قصبے سے باہر ہی رہتا تھا کیونکہ ایک تو لوگوں نے اُس کی داستانوں میں دل چسپی لینا چھوڑ دی دوم قصبے کی حالت اُس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔علاوہ ان باتوں کے اب گھوڑی ہاتھ لگ گئی تھی۔لہٰذا دور دور نکلنے لگا۔لیکن سال میں مہینے مہینے کے لئے دو چار پھیرے ضرور لگا لیتا۔پچھلے مہینے جیرا پورے سال بعد قصبے میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ دو چار آدمیوں کے علاوہ کسی نے بھی جیرے پر خاص توجہ نہ دی۔ایسے لگتا تھا کہ لوگوں کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی چڑچڑا پن آ گیا تھا۔یہ حالت دیکھ کر اُس کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی اور اُس نے سوچا کہ وہ پرسوں ہی قصبے سے چلا جائے گا اور پھر کبھی نہ آئے گا۔

دوسرے دن اتفاق سے پیر مودے شاہ بھی قصبے میں آ گیا۔لوگوں کو اُس کی آمد کا پتہ چلا تو حاضری کے لئے دوڑے۔اور پریشان حال عوام التجائیں لے لے کر حضور میں پہنچے۔

شہاب دین گڑگڑایا۔

''سرکار لُٹ گئے، کھیت اُجڑ گئے۔حضور فصلوں میں جھاڑو پھر گئی۔''

''حضور بابا جی باغات کو لُو کھا گئی۔اب تو بھوکوں مرتے ہیں۔واسطہ شادے سرکار کا کوئی معجزہ کرو۔'' جمال رونے لگا۔

شیر علی نے پگڑی مودے شاہ کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔

''حضرت دریا روٹھ گیا۔ہم سے بھول ہوگئی۔جب سے ہم نے اُسے قربانیاں دینی بند کر دیں اُس نے ہمارا رزق بند کر دیا۔ساری زمینیں راجستھان ہوگئیں۔''

نذیر بانسری والا کہنے لگا۔

''بابا جی کوئی ایسی کرامات کرو کہ دریا ٹھاٹھیں مارتا نکل آئے۔پھر سے ہر طرف ایسا ہرا ہرا ہو کہ آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔''

پیر مودے شاہ کچھ دیر سب تحمل سے سنتا رہا آخر گرجدار آواز سے بولا۔

''اللہ کے کاموں میں دخل دینے سے یہی کچھ ہوتا ہے۔تم نے بڑے بڑے پُل بنا دیے اور دریا کو قربانیاں نہ دیں پھر وہ کیوں تمہیں رزق دے۔اب بھگتو اپنے کئے کی سزا۔''

''ناں بابا جی ناں، آپ تو ہمارے رکھالو ہیں۔آپ کی بات خدا کبھی نہ موڑے گا۔حضور کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ہم یہ پُل شُل ابھی زمین کر دیں گے۔ جو ہمارے سینوں پر اب سانپ کی طرح کھڑا ہے۔'' شریف محمد زار زار رونے لگا۔

''بابا جی ہم عہد کرتے ہیں۔آپ جو کہیں گے وہی کریں گے۔بال برابر ادھر نہ اُدھر۔چاہے خراس میں پسوا دو مگر دریا بہنا چاہئے۔'' کمال احمد بھی تقریباً رو پڑا۔

اسی طرح آہ وزاری کرتے جب آدھی رات نکل گئی تو آخر پیر مودے شاہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ہم آج تمہارے لئے کچھ کرتے ہیں۔تم اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ہم چلّہ کھینچتے ہیں۔

جوحکم ملاصبح کو بتادیں گے۔اورخبردار اگر اُس حکم کے بجالانے میں ذرا بھی سرتابی کی تو پھر تمہیں مکمل تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ہرصورت وہی کرنا ہوگا جو ہم کہیں گے، اللہ اکبر۔''

مودے شاہ کا حکم پا کر تمام لوگ اپنے گھروں کو چل دیے۔ باباجی کمرے میں تنہا رہ گئے۔اوراندر سے کنڈی چڑھا کر چلّے میں مصروف ہوگئے۔

اِدھر قصبے والوں کی آنکھوں سے نیند بالکل اُڑ گئی۔ وہ سخت بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں باباجی کو کیا حکم ملتا ہے۔جس کے بجالانے کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے۔صبح ہوئی تو باباجی نے دروازہ کھولا۔ لوگوں کا بڑا مجمع ٹھٹھ لگا کر کھڑا تھا۔مودے شاہ نے ان میں سے چار سرکردہ افراد کو چن لیا۔اورانہیں دوبارہ کمرے میں لے گیا۔ باقی لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو جانے کا حکم ہوگیا۔

پھر اُسی دن، رات دس بجے کے قریب چھ لوگ چاچے جیرے کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے اور اُسے پیر مودے شاہ کے حکم کے بارے میں اطلاع دی۔ جسے سن کر چاچا جیرا سکتے میں آ گیا اور بہت رویا پیٹا لیکن اب خدا کے کاموں میں دخل دینے کی قصبے والوں میں ہمت نہیں تھی کیونکہ اگر وہ اس حکم کو ٹال دیتے تو اُنہیں مزید تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ لہٰذا جیرے کو دریا کے عین بیچ لے جا کر خشک ریت پر لٹا دیا گیا۔ جہاں چند ہی منٹوں میں اُس کے گلے سے نکلتے ہوئے گرم خون کو پیاسی ریت پی گئی۔اگلی صبح پیر صاحب سحر پھوٹنے سے پہلے ہی قصبہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

Mirza Ghalib Kitab Makaz
City R.Cade Palaza Besmen Shop No.10
I.IT Markaz Islamabad, Pakistan

اردو شاعری کی معتبر آواز

راشد طراز

کا

دوسرا شعری مجموعہ

غبارِ آشنا

شایع ہو چکا ہے

صفحات: ۱۲۸ قیمت ۱۵۰

رابطہ: دلاورپور، مونگیر

● محمد حامد سراج

پانچ روپے کا متروک نوٹ

وہ کچن میں کھڑی اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔حالات کی چکی میں پستے پستے وہ اب آسائش کی کوئی ایسی راہ تلاش کر رہی تھی جس پر چل کر وہ باقی زندگی مزے سے گزارنا چاہتی تھی لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔جو سوچ اس کے ذہن میں رینگ رہی تھی وہ اتنی کٹھن تھی کہ اس پر چلنا آسان نہیں تھا۔ایک لہر اٹھتی جسے وہ جھیلتی اتنے میں دوسری لہر کا اسے سامنا ہوتا۔بچپن لڑکپن میں کوٹھے یا گلی میں کسی سے چوری چھپے ملنا اور بات تھی۔اب اسے اپنا جسم بیچنا تھا۔ یہ آخری پونجی تھی جو اس کے پاس بچی تھی۔خاوند کی بیماری میں گھر کی ایک ایک چیز بک گئی۔وہ سلائی مشین کی ہتھی پر اپنے ہاتھ کی لکیریں گھسانا چاہتی تھی نہ کسی فیکٹری میں آٹھ دس گھنٹے اپنی باقی ماندہ جوانی جھونکنا چاہتی تھی۔شادی کے پانچ سال ہی اس کا سارا زیور اور گھر کا سامان نگل گئے۔اگر کچھ سال میں اپنا جسم کیش کرا لوں تو اس میں کیا حرج ہے.....؟ کچن سے کام سمیٹ کر وہ بیڈروم میں آ گئی بستر پر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔وہ کئی ماہ سے اس الجھن میں تھی اور سوچتی رہی جو عورتیں جسم کا بیوپار کرتی ہیں وہ کیسے آسانی سے روز یہ سب کر لیتی ہیں۔گلیمر کی دنیا میں بھی جسم بکتے رہتے ہیں۔میں بھی تو اپنا جسم خاوند کے سپرد کرتی رہی ہوں۔کیا ملتا تھا.....؟ وہ تو یوں کروٹ بدل کے سو جاتا جیسے اس نے کوئی روٹین کی بیگار نبھائی ہو۔کھانے کی طرح مجھ سے جسم طلب کرتا' نہ میری کوئی خواہش' نہ جذبات کا احترام' بس ایک میکانکی عمل اور پھر گھر کے کام.....جیسے یہ بیگار نبھاتی ہوں وہ بھی نبھا جاؤں گی۔ہم تو وہ ہیں جنہیں چپ چاپ باندھ دیا جاتا ہے۔باپ کے آنگن سے جیسے بکری کسی اور کھونٹ باندھ دی گئی۔خاوند کے پاس کیا تھا۔ پہلے بھی میں نے ہی محنت کی اور گھر کو گھسیٹا۔اب جسم بیچ کے سہی۔اچھا مول لگ گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔کل نکلوں گی۔ہمت نہ پڑی تو لوٹ آؤں گی۔اس نے اپنے ذہن میں وہ سب فلمیں ڈرامے دہرائے، وہ کہانیاں جو اس نے پڑھ رکھی تھیں۔آس پڑوس کی عورتوں سے بھی وہ سنتی رہتی تھی کہ شہر میں کیا گل کھلتے ہیں۔محلے کی ایک عورت کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ ہفتے میں ایک دو بار وہ اپنے جسم کا باسی گوشت بیچ کر مرغی کا تازہ گوشت لے آتی ہے۔اور تین گلیاں چھوڑ کے ایک عورت سے سب محلّہ آشنا تھا جس نے جسم بیچ کر اپنے بچوں کی تعلیم مکمل کی۔ایک ڈرائیور کی بیوی تو کھلے عام دھندہ کرتی تھی اور لڑکیاں سپلائی کر کے اپنا کمیشن کھرا کرتی تھی۔ چھاپہ مارنے والا تھانیدار اس کے گھر سے مسکرا

کے نکلتا تھا۔

صبح اس نے گھر کا کام نمٹایا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا اور گھر سے نکلی۔ سڑکوں پر بازاروں میں انسانوں اور ٹریفک کا بے ہنگم شور اور وہ اپنے آپ سے الجھتی اس دنیا میں اتر گئی۔ بسوں پر اس نے کئی بار میکے جانے کے لیے سفر کیا تھا۔ اس نے مین بس اسٹینڈ کا رخ کیا۔ بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ڈرائیور، کنڈیکٹر، گندے موبل آئل میں لتھڑے میلے کچیلے کپڑوں والے مکینک، ہاکر، گاڑیوں کے انجن اور پرزے مٹی کے تیل میں صاف کرنے والے چھوٹے، سب اپنی دنیا اور اپنے کام میں مگن۔ ہوٹل سے چائے ڈھونے والا چھوٹا جس کی ناک بہہ رہی تھی، ٹوٹی پیالیوں میں کالی چائے، کندھے پر کاراسٹیرنگ کے کور اور ڈیکوریشن کا سامان اٹھائے پٹھان لڑکا، لکڑی کا بکس اٹھائے جوتیاں پالش کرنے والا ایک بوڑھا شخص، بے ہنگم شور میں وہ گھبرا گئی۔ جانے کس قماش کی یہ دنیا ہوگی۔ میں کہاں آنکلی ہوں.....؟ فروٹ چارٹ کی ایک ریڑھی پر رک کر اس نے ایک پلیٹ فروٹ چارٹ کا کہا اور لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ کیسے غلیظ لوگ ہیں۔ میں یہاں کہاں؟ یہ تو میلے کچیلے تاریک کمروں میں رہنے والے۔ غلط جگہ پر آ گئی میں..... مجھے تو اپنا کام سلیقے سے کرنا ہے۔

گھر کی آخری پونجی بنچ پر بیٹھی چارٹ کھا رہی تھی اور اندر سے ضمیر اسے کاٹ کھا رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹنا چاہتی تھی۔ تو کیا آج کسی ڈرائیور کنڈیکٹر کے ساتھ.....؟ ''نہیں نہیں یہ تو دو چار سو پر ٹرخا دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے ایک کے بہانے کئی اکٹھے ہو جائیں اور میری تکہ بوٹی کر دیں۔ پرس کھول کر اس نے رقم ریڑھی والے کو پکڑائی اور بسوں کے درمیان بچھی فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ کوئی اس کے پہلو میں چل رہا تھا۔ اسے پسینہ آ گیا۔

''کتنے لوگی.....؟'' کہنے والا ذرا سا کندھا رگڑ کر اس سے دو قدم آگے چلنے لگا۔ وہ گھبرا گئی۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ چلتے چلتے وہ اڈے کے ایک سنگیت سنٹر میں گھس گئی۔ دکان دار نے اس کے سامنے کیسٹ ڈھیر کر دئے۔ وہ کیسٹ الٹ کر گیتوں کے بول پڑھنے لگی۔ دکان دار ایک چوڑے چہرے اور مضبوط کلائیوں والا ایسا شخص تھا جس کے سینے کے گھنے بالوں میں سونے کا لاکٹ جھلملا رہا تھا۔ وہ بہت دیر وہاں کیسٹ دیکھنے کے بہانے رکی رہی کیوں کہ وہ شخص باہر کھڑا اسی کی جانب ٹکٹکی لگائے کھڑا تھا..... وہ دکان سے نکلی تو وہ پھر ساتھ ہو لیا۔

''دو سو میں کام بن جائے گا.....؟'' اس نے چادر کندھے پر درست کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ چلتی رہی.....

''چلو..... کیا یاد کرو گی۔ پانچ سو دے دوں گا۔ سامنے دیکھو۔ وہ جو ہوٹل ہے وہاں کمرہ بک ہے۔''

وہ چلتی اور سوچتی رہی..... پانچ سو تو بہت کم ہیں۔ لیکن اگر اکتفا کر لوں تو ایک فائدہ تو ہوگا جھجک اتر جائے گی۔ وہ اترے گی تو یہ دھندہ آگے چلے گا..... پھر کوئی اور راستہ تلاش کروں گی۔ چلتے چلتے اس نے جملہ پھینکا۔

''پانچ سو..... یہ تو بہت کم ہیں۔''

''خدا سے ڈرو..... یہاں اڈے میں سو روپے میں ایک سے ایک لڑکی مل جاتی ہے۔ ٹھہرو.....! وہ دیکھو سامنے..... گڈوی بجانے والی کی جوانی ابلی پڑ رہی ہے۔ کابلی انار جیسے گال ہیں اس کے..... دیکھ رہی ہو..... نا..... وہ دو

سو میں مان جاتی ہے۔''

اس نے ایک نظر گڈوی بجانے والی کو دیکھا اور تڑ سے بولی۔

''مجھ میں کیا دیکھا ہے کہ پانچ سو بھرنے پر تل گئے ہو۔''

''تمہاری چال اور برقعے میں چھپے مال نے بے قرار کیا ہے۔''

''تو پھر پیسہ بھرو.....''

''میرے پاس ایک ہی نوٹ ہے پانچ سو کا.....!''

''تمہیں گڈوی بجانے والی دو تین مل جائیں گی۔ اپنی راہ لو۔'' اور وہ ہارن بجاتی ایک بس کے پہلو سے گزر کر چائے والے کھوکھے پر جا بیٹھی۔ چائے پیتے لمحے اسے کیسٹ والی کی شیطانی مسکراہٹ اور سینے کے بالوں میں چمکتا لاکٹ یاد آیا۔ چائے پی کر وہ دوبارہ سنگیت سنٹر گئی۔ شیطانی مسکراہٹ والا تاڑ گیا۔

''بیٹھو سوہنڑیو..... ٹھنڈا یا گرم.....؟''

''ٹھنڈا۔''

''گرم کی عادت نہیں ہے؟'' وہ کاؤنٹر پر آدھا جھک آیا۔

''اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔''

''ٹھنڈا پی لو پھر گرم بھی آ جائے گا۔ کیا اس علاقے میں نئی ہو.....؟''

''ہوں۔''

''کتنا لوگی.....؟''

''پانچ ہزار روپے۔''

گھنی مونچھوں والا چکرا گیا۔ ''سوہنڑی یہ امیروں کا علاقہ نہیں ہے۔ بس اور ٹرک اڈوں میں یہ مال بہت سستا مل جاتا ہے اور ایک سے ایک مل جاتا ہے۔ یہاں مال کی صحت دیکھتے ہیں۔ کپڑے میک اپ کوئی نہیں دیکھتا۔''

''تم کتنا بھر سکتے ہو.....؟''

''ہزار سے زیادہ نہیں وہ بھی اس واسطے کہ تو نفیس اور سوہنڑی ہے.....'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا..... ''ہمارا سٹور بہت کھلا ہے''

تین ہزار میں بات طے ہو گئی۔ سٹور واقعی بہت کشادہ تھا وہ وہاں سما گئی۔

راستہ مشکل تھا لیکن جھجک کی نتھ اتر گئی تھی۔

اگلی صبح گھر کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی میرے پرس میں تین ہزار روپے ہیں۔ مکان کا کرایہ، بجلی اور گیس کا بل، سودا سلف، خاوند کی بیماری اور اپنی زندگی جس کو ہر صورت ڈھونا ہے۔ یہ کام تو کرنا ہوگا۔ ناشتہ بنا کر اس نے خاوند کے سامنے رکھا تو اس نے پوچھا۔

''کل جس خاتون کے ہاں ہمسائی کے ساتھ گئی تھیں۔ کام کا کیا ہوا.....؟''

''بوتیک کا کام کرتی ہے۔ کہہ رہی تھی پچیس ہزار پھول ہاتھ کی بنائی والے اگر بُن دو تو فی پھول ایک ہزار روپے کے حساب سے کام مکمل ہونے پر پچیس ہزار لے لینا۔''

''کیا سوچا ہے تم نے.....؟''

''محلے کی بچیوں سے پچاس پیسے کے حساب سے معاملہ طے کرلوں گی۔ امید ہے کام چل نکلے گا۔''

''ٹھیک ہے ہمت کر دیکھو۔''

''ہمت نہ کی تو زندگی کیسے گزرے گی.....؟ کل جانا ہے۔ دھاگہ' ڈیزائین اور کڑھائی کا سارا سامان لانا ہے۔''

''کچھ ایڈوانس بھی دیا اس نے؟''

''ہاں دیا ہے۔''

زندگی نے اسے پیس ڈالا تھا۔ غربت اس کی سانسیں نوچنے کو تیار بیٹھی تھی۔ اسے زندگی سے نفرت ہوگئی اور زندگی سے ہی اس نے انتقام لینے کا سوچا۔ عمل وہ کر چکی تھی۔ راستہ وہ پکڑ چکی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا اس کا خاوند بھی اسے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ وہ اب آہستہ آہستہ اس ڈگر کی عادی ہوگئی تھی۔ گاہک کی تلاش کے لئے اس کا ذہن تیزی سے کام کرتا۔ وہ سوچتی اور عمل کر گزرتی۔

اس نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا اور صدر بازار جانے کی ٹھانی۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے ہمسائے کے چھوکرے کی سیٹی سنائی دی۔

''بے شرما! حیا کر، اپنے گھر میں منہ نہیں مارتے۔''

''حکم کیا کریں جی۔ آپ کا ہر کام کرنے کو یہ خادم حاضر ہے۔'' اس نے کندھے پر مفلر جمایا۔

''میرے ہتھ پیر سلامت ہیں۔ جا اپنا رستہ ناپ.....کمینے.....کتے.....!''

''سوہنڑی! تیرے منہ سے تو گالیاں بھی بھلی لگتی ہیں۔''

وہ اس کی بکواس جھٹکتی مین روڈ پر آ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی آج ایسا شخص مل جائے نا جو مجھے پورا مہینہ آرام کرنے کو مل جائے۔ دوپہر تک وہ مختلف سٹورز' کلاتھ ہاؤسز' ریسٹورنٹ اور بازار کے پر ہجوم کارنرز پر گاہک کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔ لیکن اسے مسلسل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب وہ تھک چکی تھی۔ اسے بھوک ستا رہی تھی وہ ایک ریسٹورنٹ میں کھانے کی اشتہا کے ساتھ داخل ہوئی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ گھر کو سنوارنے کا سوچتی رہی۔ 33 انچ کا LCD TV بھی اس کا خواب تھا۔ نیا فرج اور سپلٹ ائرکنڈیشن تو وہ پسند کر آئی تھی۔ AC کے بغیر گرمیاں کاٹنا عذاب ہوتا ہے۔ کیا یہ ساری آسائشیں صرف ایک طبقے کا حق ہیں۔ وہ اربوں کے گھپلے کرتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے۔ کمیشن کے نام پر کروڑوں کھا جانا ان کے لئے ایک معمول کی بات ہے۔ لاکھوں کی گاڑیاں' عیاشیاں' پارٹیاں' بیرون، ملک دورے' پلاٹ' بنگلوز' فارم ہاؤسز.....یہ سب کیا ہے؟

کھانا کھا کر وہ ریسٹورنٹ سے نکلی تو ایک نئی کار سے ایک نوجوان اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا سامنے سپر

سٹور میں داخل ہوا۔ چند منٹ بعد وہ سٹور میں داخل ہوئی اور Racks میں سجی اشیا دیکھنے لگی۔ ریکوں کے درمیاں وہ کن انکھیوں سے اس نوجوان کو بھی دیکھ لیتی۔ جب وہ پرفیوم ریک کے سامنے رک کر پرفیوم دیکھنے لگا تو اس کی جانب سرکی۔ نوجوان کے ہاتھ میں Channel 5 پرفیوم تھا جس کی قیمت لگ بھگ دس ہزار روپے تھی۔

ریک کی اوٹ میں سے اس نے کہا۔

''آپ اتنا سستا پرفیوم استعمال کرتے ہیں.....؟''

نوجوان نے چونک کر اوپر نظر اٹھائی تو ایک سیاہ آنکھوں والی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ نوجوان کو تو جیسے سکتہ ہوگیا۔

''پرفیوم تو میں نے مہنگا اور Orignal پسند ہے۔

''آپ کو Orignality کی پہچان ہے.....؟''

''تمہارا تعارف.....؟''

''چھوڑئے، جو مجھے چاہیے وہ اس دکان میں نہیں ہے۔''

''تم شہر کے مہنگے ترین سٹور کو دکان کہہ رہی ہو.....''

''دکان ہی تو ہے۔ بس ذرا سجا دیا ہے۔ کشش پیدا کر دی گئی ہے کہ خریدار دکان کا حسن اور چمک دمک دیکھ کر اندر کھنچا چلا آئے۔ جیب خالی کرانا بھی تو بہت بڑا آرٹ ہے۔''

''Interesting'' لڑکے نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''تم کیا کرتی ہو؟''

''بزنس ڈیل کرتی ہوں.....''

''کس فیلڈ میں.....؟''

''کیا ساری باتیں یوں ہی کھڑے کھڑے کرنا ہوں گی.....؟''

''چل کر کسی کیفے میں بیٹھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے.....بعد میں میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔''

''ابھی پک کیا نہیں اور ڈراپ پہلے کر دیا۔''

کیفے میں وہ دنیا بھر کے موضوعات پر بات کرتے رہے۔ نوجوان کی خواہش تھی کہ وہ اسے قیمتی تحفہ پیش کرے۔

''کیا پسند کرو گی.....؟''

''تمہارے بعد کیا کسی پسند کی گنجائش ہے.....؟''

''پھر بھی.....!''

''مارکیٹ چلتے ہیں.....''

''آپ مجھے اپنا پسندیدہ رنگ بتا دیں۔جس رات آنا ہے آپ کی پسند کا سوٹ اور زیور پہن کر آجاؤں گی۔''

''پھر بھی میری خواہش ہے کہ.....!''

''چلئے آپ کی مرضی.....''

وہ ایک بوتیک میں داخل ہوئے۔ پلاسٹک کے مجسموں پر خوبصورت لباس مڑھے ہوئے تھے۔تیز روشنیوں میں دکاندار نے کئی زرق برق لباس ان کے سامنے پھیلا دئے۔خریداری پر وہ سرشار تھی.....ان کے درمیان ملاقات ایک ہفتہ بعد طے ہوئی۔

اس کے خاوند نے کیپسول نگلتے ہوئے کہا۔

''تم رات گھر سے باہر رہو گی تو مجھے کون سنبھالے گا.....؟''

''مجبوری ہے۔آج بیگم صاحبہ ہاں بہت بڑی پارٹی ہے۔آرڈر لینے اور دینے ہیں۔انہوں نے رات رکنے پر اصرار کیا ہے۔اتنا کام دیتی ہیں۔میں انکار کیسے کرتی۔تم ہلکان کیوں ہوتے ہو۔موبائل تمہارے سرہانے رکھا ہے۔ تکلیف ہو تو مجھے کال کر دینا۔بیگم صاحبہ بہت اچھی ہیں۔کوئی بھی وقت ہو،ان کا ڈرائیور مجھے چھوڑ جائے گا۔''

''اچھا.....'' خاوند کی آواز اسے کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی تو وہ ابھی نہیں پہنچا تھا۔بیرے نے رہنمائی کی۔

''میڈم آپ کے لیے یہ ٹیبل بک ہے''.....وہ مینو کارڈ رکھ کے مؤدبانہ پیچھے ہٹا۔

وہ انتظار کرنے لگی۔ ہلکے سروں میں موسیقی بج تھی اور وہ اپنے آپ کو Relax محسوس کر رہی تھی۔اسے پہلی دوپہر،بسوں کا اڈہ،گھنی مونچھوں والا اور سنگیت ہاؤس کی تیز موسیقی یاد آئی۔اسے اس دن کے خیال سے اُبکائی آئی۔

''کتنا سستا بیچ دیا اپنے آپ کو.....لیکن وہ میرا محسن بھی تو ہے۔جھجک کی نتھ وہ نہ اُتارتا تو آج اتنے اعتماد سے میں کیا یہاں بیٹھی ہوتی۔''

نوجوان کے آنے پر وہ تازہ کلی کی مانند کھل اٹھی۔

''اتنی دیر کر دی.....؟''

''دیر کہاں.....دیکھو تو.....تمہارے سامنے ہوں۔''

وہ باتیں کرتے رہے اور رات کی روشنیوں میں رات کا حسن ان کو مسحور کرتا رہا۔

''میرا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔'' عورت نے سوپ سِپ کرتے ہوئے کہا۔

''کھل کے کہو۔''

''عورت اتنی آسانی سے نہیں کھلتی۔''

''تم نے تو کچھ نہیں چھپایا۔''

''میری مشکل یہ ہے کہ دولت مند ہونے کے باوجود بغیر ڈیل کے میں تمہارے ساتھ رات نہیں گزار سکتی۔''

''میں نے کب انکار کیا ہے۔''

''انکار تو نہیں کیا۔تم اتنے وجیہ ہو کہ میں اپنا آپ تم پہ لٹا کر سرشار ہو جاؤں گی لیکن پورا ہفتہ سوچتی رہی کہ کم سے کم تمہارے ساتھ ڈیل نہ کروں۔''

''جھجکنا کیسا.....؟ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔میں بغیر Amount کے نہ انجوائے کر سکتی ہوں نہ کرا سکتی ہوں۔پہلی ملاقات تمہیں یاد ہے نا۔میں نے کہا تھا کہ میں بزنس ڈیل کرتی ہوں۔عورت صرف اس شخص کے ساتھ زندگی کا مکمل لطف لیتی ہے جو اس کی روح کو چھو لے۔اور یہ روح کو چھونا.....مت پوچھو.....کوئی قسمت والا ہوتا ہے جو روح کو مس کر جائے۔''

''کیا کسی نے تمہاری روح کے تار پر اپنا لمس چھوڑا.....'' نوجوان نے اس کی آنکھوں میں اتر کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اور وہ چپ ہو گئی۔

رات پرسکون اور کمرے میں مہک تھی۔کھانا ہوٹل سے وہ کھا کے لوٹے تھے۔اب صرف ڈیل کی تکمیل ہونا باقی تھی۔اس نے مہنگائی کے گراف کے ساتھ ساتھ اپنی قیمت بڑھائی تھی۔رات کی جست اتنی طویل تھی کہ اس کے من میں پلنے والی تقریباً تمام خواہشات کی تکمیل ہو گئی۔وہ اتنی سرشار تھی کہ صبح آنکھ کھلنے پر نرم تکیے سے سر اٹھانے کو اس کا جی نہیں مان رہا تھا۔گلابی نائٹی سمیٹ کر وہ اُٹھی،پردے سرکائے اور صبح کی روشنی اپنے اندر اتاری۔پلٹ کر دیکھا تو پلنگ پر نوجوان بے خبر سو رہا تھا۔اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔کچن سے وہ ایک مگ چائے تیار کر لائی۔وہ صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔اسے پہلی بار اچانک اپنے آپ سے گھن آئی۔وہ اپنے آپ سے الجھتی لڑتی جھگڑتی وہاں سے گھر پہنچی۔

اس کا خاوند اخبار پڑھ رہا تھا۔وہ زندگی اور اخبار دونوں بند آنکھوں سے پڑھتا تھا۔اس کے اندر پیدا ہونے والے سوالات کے سنپولیے اور بچھو اس کے وجود کو ڈستے رہتے وہ اس زہر کا عادی ہو گیا۔

اپاہج پن کو اس کی بیوی کے سوا سنبھالنے والا اور کون تھا۔وہ چپ نہ رہتا تو اور کیا کرتا۔اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔وہ چارپائی پر اپنی جنگ ہار چکا تھا۔بیوی اس کو نظر انداز کرتی بیڈ روم میں گئی۔اس کے بدن میں اتنی تکان اتر آئی جیسے کسی نے اسے پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیا ہو۔یہ کیا.....؟ مجھے تو ابھی نہیں تھکنا۔ابھی کچھ برس اور ہمت کی جا سکتی ہے۔جب جسم ڈھل جائے گا تو پھر آرام ہی تو کرنا ہے۔ابھی تو درخت پھل دیتا ہے۔جب بنجر ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن دیمک نے کہیں اندر اپنا عمل شروع کر دیا تھا۔اور وہ بے خبر تھی۔وہ ایک لمبی پرسکون نیند کی خواہش رکھتی تھی جو اسے میسر نہیں تھی۔وہ یہ راستہ چھوڑ کے کسی درخت کے نیچے سستانا چاہتی تھی۔درخت.....جن کا وجود ہی معدوم ہوتا چلا جا رہا تھا۔پختہ سڑک کے کنارے اس نے ایک دن ٹنڈ منڈ درختوں پر نظر ڈالی اور مسکرا دی۔

سارے کے سارے بانجھ.....کوئی سایہ دینے کے قابل نہ رہا.....انہی درختوں کے ساتھ چلتے ایک دن شام میں جب وہ گھر اپنے کام نمٹا کے لوٹ رہی تھی اور تکان اس کی پنڈلیوں سے لپٹی تھی کہ بھرے بازار میں ایک دراز قد شخص نے اسے روکا۔''تمہیں جرأت کیسے ہوئی مجھے روکنے کی.....؟''

’’تمہیں جرأت کیسے ہوئے مجھ سے یہ سوال کرنے کی.....؟‘‘ لہجہ نرم تھا۔

’’میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔‘‘

’’میں بھی اپنی مرضی کا مالک ہوں لیکن.....؟‘‘

’’لیکن کیا.....؟‘‘

’’تمہاری چال تمہاری کی مرضی کے تابع نہیں ہے۔ میں اپنی رات تلاش کرنے کی مکمل پہچان رکھتا ہوں۔‘‘

’’لیکن آج میں تھک گئی ہوں۔‘‘

’’تھکن ہم اتار دیں گے۔‘‘

وہ مان گئی.....وہ شخص ایک ادارے میں ملازم تھا اور کھل کھیلتا تھا۔ ادارے میں اس نے عزت کی بجائے دولت کو ترجیح دی اور دولت خرچ کرنا بھی اس کی ضرورت تھی۔ جب وہ اس کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی تو کمرہ آراستہ تھا۔ میز پر وائن اور شیشے کے جام موجود تھے۔ تھوڑی دیر میں ملازم بھنا ہوا گوشت، کباب اور دیگر لوازمات سجا گیا۔ بستر پر دراز ہو کر اس نے سینے تک کمبل کھینچ لیا۔

’’میں ذرا واش روم سے ہو لوں۔‘‘ اس شخص نے کوٹ بستر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی لیکن نیند پلکوں پر حاوی تھی۔ باہر سڑک پر کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز سنائی دیتی.....پھر سناٹا چھا جاتا۔ دیوار پر ایک چھپکلی اپنے شکار پر جھپٹنے کو تیار تھی۔ وہ باتھ سے نکلا تو حیران رہ گیا۔ وہ سو چکی تھی.....گہری نیند.....ایک دم اسے اس پر پیار آیا اس نے فیصلہ کیا کہ اسے نہ جگایا جائے.....وہ بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر صوفے پر دراز ہو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ وال کلاک پر نظر ڈالی.....صبح کے آٹھ بجنے کو تھے۔

’’تو کیا ساری رات سوتی رہی.....؟ اس نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟ اسے مجھے جگا دینا چاہئے تھا۔ اس نے میرا اتنا خیال کیوں رکھا۔ میں تو کسی کی کچھ بھی نہیں ہوتی۔ پاگل تھا، کوئی یوں بھی رات برباد کرتا ہے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں۔ میں ساری چیزیں واپس کر دوں گی۔ ایک پائی نہیں لوں گی۔ جب محنت نہیں تو معاوضہ کیسا.....اسے کس نام سے پکاروں۔ گاہک تو ہمیشہ بے نام ہوتے ہیں۔ دکان دار کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ وہ ہر گاہک سے نام پوچھے۔ میں اسے کس نام سے پکاروں۔‘‘

وہ آنکھیں ملتی دروازے کی جانب بڑھی.....آہستہ سے دستک دی۔

’’جی.....‘‘ ایک ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا جو چوکیدار تھا۔

’’صاحب کہاں ہیں.....؟‘‘

’’وہ تو رات میں ہی چلے گئے‘‘

’’کہاں چلے گئے.....؟‘‘

’’بتا کر نہیں گئے.....‘‘

’’کوئی نام.....اتا پتا.....؟‘‘

’’مسافر تھے جی.....‘‘

’’کوئی پیغام چھوڑا.....؟‘‘

’’جی.....‘‘ چوکیدار نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دیا۔

اس نے آہستگی سے لفافہ کھولا تو حیران رہ گئی۔ لفافے میں پانچ روپے کا متروک نوٹ رکھا ہوا تھا.....اچانک نوٹ سے ایک لہر نکلی اور اس کے وجود کو چیر گئی.....یہ نوٹ.....یہ نوٹ.....یہ نوٹ تو بچپن میں میں نے عادل کو دیا تھا.....تو کیا وہ.....؟ گلیاں محلے چہرے اس کے اندر چیخنے لگے اور وہ وہیں دہلیز پر ڈھیر ہو گئی.....!

◀◀ ● ▶▶

Post Office : Chashma Barrage
District : Mianwali, Pakistan

ایک دِن ہماری اِیما پر پروفیسر عبدالقدّوس مرزا کو طرح طرح سمجھانے لگے کہ کتّا بڑا بے نظیر جانور ہے۔ کتّے کا سِوا کوئی جاندار پیٹ بھرنے کے بعد اپنے پالنے والے کا شکر ادا نہیں کرتا۔ غور کرو، دُمدار جانوروں میں کتّا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دُم کو بطور آلۂ اظہارِ خلوص و خوشنودی استعمال کرتا ہے۔ ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پُونچھ سے صرف مکّھیاں اُڑاتے ہیں۔ دُنبہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اِس کی دُم صرف کھانے کے کام آتی ہے۔ البتّہ بیل کی دُم سے "ایکسی لیٹر" کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر تمہیں بیل گاڑی تھوڑی دَوڑانی ہے۔ (مرزا کے زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے! ایک فرانسیسی ادِیبہ کیا خُوب کہہ گئی ہے کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں، اُتنے ہی کتّے اچھّے لگتے ہیں! (لہجہ بدل کر) کُتّوں سے ڈرنا بڑی نادانی اور بُزدِلی ہے۔ خصوصاً ولایتی کتّوں سے! پھر مرزا کا ڈر نکالنے کے لئے انہی کے کھچڑی سر کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انگریزوں کے کُتّوں کے دانت مصنوعی ہوتے ہیں! کھانے کے اور، کاٹ کھانے کے اور! قسموں سے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو ہماری طرف اشارہ کر کے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی تین ہفتے سے ایک دُم کٹا" کا کر اسپینل "پلّا پال رکھا ہے۔ (کاکر اسپینل کی مشہور پہچان معلوم ہے؟ اس کے کان اس کی ٹانگوں سے لمبے ہوتے ہیں اور ٹانگیں اتنی چھوٹی کہ زمین تک نہیں پہنچ پاتی!) دو ہفتے تک تو بچّے دن دن بھر اسے گود میں اٹھائے بھونکنا سِکھاتے رہے۔ مگر اب ان کو اس سے دور ہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ جمعہ کو چھوٹے بچے نے کھیلتے کھیلتے اچانک اسے کاٹ کھایا۔ اپنے پہلے دانت سے۔ ابھی تک پِلّے کے پنسلین کے انجکشن لگ رہے ہیں۔ (مشتاق احمد یوسفی)

● عامر ابرھیم

منزل

جب وہ پہلی دفعہ میرے خواب میں آئے تو ان کے سفید کپڑے اجلے تھے۔ان کی میانوں پہ منڈھے ہوے چمڑے میں چمک تھی۔اوران کے سفید برّاق گھوڑوں کا اتھرا پن نظر ٹکنے نہیں دیتا تھا۔یہ بچپن کا قصّہ ہے۔میں نے یہ خواب تسلسل سے دیکھا تھا۔

میرا شہر چاروں طرف سے فصیلوں میں گھرا ہے۔یہ ایک صدیوں پرانا شہر ہے۔اس کے متعلق دیو مالائی قصّے مشہور ہیں۔مثلاً یہ کہ انسانوں سے پہلے یہاں خواب رہا کرتے تھے۔اورخوابوں سے پہلے یہ شہر بن گیا تھا۔انسان بہت بعد میں بنااوراس شہر پہ آن قابض ہوا۔وغیرہ وغیرہ

میں ایک پرانے بوسیدہ گھر میں رہتا ہوں۔چند تاریک خالی کمرے ان کے آگے ایک برآمدہ جس کے ایک طرف میری چارپائی ہے۔چند قدموں میں طے ہوجانے والا صحن اور ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرہ جو کبھی بیٹھک تھا اب میری دوکان ہے۔اس میں روزمرّہ کی اشیائے خوردونوش، چند مصالحہ جات، پھکیاں اور بہت سے پرانے بوسیدہ لکڑی کے نمائشی خالی ڈبے۔میں روزانہ اپنی دوکان کی فرشی نشست کے گندے ٹاٹ پہ بیٹھ کے گاہک تاڑتا رہتا ہوں۔باہر ایک چھوٹی سی تنگ گلی ہے جو ایک طرف سے اندرون شہر کی پر پیچ اور مزید تنگ گلیوں سے نمودار ہوتی ہے اور دوسری طرف شہر کی سڑک سے جا ملتی ہے یہ گلیوں کا سلسلہ بھی چھوٹی آنت اور بڑی آنت جیسا ہے۔گاہک کے آنے پہ میں اسے باتوں میں الجھالیتا ہوں اور باتیں کرتے ہوئے مسلسل ایک آنکھ دبا کے باتوں میں کمینگی کا تخصص پیدا کر دیتا ہوں اوراس دوران گاہک چوروں کی طرح گلی میں جھانک کے بار بار میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔دوسرے گاہگ کے آنے تک اسے الجھائے رکھتا ہوں اور دوسرے گاہک کو تیسرے.....

سونے سے پہلے دروازے اچھی طرح بند کر لیتا ہوں۔مسلسل دبانے سے میری بائیں آنکھ چھوٹی ہوتی جارہی ہے۔میں اس پہ روزانہ ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو جاتا ہوں۔سوتے ہی سفید گھڑسواروں کا خواب شروع ہو جاتا ہے۔میری عمر کے ساتھ ساتھ میری طرح میرا خواب بہت پرانا اور عمر رسیدہ ہو گیا ہے۔گھڑسواروں کے کپڑے پھٹ گئے ہیں، گھوڑے تھک گئے ہیں اور میانوں کا چمڑا ادھڑ گیا ہے۔گھڑسواروں کا سردار بوڑھا ہو گیا ہے۔

ایک دن منادی آیا اور یہ کہتا ہوا گلی سے گذر گیا کہ سردار نے تمام شہر کو طلب کیا ہے۔بھگدڑ مچ گئی اور لوگ تیزی سے ایوان خاص کے سامنے بنے ہوئے میدان میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔

میں ہمیشہ بھیڑ کے درمیان رہتا ہوں کہ اس طرح اطراف میں کھڑے سپاہیوں سے دور رہنے سے لوگوں کے لئے مثال بنا دینے کے لئے چنے جانے سے بچ جاتا ہوں۔

سردار دوسری منزل پہ بنی ہوئی شہ نشین پہ نمودار ہوتا ہے۔ایک مصنوعی وقفے کے بعد تقریر شروع کر دیتا ہے۔

''دیکھو ہمارے پرکھوں نے اس شہر پہ قبضہ کیا تو یہاں خواب رہا کرتے تھے۔انہوں نے ہمارے اجداد کے ساتھ ایک طویل عرصہ جنگ کی۔ہم نے خوابوں کا قتل عام کیا اور انہیں کھدیڑ کے رکھ دیا۔ہم نے بہت سے خواب مار دیئے۔بے شمار زندہ درگور کر دیئے۔مگر خواب تو خواب ہوتے ہیں ہم دسیوں قتل کرتے وہ بیسیوں نمودار ہوتے ہم بیسیوں خواب کاٹ دیتے وہ سینکڑوں بن کے آجاتے۔ہمارے اجداد کے لشکر خوابوں کے خون میں لپ لپ کرتے لڑتے رہے لڑتے رہے۔'' یہاں آکے سردار تھوڑی دیر رکا۔اس کا سانس پھول گیا تھا۔جیسے یہ جنگ آج بھی جاری ہو۔جیسے وہ آج بھی اجداد کا سفاک لشکری ہو۔اس کی پھولی ہوئی سانس بتا رہی ہے وہ آج بھی خوابوں سے بھی گتھم گتھا ہے۔اس کا مطلب ہے خواب ابھی زندہ ہیں اور سردار کذاب ہے۔میں سوچتے ہوئے ساتھ والے کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ یوں خفیف سا سر ہلاتا ہے جیسے وہ میری بات تو سمجھ رہا ہے مگر اس کا شائبہ بھی سردار کو ہونے نہیں دینا چاہتا۔''پھر یوں ہوا.....'' سردار نے تقریر دوبارہ شروع کی۔.....کہ پرکھوں نے کچھ خوابوں کو جھوٹے خواب دکھائے اور انہیں بہکا دیا ان سے اپنی ہی قوم کے خلاف غداری کا طریقہ ایجاد کروایا اور انہوں نے ہمیں وہ راز دے دیا جس کے باعث ہم خوابوں کے خلاف یہ جنگ ہمیشہ کے لئے جیت گئے۔غدّار خوابوں نے ہمیں بتایا کہ انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں تلے نہیں روندا جا سکتا۔البتہ تم ہمیں خود ساختہ کتابوں میں بند کر سکتے ہو۔بس پھر کیا تھا تمام لشکری، سارے نیزہ باز، ہر شمشیر زن، سارے تیرانداز، کیا میمنہ و میسرہ اور کیا قلب و عقب، سب کے سب جلد ساز بن گئے۔ہم نے چمڑے سے اوراق بنائے اور چام کی خاطر اپنے گھوڑے تک چھیل ڈالے اپنے شہیدوں کی کھالیں کھینچ لیں اور تو اور مرے ہوئے خوابوں کی کھالوں سے بھی کتابیں بنا ڈالیں۔ہم خواب پکڑتے انہیں کتابوں میں ٹھونس دیتے۔کچھ عرصہ بند کتابوں سے خوابوں کی چیخیں سنائی دیتیں پھر آہستہ آہستہ خواب دم توڑ دیتے۔اگر تم نے خوابوں کے عالم نزع میں جاری بین سنے ہوتے تو تم کبھی نہ سو سکتے۔یہ ہمارے اجداد ہی تھے جو تاریخ کا یہ دردناک مرحلہ طے کر پائے تھے۔'' سردار تھوڑی دیر کے لئے پھر رک گیا تھا۔ہمیں لگا کہ اس کی یاد میں خوابوں کے بین گردش کر رہے ہیں۔''پھر یوں ہوا کہ کچھ چالاک خوابوں نے نظرین بچا کے فصیل شہر کے باہر جنگلوں میں پناہ لے لی۔بہت عرصہ تک میں ان کی واردات سے لاعلم رہا۔لیکن اب.....جبکہ وہ رات کی تاریکی میں فصیل پھاند کے شہر میں آجاتے ہیں اور اپنی پسند کے ذہن میں گھس جاتے ہیں اور صبح میری آنکھ کھلنے سے پہلے بھاگ جاتے ہیں۔میں نے اجداد کی روحوں سے مدد طلب کی ہے۔یہ آج کا اکٹھ اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔''

اس دوران ہمیں فضا میں پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔سر اُٹھا کے دیکھا کہ دور فصیل کی منڈیروں پہ ناقابل یقین حد تک بڑے بڑے گدھ اتر رہے تھے۔سردار نے مڑ کے گدھوں کو دیکھا اور بولا۔'' وہ آگئے ہیں۔حاضری لگانے کا وقت ہو گیا ہے۔کیا سب حاضر ہیں۔''

''حاضر ہیں۔'' خلقت شہر یکجان ہو کے پوری قوّت سے چیخی کہ درختوں سے پرندے پھڑ پھڑا کے اڑ گئے

اور پھر سائیں سائیں کرتی گہری جامنی خاموشی شہر کی گلیوں میں پھیل گئی۔

حاضری لگائی جا رہی تھی۔ امرود کی خوشبو کے خوابوں والا۔ حاضر جناب کوئی دونوں ہاتھ کھڑے کر کے اونچی آواز میں بولا۔ چنبیلی کے خوابوں والی۔ حاضر جناب ایک زنانہ چیخ ابھری اور دو حنائی ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔ گلاب کے خوابوں والی۔ فاختہ کے خوابوں والا۔ صبح کے خوابوں والی۔ امچور کے خوابوں والی۔ سردار باری باری نام پکار رہا تھا اور لوگ حاضری لگوا رہے تھے کہ کسی منچلے نے شرارت کی اور زوردار آواز آئی چھچھوندر کے خوابوں والا اور سردار کے دونوں ہاتھ بے اختیار فضا میں بلند ہو گئے تھے مگر حاضر جناب کہنے سے پہلے ہی وہ سنبھل گیا اور چھلانگ لگا کے ایوان کی شہ نشین سے نیچے کود گیا۔ وہ مجمع میں گھس گیا اور ایک نوجوان کو پکڑ کے گھسیٹتا ہوا ایوان میں لے گیا۔ اس نے نوجوان کا جسم اپنے پیروں میں دبایا اور دونوں ہاتھ اس کی گردن پہ جما کے اس کی گردن اکھاڑ ڈالی۔ اور اکھڑے ہوئے نرخرے سے غٹ غٹ خون پینے لگا۔ پھر اس کی کھوپڑی الٹ کے اس کا مغز کھایا۔ اس کی جنگلی داڑھی پہ جگہ جگہ مغز کے سفید لوتھڑے لٹک رہے تھے۔

سردار نے ہانک لگائی گھوڑے کے خوبوں والا۔ حاضر جناب! میں نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ میں آخری انسان تھا۔ حاضری ختم ہو گئی تھی۔ آج کی محفل کا دولہا گھوڑے کے خوابوں والا ہے۔ سردار نے اعلان کیا۔ یہ ہمارے پرکھوں کے ساتھ جائے گا۔ اور واپس آ کر ہمارے دکھوں کا مداوا کرے گا۔ میں اعلان سن کے دھاڑیں مار مار کے روتا رہا اور لوگ مجھے تسلیاں دیتے ہوئے سردار کے حکم پہ عمل کرنے لگے۔

مجھے تیار کیا جانے لگا۔ خوشبوؤں میں تر کر دیا گیا۔ دولہا جیسا عروسی جوڑا پہنایا گیا۔ سنہری کام والے پاپوش اور نہ جانے کیا کیا۔ اس دوران معلوم ہونے کے باوجود میں بار بار پوچھتا رہا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ میری منزل کتنی دور ہے۔ سب مجھے سجانے میں مگن تھے اور میری کوئی نہیں سن رہا تھا۔ بس مجھے ایک کتاب دی جاتی ہے۔ اس میں تمہارے ماں باپ دفن ہیں۔ مجھے کتاب دوران سفر سینے سے لگائے رکھنے کی تاکید کی جاتی ہے اور ہاں رکنا نہیں ورنہ اجداد کی روحیں غضبناک ہو کے تمہارا مغز تک نوچ لیں گی۔

سردار مجھے بازو سے پکڑ کے شہر کے عقب والے دروازے کی طرف لیجاتا ہے۔ خلقت شہر جلوس کی شکل میں میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ صدیوں سے بند رہنے والا عقبی دروازہ میرے لئے کھول دیا جاتا ہے۔ دروازہ ایک منحوس چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا ہے۔ اس کے اوپر والے حصّوں سے گرد کے تھدّے دربانوں کے سروں پہ آن گرتے ہیں۔ منظر بھدّا ہو جاتا ہے اور مجھے باہر دھکیل کے دروازہ بند کر دیا جاتا۔

میرے سامنے تا حدِ نظر ویران ٹیلے ہیں۔ اور صحرا کی چھوٹے چھوٹے بگولوں میں ناچتی ہوئی ریت۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کے میں سر اوپر اٹھاتا ہوں۔ گدھ میرے سر پہ چکر لگا رہے ہیں۔

میں صحرا میں سفر شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے کہاں جانا ہے۔ کتاب سینے سے لگائے گِدھوں کے سائے میں صرف چلتے رہنے کے لئے چلتا رہتا ہوں۔ چلتا رہتا ہوں۔ چلتا رہتا ہوں۔ صحرا اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ ایک بے معنی دن اور رات کا چکر اور نقاہت کے بڑھتے ہوئے پھیرے۔ مگر میں چلتا رہتا ہوں۔ اکتائے ہوئے نقاہت بھرے قدموں سے صحرا کی ریت میں ٹھوکریں کھاتا، الجھتا، پاؤں گھسیٹتا چلتا رہتا ہوں۔

نہ جانے کہاں سے میرے ذہن میں سفید گھوڑوں والے خواب کا خیال آتا ہے۔ گِدھ خواب کی چاپ سن لیتے ہیں۔ وہ چیختے ہوئے دائرہ بناتے ہیں اور دائرے میں ہی زمین پہ اتر آتے ہیں۔ وہ مجھے گھیر لیتے ہیں۔ ایک گِدھ اچھل کے میری پنڈلی میں اپنی چونچ گاڑ دیتا ہے اور مچھلی کی بوٹی نوچ کے لے جاتا ہے۔ میں درد کی چیخ اپنے جبڑوں میں پیس دیتا ہوں۔ لیکن درد کنپٹیوں سے ہوتا ہوا میری آنکھوں میں اترتا ہے۔ بہتے ہوئے خون کو روکنے کے لئے کھڑے کھڑے ایک طرف جھک کے زخم پہ ہاتھ رکھ لیتا ہوں اور اسی حالت میں چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ رکوع کی حالت میں جھکا ہوا ایک ٹانگ پہ اچھل کے آگے بڑھتا ہوں اور زخمی ٹانگ گھسیٹ کے اپنے قریب لے آتا ہوں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں سمجھ جاتا ہوں کہ میرا سفر اب ختم ہو گیا ہے۔ میں مایوسی کے عالم میں اپنی جدوجہد ترک کر دیتا ہوں اور خالی نظروں سے آگے بڑھتے ہوئے گِدھوں کو دیکھتا ہوں۔ اچانک کتاب سے بیزاری جنم لیتی ہے اور میں کتاب پھینک دیتا ہوں۔ کتاب پھینکتے ہی دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں سفید گھوڑوں پہ گھڑ سوار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ ہم سے کچھ دوری پہ رک جاتے ہیں۔ گھڑ سوار بوڑھے اور ان کے گھوڑے نحیف ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی زنگ آلود تلواریں نکال کے مجھے ہلہ شیری دیتے ہیں۔ ان کی نحیف آواز بمشکل مجھ تک پہنچ پاتی ہے۔ وہ مجھے سے گِدھوں کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ مقتل میں آ گئے ہیں مگر انہیں اپنا کام ہر صورت کرنا ہے۔ دوسری طرف گدھ میرے قریب آ گئے ہیں وہ اپنی گردنیں لمبی کئے پہلووں پہ لڑنے کے انداز میں پر پھیلائے اپنی منحوس چونچوں سے میری کھوپڑی پہ تنبیہہ کے انداز میں دستک دے رہے ہیں۔ گھڑ سوار بھی قریب آ گئے ہیں۔ میں گِدھوں کے گھیرے میں عالم رکوع میں کھڑا ایک ہاتھ سے اپنا زخم دبائے حسرت سے اپنے سفید خوابوں کو دیکھ رہا ہوں۔ بڑا گِدھ زور سے میری کھوپڑی پہ اپنی چونچ مارتا ہے۔ میں اپنی کھوپڑی کے تڑخ جانے کی آواز سن لیتا ہوں۔ میرے خواب میری بے بسی دیکھ کے رونے لگتے ہیں۔

میں ہاتھ کے اشارے سے گھڑ سواروں کو بھاگ جانے کا کہتا ہوں۔ میرا فیصلہ سنتے ہی گدھ پلٹ کے گھڑ سواروں پہ حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ انہیں نوچ رہے ہیں۔ گدھ نے سردار گھڑ سوار کی آنکھ میں چونچ گھسا کے اسکی گردن کے عقب سے نکال لی ہے اور دوسرا کھٹ بڑھئی کی طرح ایک اور کا نرخرہ کھود رہا ہے۔ کوئی کسی گھوڑے کے پیٹ میں گھس گیا ہے۔ میں اپنا زخم ٹھیک ہوتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میری کھوپڑی پھر سے جڑ گئی ہے۔ میرے بازوؤں کی جگہ پر نمودار ہونے لگے ہیں۔ میرے پاؤں پنجوں میں بدل گئے ہیں اور کچھ ہی دیر میں میں گِدھ بن جاتا ہوں۔ ایک وحشی بھوک میرے وجود پہ قبضہ کر لیتی ہے۔ میں بے بسی سے خود کو بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ گِدھ مجھے کھانے کی دعوت دے رہے ہیں میری انسانی یادداشت بجھتی چلی جا رہی ہے۔ گِدھ مجھے پہلے ہی دن ایک جہاندیدہ گِدھ میں ڈھل جانے پہ مبارک دیتے ہیں۔ میں بھوک سے بیتاب ہو کے اپنے خواب پہ پہلی چونچ مارتا ہوں۔

◀◀ ● ▶▶

14/c Behind S.S.P. House Dawood Street
Civil Lines ,Jhang Sadar, Pakistan

● عمر احمد بنگش

پہلی صف

اکبر خان جتوئی جدی پشتی زمیندار تھا۔ اس کی حویلی ایک بیگھے رقبے پر اس کے دادے نے بڑی باڑھ کے بعد دوبارہ تعمیر کی تھی۔ ساتھ ہی اس کے کئی باڑے اور ایک ڈیرہ جس پر ہر وقت مزارعوں اور باڑے کے ماجھیوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ تین بیویاں، دو جوان جہاں بیٹے جو زیادہ تر شہر میں رہتے، کئی گھیر زمین کی جاگیر اور اس میں کئی ایکڑ آموں کے باغ اور سال میں ایک اناج اور دوسری صاف منافعے کی فصل بوئی جاتی تھی۔ سب کچھ تھا مگر جیسے کمی ہوا کرتی ہے، اکبر خان کی بھی دو کمزوریاں تھیں۔ اول، ضرورت سے زیادہ زمین ہونے کے باوجود وہ مزید سمیٹنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا اور دوم حویلی کی زنان خانے میں تین بیویوں کے باوجود بھی وہ ڈیرے پر عورتیں لائے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر سال کچھ نہ کچھ زمین یا تو کسی مجبور سے خرید لیتا، نہیں تو ہتھیانے تک کے لئے اس کے کاردار موجود تھے جن میں اکثر چھٹے ہوئے مفرور تھے جو اس کے ڈیرے پر پناہ لئے ہوئے تھے۔ پھر جبلی ہوس کے لئے اکثر تو ناچنے والی کنجریاں بلا لاتا ورنہ مزارعوں کی عورتیں تو کھونٹی پر بندھی گائیوں کی طرح ہر وقت ہی اس کی خدمت واسطے موجود تھیں، یہاں بھی جو مرضی سے آ جاتی تو ستے خیراں نہیں تو اس کے کاردار پگڑی لے کر جاتے اور رات کے نکاح میں باندھ کر لے آتے۔

جو بھی تھا، ان دو قباحتوں کے علاوہ اکبر خان بھلا آدمی تھا۔ پانچ وقتی جماعت کا نمازی اور مسجد کا خادم۔ سارا خرچہ خود تن تنہا اٹھاتا، مولوی کا ماہانہ وظیفہ یاد سے اس کی کوٹھڑی میں بھجوا دیتا اور مسجد میں خدا کے مسافروں کے لئے دلئیو وقت کھانا بھی اکبر خان کی حویلی سے ہی پک کر آیا کرتا تھا۔ عرس میلے، زیارت پر کئی ہزار روپوں مالیت کا گھی مکھن اور نذرانہ علیحدہ سے پہنچاتا کہ اس کی فصل، حویلی اور ڈیرے میں مرشدوں کی برکت اور خدا کا سایہ قائم رہے۔ ہاں، مسجد میں بس اسے ایک خبط تھا کہ ہمیشہ پہلی صف میں عین ملا کے پیچھے نماز پڑھتا اور مجال ہے کہ اس کی جگہ پر کوئی اور نمازی قدم ڈالنے کی بھی جرات کر سکتا ہو۔ لوگ اس کے منہ پر گاؤں میں تو کچھ نہ کہتے تھے مگر اکثر نائی موچی بازار میں اکٹھے ہوتے تو دبے دبے اکبر خان کی اس عادت کو برا جانتے۔ جیسے، نورا حجام ایک دن ریتی پر استرا تیز کرتے ہوئے سامنے بیٹھے شوکے موچی سے کہنے لگا کہ،

'پہلے تو بس صف میں جگہ تھی، اب اکبر خان نے مصلیٰ تک اپنے لئے علیحدہ سے لگوا لیا ہے۔ آگے مولوی کا مصلیٰ ہے تو ایک سجدہ چھوڑ کر اس کا مصلیٰ بچھا ہوا ہے۔ کاردار نے بتایا کہ خان نے یہ مصلیٰ خصوصاً مدینے سے منگوایا ہے"۔

شوکا موچی جو بے دھیانی سے اس کی بات سنتے ہوئے گھسے جوتوں میں سوئے تار رہا تھا، مدینے کا ذکر سن کر ایک دم مودب ہو گیا۔ دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر لگائے اور کہنے لگا، "مولا برکت ڈالے۔ خدا جانتا ہے بستی میں اس کی وجہ سے مسجد میں سب کو سہولت ہوتی ہے۔ پانی سارے پہر ٹونٹیوں تک میں آتا ہے اور پھر مسافروں کے لئے اس نے جو بندوبست کر رکھا ہے، مولا کی اس کو دین ہے۔"

اس پر نورے نے برا سا منہ بنا کر مسافروں کی آل اولاد میں حرام نطفہ گھسیڑا اور بولا،

" شوکے، حرام پنا نہ کر۔ خان کی خود کی حالت یہ ہے کہ رات عورتوں کی گود اور فجر مولوی کے پیچھے گزرتی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے تو فجر سے توبہ کر لی۔ سو یہ وہ نام تو خدا کا پڑھ رہا ہوتا ہے مگر منہ کپی کی باس مارتا رہتا ہے۔ جماعت حرام ہو تو ایسی مکروہ نماز کا فائدہ؟" اس پر شوکے نے بھی استغفار پڑھی اور گویا ہوا کہ،

"باقی تو سب ٹھیک ہے، بس اس کی یہ عورتوں والی بدعادت چلی جائے تو بندہ ہیرا ہے، ہیرا۔" اب کے شفیے درزی نے شلوار کے نیفے کا عرض سلائی مشین میں فٹ کیا اور ہتھ دستی سے کھٹ کھٹ مشین چلاتے لقمہ دیا،

"بات یہ ہے بھائیو کہ اکبر خان مسجد میں نماز پڑھ کر خدا کو راضی رکھتا ہے، مگر پہلی صف میں کھڑے ہونے کی عادت اس کے دادے والی ہے۔ میرا ابا کہا کرتا تھا کہ جتوئیوں کو خدا کی زمین تو عطا ہوئی ہی ہے مگر وہ مسیت کے بھی زمہ دار ہیں۔ کہو تو وہ مسیت میں بھی خدا کے شریکے ہیں"۔ ان لوگوں کی یہ بحث ہمیشہ کی طرح تبھی بس ہوئی جب اکبر خان کا منشی طیفا وہاں آ کر بیٹھ گیا اور حقہ سلگا کر تاشوں کی بازیاں چلنے لگیں۔ شوکے، نور یا ور شفیے نے اپنا دھندہ ویسا چھوڑ کر دن بھر کی کمائی تھڑے پر جوئے میں جھونک دی۔

شام میں اکبر خان باہر ہوا خوری کو نکلا کرتا تھا۔ اس روز بھی جب وہ بازار میں نکلا تو منشی بازی آدھی چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑا تو شوکے نے منہ نیچے کر کے پاس بیٹھے شفیے کی ران دبا کر کہا کہ، "لے بھئی شفیے، طیفا دلال اپنے خان کے لئے رات کا انتظام پوچھنے گیا ہے۔" اور شوکا جوان دونوں کو سن رہا تھا طیفے کو واپس آتا دیکھ کر بولا، "رب جانے کس مزارعے کی فصل میں یہ حرامی کھوٹ نکالے گا۔" اور طیفے نے جیسے بات سن لی ہو، ہنسا اور رقم سمیٹتے بولا،

" آج کی بازی تو سجنو میں لے ہی گیا، اب دیکھو کس دن خان کا بازتم حرامزادوں کی چڑیوں پر نظر ڈالتا ہے۔"

اس کی موجودگی میں تو کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے جانے کے بعد سب نے خان اور اس کے دلال کی زبانی کلامی خبر لی۔

منشی طیفے کا کام دلال جیسا ہی تھا۔ وہ اکبر خان کے لئے مزارعوں کی عورتیں ڈھویا کرتا تھا۔ اس کے پاس سب کا حساب تھا اور جس مزارعے کی کوئی عورت تارنے والی ہوتی تو اس کے حساب میں ردبدل بھی ہو جاتا تھا۔ اکثر تو اس کی ضرورت بھی پیش نہ آتی تھی اور اس دن بھی شام جب وہ گجو کی بیٹی کو ساتھ لئے ڈیرے پر پہنچا تو شام پڑنے والی تھی۔ اکبر خان کچھ افسردہ سا باہر کھلے میں چارپائی پر لیٹا تھا۔ گجو کی بیٹی کو وہ اندر چھوڑ کر خان کے پاس آیا تو اکبر خان نے اسے منع کر دیا۔ طیفے کو سمجھ نہ آئے کہ ماجرا کیا ہے۔ اکبر خان نے اٹھ کر حقے کا پائپ چارپائی کی پائنتی میں پھنسایا اور بولا،

"جگو سپیرا سنا، بستی میں واپس آ گیا ہے؟" اس پر طیفے نے بتایا کہ وہ دو تین دن ہوئے اپنے کڈے کے

ساتھ واپس آ گیا ہے اور اس بار کہتا ہے کہ اچھے خاصے رنگ برنگے چھوٹے بڑے کئی سانپ پکڑ لایا ہے۔ اسی وجہ سے بستی میں اچھی خاصی رونق لگی ہوئی ہے۔ اکبر خان نے ان سنی کر کے پوچھا،

"نوری بھی آئی ہے؟"

گو طیفا معاملہ تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا بس اکبر خان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

نوری جگو سپیرے کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ بس پچھلے سال ہی اس کی جوانی نکلی تھی۔ سانولی اور بھرے گالوں والی۔ لانبی زلفیں گت بنا کر یہاں وہاں گھماتے پھرتی۔ نکلتا قد اور ابھرا سینہ خم کھاتی کمر میں اور بھی بھلا نظر آتا۔ باپ کے ساتھ سانپوں کا تماشہ کرنے نکلتی تو لوگوں کی نظریں اس کو ٹٹولتیں، سنپولیوں جیسی ہر جسمانی خم دار ادا مسحور کن سی سب کو محو کر دیتی، یہاں تک کہ جگو سپیرے کو لاٹھی زمین پر مار مار لوگوں کو سانپوں کی طرف متوجہ کرنا پڑتا۔ الغرض، جس کو دیکھو سانپوں کے بہانے نوری کو دیکھنے نکلا کرتا تھا اور پھر کئی سو روپے بے سود پھکیوں پر خرچ کر کے اٹھتا اور کہو تو سمجھتا، منافعے میں رہا۔ اکبر خان نے جب سے نوری کا یہ نظارہ کیا تھا، باؤلے کتے جیسے ہر وقت اس کی مشک مارتا رہتا تھا۔ اس رات بھی گجو کی بیٹی جب اس کے بستر میں گھسی تو خان کا دھیان دور بستی میں نوری کی طرف بٹا ہوا تھا، سو یہ واپس جاتے ہوئے گجو کی بیٹی شرمندہ سی روانہ ہوئی۔ اگلے روز تو جیسے آپے سے باہر ہو گیا۔ تین نمازیں وہ مسجد نہ جا سکا، اور صف میں اس کی جگہ پر کسی دوسرے کو کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا مصلیٰ ویسا ہی خالی چھوڑ کر نمازیں ادا کرنی پڑیں اور اس شام نورے حجام کا گلہ یہ تھا کہ تین نمازیں صف میں خالی مصلے کی وجہ سے مکروہ ہو گئیں۔ خان بد بخت، مسیت جائے یا نہیں، نمازیں سب کی مکروہ ہو جاتی ہیں۔

طیفے منشی کو آج تیسرا دن تھا کہ نوری کے پیچھے پیچھے کتے کی طرح سونگھ لے رہا تھا مگر یہ اور اس کا باپ تھے کہ اس کے ہاتھ نہ آتے۔ پل کو جھگی سے نکلے اور پھر گھس گئے۔ پچھلی شام سانپوں کا تماشہ بھی نہیں ہوا تھا تو طیفے کی مشکل اور بھی بڑھ گئی۔ تبھی اس کو جب اکبر خان نے خوب لعن طعن کیا تو اس نے نوری کے باپ جگو سپیرے کو اس کی جھگی میں جا لیا۔ نوری کے لئے خان کا پیغام پہنچایا جس پر جگو کی باچھیں کھلی رہ گئیں۔ پہلے تو اس نے پس و پیش سے کام لیا اور پھر جب طیفے نے ہلکے سے اسے خمیازے کا اندازہ کروایا تو منت ترلے پر آ گیا، منمنا کر ہاتھ جوڑے اور جیسے باور کرایا،

"مائی باپ، ہم سپیرے آزاد ہوتے ہیں اور عورت زات تو ویسے بھی اپنے من کی غلام ہے، اس کو کوئی قابو کر پایا ہو؟ نوری میرا مال ہے مگر اس کا فیصلہ وہی دیوے گی"

طیفے کو سمجھ آ گئی کہ یہ کم زات اس کو ٹال رہا ہے ورنہ عورت زات کی ایسی کہاں جرات جو انکار کر پاتی۔ وہ تو کلے سے لگی گائے ہے جسے سبزے کی لالچ دو اور اسے ساتھ ہنکائے چلے جانا چاہیے۔ مزارعوں کی طرح گو جگو سپیرا خان کا محتاج تو نہیں تھا مگر پھر بھی خان بہر حال خان تھا، اس چپے زمین کا مائی باپ تھا جہاں سے جگو سپیرا نہ صرف سانپ پکڑا کرتا تھا اور پھر وہیں ان سانپوں کے بل پر اپنے کڈے کا پیٹ بھرتا تھا۔ بالواسطہ، جگو سپیرا اکبر خان کا دیا نمک ہی کھا رہا تھا۔ طیفے نے اس کو مہلت دی اور جب واپس تھڑے پر پہنچا تو تینوں کمی اکبر خان کی نوری واسطے رسے تڑوانے کی بحث لئے ہی بیٹھے تھے۔ ان کو یہ تو معلوم تھا کہ نوری آج نہیں تو کل خان کی کھونٹی سے بندھ ہی جائے گی، دیکھنا یہ تھا کہ یہ ناگن کس منتر سے کیل جائے گی۔

چوتھے دن ہی اکبر خان کا پیمانہ لبریز ہو گیا جب نوری نے اس بابت ٹکا انکار کر دیا اور نوری کا باپ بھی منت ترلے کرتا اڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر خان کی بس ہوئی اور کاردار کو کہلوا کر نوری کو جھگی سے اٹھوا لایا اور پہلے تو اسے سمجھایا اور یقین دلایا مگر یہ تھی کہ جیسے ناگن پھنکارتی اس کو قریب نہ لگنے دیتی تھی، خان نے جب خود اس سے بات کی تو تھوک کر بولی،

"مر جاوں گی مگر حرام سے خود کو پلید نہیں ہونے دوں گی..... کاٹ ڈالوں گی"۔

اکبر خان نے مولوی کو بلا کر نکاح پڑھوانا چاہا تو نوری اور بدک گئی۔ کسی طور بھی نہ مانی تو اکبر خان طیش کھا گیا۔ مولوی کو رخصت کیا اور اس کے پاس ڈیرے میں جا گھسا اور دو جا پھڑ رسید کر کے زبردستی بھینچ لیا۔ نوری چلانے لگی اور اسی کھینچ تانی میں جب نوری پر لپٹی کالی چادر کھینچی تو اندر سے ایک میلی کچیلی پوٹلی تھپ سے زمین پر جا گری۔

گودڑی کے جیسے رنگ برنگے کپڑے کے ٹوٹوں والی کئی پیوند لگی پوٹلی تھی جس کا منہ وا تھا۔ اکبر خان جو ہوس میں ایسا دھت تھا کہ بالکل دھیان نہ دے پایا۔ گودڑ پوٹلی میں حرکت ہوئی اور سنہرے رنگ کا پھنکارتا ناجی، مشکی ناگ برآمد ہوا اور پھن پھیلا دیا۔ سنسناتی پھنکار سے ہی اکبر خان کی ساری مردانگی ہوا ہو گئی۔ ابھی وہ نوری کو دھکیل مشکی سے دور ہٹنے کو مڑا ہی تھا کہ یکا یک ناگ کے دانت اکبر خان کی ٹانگ میں گڑ گئے۔ اب کے اکبر خان کی وحشت ناک چیخ بلند ہوئی اور وہ ناگ کے سامنے گرتا چلا گیا۔ طیفا اور کاردار دوڑے ہوئے اندر آئے، تب تک زہر اکبر خان کے جسم میں سرایت کر چکا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ دونالی کے ایک فائر سے کاردار نے مشکی کا کام تمام کیا تو یہاں اکبر خان نے آخری ہچکی لی۔ یہ دونوں اکبر خان کے گرد ہی رہے اور نوری نیم عریاں ہی دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی، اور سویر سے پہلے پہلے سپیرے گاؤں چھوڑ گئے۔

صبح تک اکبر خان کے دونوں بیٹے بھی پہنچ گئے اور قبر کھود لی گئی۔ اکبر خان کا جنازہ اٹھایا گیا تھا تو منہ کالا سیاہ ہو رہا تھا۔ جنازہ گاہ میں مولوی نے پہلے تو اکبر خان کی بڑائی بیان کی اور خدا کے گھر اور سینکڑوں مزارعوں کے گھروں واسطے اس کی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے موت کی حقیقت پر توجہ مبذول کروائی اور پہلی تکبیر کہنے سے پہلے، ہدایات کچھ یوں گوش گزار کیں،

"اے لوگو، صفیں درست رکھو، ٹخنے سے ٹخنہ اور کندھے سے کندھا ملا لو۔ اگر زمین پاک ہے تو جوتے اتار لو ورنہ پہن رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔" مولوی نے توقف کیا اور ہاتھ میں تھامی ٹیک والی سوٹی سے پہلی صف کی جانب اشارہ کر کے کہا،

"صفوں کے بیچ خالی جگہیں نہ چھوڑو کہ شیطان ایسی جگہیں پر کر لیا کرتا ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ سب کی نگاہیں پہلی صف کی طرف گھوم گئیں جہاں مولوی کے پیچھے ایک شخص کی جگہ خالی تھی۔ یہاں کبھی خود اکبر خان کو کھڑے ہونے کا خبط رہا کرتا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

▶ House # B-3, Ghazikot Township,
Mansehra - 21300 (Khyber PakhtunKha) Pakistan.

● وحید احمد قمر

پکڑ

آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی اکتوبر کا آغاز ہی تھا مگر کچھ روز پہلے ہوئی بارش کی وجہ سے موسم دسمبر کی طرح سرد ہو گیا تھا۔ دور کسی مسجد میں فجر کی آذان ہو رہی تھی۔ ہر طرف مہیب تاریکی تھی۔ ایسے میں دو موٹر سائیکلوں کی ہیڈ لائٹس اس تاریکی کا سینہ چیرتی آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ سڑک دور تک سنسان پڑی تھی۔ پھر بھی ان موٹر سائیکلوں کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ شاید ہڈیوں میں گھستی سرد ہوا کی وجہ سے موٹر سائیکل سوار آہستہ چل رہے تھے یا حقیقتاً انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی نہ تھی۔ دونوں موٹر سائیکل دس منٹ مزید اس سڑک پر چلتی رہیں پھر ایک بستی میں داخل ہوئیں اور مختلف راستوں سے گزرتی ہوئیں ایک چوراہے پر آ کر رک گئیں۔

''دائیں طرف ہی مڑنا ہے نا؟'' موٹر سائیکل سوار نے اپنے پیچھے بیٹھے آدمی سے پوچھا۔

''جی!'' مختصر جواب ملا اور وہ موٹر سائیکل اس گلی میں مڑ گئی۔ دوسری موٹر سائیکل بھی اس کے پیچھے لپکی۔ اس پر بھی دو ہی آدمی سوار تھے۔ چاروں نے سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ یہاں موٹر سائیکلوں کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئیں۔ اس گلی میں دونوں طرف مکانات کا سلسلہ تھا مگر کہیں بھی روشنی نہ جل رہی تھی اس لئے تاریکی ابھی تک ماحول پر مسلط تھی۔ ایسے میں وہ دونوں موٹر سائیکلیں بھی اس تاریکی کا حصہ ہی معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ دور جا کر وہ پھر رک گئے۔

''یہ عمارت کا پچھواڑا ہے۔'' اگلی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''وہ سامنے ایک چھوٹا دروازہ ہے ہم یہاں سے اندر جائیں گے۔''

''رحیم آؤ۔'' آخری جملہ اس نے دوسری موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے نوجوان کو مخاطب کر کے کہا۔ اور دراوزے کی طرف بڑھا۔ رحیم بھی اس کے پیچھے لپکا۔ پہلا کچھ دیر تک دروازے سے کان لگائے سن گن لیتا رہا پھر اندر داخل ہو گیا۔ رحیم نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

وہ ایک وسیع صحن میں تھے۔ سامنے ایک چھوٹی سی چوکور عمارت تھی کے صحن کی طرف تین دروازے تھے۔

''تم ان دروازوں میں سے کسی ایک سے اندر جاؤ گے جب کہ میں بغلی گلی کی طرف سے کھڑکی تک جاؤنگا۔'' پہلے نے جیکٹ کے سامنے والی زپ کھولی اور اور اندر چھپائی گن اپنے ہاتھ میں لے لی۔ رحیم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

''تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں۔'' پہلے نے رحیم کو گھورا۔

''نن.....نہیں تو۔'' رحیم نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ہاتھ واقعی کانپ رہے تھے۔

''سس.....سردی کی وجہ سے۔'' رحیم کے منہ سے نکلا۔ اس کی آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

''پتہ نہیں اس آپریشن کے لئے تمہارا انتخاب کیوں کیا گیا؟ مجھے تو تم شروع سے ہی گھبرائے ہوئے لگے ہو۔''

''میں گھبرایا ہوا نہیں ہوں، محض سردی کی وجہ سے.....'' رحیم نے کچھ کہنا چاہا مگر پہلے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بزدلی کی باتیں نہ کرو۔'' اس نے گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ صحن سے گزرتے ہوئے عمارت تک پہنچے۔ رحیم ایک دروازے کی طرف بڑھا جبکہ دوسرا شخص اس تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا جو عمارت اور اس بیرونی دیوار کو جدا کرتی تھی۔ اس گلی میں عمارت کی کھڑکیاں تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ اس نے ایک جھری سے اندر جھانکا۔ چند لمحوں تک حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کھڑکی پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ لکڑی کی کھڑکی میں کئی سوراخ ہو گئے۔ اس نے گن کی پشت سے ان سوراخوں پر زور کی ٹھوکر رسید کی۔ کھڑکی میں ایک بڑا سوراخ ہو گیا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔ اندر سے قیامت کا شور اٹھا۔ آہ و بکا، چیخ و پکار۔ اس نے لوگوں کے جسموں سے خون کے فوارے چھوٹتے ہوئے دیکھے۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے واپسی کے لئے پلٹا۔ جب وہ صحن میں پہنچا تو رحیم بیرونی دروازے کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ باہر موٹر سائیکل اسٹارٹ کئے ان کے دونوں ساتھی تیار کھڑے تھے۔ وہ دونوں ان کے پیچھے بیٹھ گئے اور موٹر سائیکلیں تیر کی طرح نکلتی چلی گئیں۔

وہ سارا دن ان کے لئے بڑا ہنگامہ خیز گزرا۔ جب وہ اس آپریشن کے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو ان کے گروپ انچارج نے ان کے لئے ایک طویل سفر کا بندوبست کر رکھا تھا۔ انہیں فوری طور پر یہ علاقہ چھوڑ کر ملک کے ایک شمالی شہر پہنچنا تھا اور اس وقت تک وہاں قیام کرنا تھا جب تک یہ معاملہ کچھ پرانا ہو جاتا۔

وین کے ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد جب وہ شمالی ریاست کے شہر میں داخل ہوئے تو انہیں کسی قدر تحفظ کا احساس ہوا۔ ورنہ تمام راستے انہیں پولیس سے مڈبھیڑ کا خطرہ رہا تھا۔ جب وہ اس ٹھکانے پر پہنچے جہاں انہیں کچھ عرصہ قیام کرنا تھا تو رات ہو چکی تھی۔ ان میں سے تین تو لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے جب کے چوتھا اپنے بستر پر لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ یہ رحیم تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ ابھی تک صبح کے واقعے کی ہولناکیوں میں کھویا ہوا تھا بلکہ سارے سفر کے دوران ایک لمحے کو بھی وہ اس منظر کو فراموش نہ کر پایا تھا جب اس کے سامنے انسانی جسم خون میں نہائے گئے تھے۔ وہ آہ و بکا، چیخ و پکار اور خون میں لتھڑا ہوا منظر اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا۔ راستے میں اس کے ساتھی خوش گپیوں میں مصروف رہے تھے مگر وہ گم صم پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا تھا، حتیٰ کہ کھانے کے لئے جب اس کے ساتھیوں نے بلایا تو بھی اس نے معذرت کر لی۔

وہ دیر تک بستر پر پڑا چھت کو تکتا رہا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کچن میں آیا۔ پانی پینے کے بعد وہ بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ اس نے دیکھا دور تک چھوٹی بڑی عمارتیں اندھیرے میں ڈوبی کھڑی تھیں۔ آسمان آج بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس وجہ سے بھی رات کچھ زیادہ ہی تاریک معلوم ہو رہی تھی۔

اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا اس کا ایک ساتھی چلا آ رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔

''کیوں، نیند نہیں آ رہی؟''

''نہیں۔'' وہ تاریکی کو گھورتا رہا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم صبح کے واقعہ کے بعد بہت خائف ہو۔''

رحیم خاموش رہا۔

''کیا تم شرمندگی محسوس کر رہے ہو؟''

''شرمندگی.....؟'' رحیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔''

''تم اگر اتنے نرم دل ہو تو تمہیں ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہئے تھا۔''

''مجھ سے کہا گیا تھا کہ کچھ لوگ اس جگہ جمع ہو کر ہمارے خلاف مسلح کاروائی کی سازش تیار کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس نکلی۔''

''بہر حال وہ لوگ ہیں تو ہمارے دشمن۔''

''کیا نہتے دشمن پر گولیاں برسانا بہادری ہے؟''

وہ کافر ہیں۔ تمہیں ان کے ساتھ ہمدردی نہ ہونی چاہئے۔''

''کیا ہر کافر واجب القتل ہوتا ہے؟''

''جس کا کفر جتنا سنگین ہوگا وہ اتنا ہی سزا کا حق دار ہوگا۔''

''سلیم! بہت سے لوگ ہمیں بھی کافر سمجھتے ہیں۔ اگر وہ بھی اسی اصول پر عمل کریں کہ کافر موجب سزا ہے تو پھر یہ دنیا ایک عظیم فساد گاہ بن جائے گی۔''

''اگر تم تنظیم سے متفق نہیں ہو تو پھر ہم میں شامل کیوں ہوئے تھے؟''

''بتاتا ہوں، آج سے قریباً ایک سال پہلے ایک مذہبی جلسے میں بم دھماکہ ہوا تھا جس میں درجنوں لوگ شہید ہو گئے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا؟''

''ہاں، مجھے یہ واقعہ کیسے بھول سکتا ہے، سب ہمارے ہی لوگ تھے۔'' سلیم نے کہا۔

''مرنے والوں میں میرے تین بڑے بھائی اور والد صاحب بھی شامل تھے۔'' رحیم کی آواز درد سے بھر گئی۔

''نہیں.....'' سلیم کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''جب ایک ہی وقت گھر سے تین جوان بیٹوں اور خاوند کا جنازہ اُٹھا تو میری والدہ کا ہارٹ اٹیک ہو گیا اور محلے والوں کو پانچویں جنازے کا بھی بندوبست کرنا پڑا۔'' رحیم کی آواز رندھ گئی تھی۔

سلیم اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''تم تصور کر سکتے ہو کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی؟''

سلیم سر ہلا کر رہ گیا۔

''مجھے ہفتوں اپنی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کھانے پینے کا ہوش نہ پہننے کا۔ پاس پڑوس والے کبھی کبھار خبر گیری کر جاتے۔ صدمے کی اس اتھاہ گہرائی کی حالت میں مجھے منصور صاحب ملے۔ انہوں نے مجھے تسلی تشفی دی اور مخالف فرقے کے خلاف بہت سا لٹریچر پڑھنے کو دیا۔ میرے دل میں تو پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ منصور صاحب کی باتوں نے اسے دو چند کر دیا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میرے والد صاحب کے قاتل فلاں فلاں لوگ ہیں۔ تب میں باقاعدہ تنظیم میں شامل ہوتا کہ ان سے بدلہ لے سکوں۔ پھر کئی ماہ تک میری ٹریننگ ہوتی رہی۔ آخر کل منصور صاحب نے مجھے خاص طور پر بلا کر کہا کہ تمہارا انتقام لینے کا وقت آ چکا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔''

''اور تم تیار ہو گئے۔''

''ہاں میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں بڑے جوش اور ولولے سے اس کاروائی میں حصہ لینے گیا تھا۔ صلاح الدین نے مجھے سامنے کے دروازے سے اندر جانے کے لئے کہا۔ خود وہ بغلی گلی سے فائرنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا سامنے نظر آنے والے ہر شخص کو گولیوں سے بھون ڈالنا۔''

''اور تم نے بھون ڈالا؟''

''نہیں، میں ان لوگوں پر فائر نہ کر سکا۔''

سلیم نے بے یقینی سے اسے دیکھ کر کہا۔ ''مگر ہم نے تو گنوں کے چلنے کی آواز سنی تھی۔''

''جب میں اندر داخل ہوا اور فائرنگ کرنے ہی والا تھا کہ اندر کا منظر دیکھ کر گن خود بخود جھک گئی۔'' رحیم کہتے کہتے رک گیا۔ کچھ دیر باہر پھیلی تاریکی کو گھورتا رہا پھر بولا۔

''وہ لوگ نماز کے لئے صفیں بنائے کھڑے تھے اور سب سے پچھلی صف میں زیادہ تر بچے تھے۔ آٹھ سے بارہ سال تک کی عمر کے بچے۔ اگر میں فائرنگ کرتا تو سب سے پہلے یہ بچے ہی میری زد میں آتے۔ گن میرے ہاتھ میں منوں وزنی ہو گئی۔ اسکی نال کا رخ فرش کی طرف تھا اور میری فائرنگ سے فرش اُکھڑتا رہا۔ دوسری طرف صلاح الدین نے کھڑکی سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میرے سامنے صفیں باندھے، عبادت کرتے لوگ خون میں نہاتے چلے گئے۔'' رحیم دم لینے کے لئے رکا۔

''صرف صلاح الدین کی فائرنگ سے تو زیادہ لوگ نہ مرے ہونگے کیونکہ وہ کھڑکی سے ہال کے کچھ مخصوص حصہ پر ہی فائرنگ کر سکتا تھا۔'' سلیم نے خیال ظاہر کیا۔

''ایسا ہی ہوا ہے۔ اس وقت ہال آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ اگر میں بھی فائرنگ کرتا تو شاید ہی کوئی زندہ بچتا۔''

''تم نے یہ بات مجھے تو بتا دی ہے، صلاح الدین یا منصور سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا۔'' سلیم نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی۔ نہیں.....میں انہیں صاف صاف بتا دونگا کہ ان لوگوں کو نماز پڑھتا دیکھ کر میں

ان پر فائرنگ نہ کرسکا۔ بلکہ ان پر یہ بھی واضح کردونگا کہ میں آئندہ ایسی کسی کاروائی میں حصہ نہیں لونگا۔''

''بھول کر بھی تنظیم سے الگ ہونے کی بات ان کے سامنے نہ کرنا۔''

''کیوں؟''

''وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''مجھے ان لوگوں کا خوف نہیں ہے۔''

''پھر تمہیں کس بات کا خوف ہے؟''

''اللہ کی پکڑ کا۔ ایک عبادت گاہ میں خدا کی پرستش کرنے والوں کو خون میں نہلایا گیا ہے۔ کیا خدا خاموش رہے گا۔ مجھے آسمان پر چھائی اس ہولناک تاریکی سے ڈر لگ رہا ہے.... کچھ ہونے والا ہے کچھ ہوکر رہے گا۔'' رحیم کی آواز لرز رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ ایسے کتنے ہی واقعات ہو چکے ہیں مگر نہ آسمان گرا نہ زمین ہی پھٹی۔''

''یہی تو خوف کی بات ہے کہ اب ظلم کی انتہا ہو چکی ہے۔ زمین پر بہت خون ناحق بہہ چکا۔ آسمان آخر کب تک خاموش رہے گا۔''

''تم اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ چلو میرے ساتھ اندر۔'' سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اور ہاں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اپنے ان خیالات کا اظہار کسی پر نہ کرنا۔''

اگلی صبح ناشتے کے بعد جب صلاح الدین نے اخبار میں یہ پڑھا کہ کل والے فائرنگ کے واقعہ میں صرف آٹھ لوگ مارے گئے تھے تو آگ بگولا ہوگیا۔ اور رحیم کو مخاطب کر کے کہا۔

''تمہیں میں نے اسی لئے ہال کے دروازے سے بھیجا تھا کہ تم نئے آدمی ہو۔ ٹارگٹ کو نشانہ بناتے وقت تمہیں کوئی دشواری نہ ہو۔ مگر شاید تم نشانے پر فائر نہیں کر سکے۔''

رحیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟'' اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔

رحیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گم صم بیٹھا میز کے کونے کو تکے جا رہا تھا۔

''شاید گھبراہٹ میں نشانے پر فائرنگ نہ کرسکا۔'' سلیم درمیان میں بول پڑا۔

''میں نے منصور سے پہلے ہی کہا تھا کہ اس آپریشن کے لئے یہ لڑکا موزوں نہیں ہے۔'' صلاح الدین کی آواز ابھی تک درشت تھی۔

''ابھی نیا ہے، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیگا۔'' سلیم نے کہا۔

''اور یہ کل سے اتنا سہما ہوا کیوں ہے؟''

''اسے پکڑے جانے کا ڈر ہے۔'' سلیم کے منہ سے نکلا۔

''ہاہاہا!'' صلاح الدین نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ پھر رعونت سے بولا۔

''ہمیں کون پکڑ سکتا ہے؟''

''سلیم! اسے کچھ دیر کے لئے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے رہ رہ کر اس پر غصہ آ رہا ہے۔''

سلیم نے رحیم کا ہاتھ پکڑا اور اسے راہداری میں لے آیا۔

''تم کچھ دیر کے لئے باہر چلے جاؤ۔ تھوڑی دیر میں صلاح الدین کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا، پھر آ جانا، ابھی جاؤ۔''

رحیم چپ چاپ بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔ یہ ایک فلیٹ تھا جو ایک پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گیا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک وسیع میدان تھا جس کے بعد پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا میدان عبور کرنے لگا۔ عین اسی وقت بڑے زور کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ زمین ہلنے لگی تھی۔ رحیم کی نگاہ سامنے کی عمارتوں کی طرف اُٹھ گئی جو بڑے مہیب دھماکوں کے ساتھ زمین بوس ہو رہی تھیں جبکہ میدان کی دوسری جانب واقع پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔ رحیم نے بھاگنا چاہا مگر زمین کی ہلنت کچھ اور بڑھ گئی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ اس کے حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ غنیمت ہوئی کہ جہاں وہ گرا تھا وہ جگہ گرتی ہوئی عمارتوں کے ملبے اور پہاڑوں سے لڑھک کر آنے والے پتھروں سے محفوظ تھی۔

◀◀ ● ▶▶

London, England
E-mail:- waheedahmadqamar1@yahoo.com

قطرہ قطرہ احساس کے بعد

اقبال حسن آزاد

کا دوسرا افسانوی مجموعہ

مردم گزیدہ

شایع ہو چکا ہے

صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۲۵۰/روپئے

ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱

● نور العین ساحرہ

شبانہ کا شوہر

شبانہ نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ کاؤنٹر پر رکھے اور سر پر رکھا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔'' بھائی صاحب! اُدھار سودا منگوانے کے لئے معذرت چاہتی ہوں۔ اُس وقت گھر میں پیسے نہیں تھے۔ مگر کل سمیر کے ابا چھٹی پر گھر آئے تو آپ کا حساب چکتا کرنے کے لئے پانچ ہزار روپے دے گئے۔''

دکان دار نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور تھوڑا سا آگے ہو کر بولا۔'' ساری دکان آپ کی ہے باجی جان۔ جب مرضی جو بھی چاہے حکم کیجیے۔ گھر آ کر خود سودا پہنچا جایا کروں گا؟'' صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ باجی جان کہتے ہوئے ''جان'' پر زیادہ زور ڈال رہا ہے۔

''نہیں نہیں.....'' وہ یکدم گھبرا گئی.....'' آپ کی بڑی مہربانی۔ جو چیز چاہیے ہوگی میں خود لے جایا کروں گی۔ ویسے بھی سمیر کے ابا کا ٹرانسفر بہت جلد اِسی شہر میں ہونے والا ہے۔ وہ آ جائیں گے تو مجھے بھی نہیں آنا پڑے گا۔''

دوکاندار نے ایک آہ بھری۔'' ٹھیک ہے باجی.....جان.....جیسی آپ کی مرضی۔''

شبانہ کو اسٹاف روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ثوبیہ نے زارا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور جھک کر کان میں بولی۔'' ابھی دیکھنا، آتے ہی شوہر نامہ نشر ہونا شروع ہو جائے گا، بالکل خبر نامے کی طرح اور کم سے کم بیس منٹ تو جاری رہے گا۔ وہ بھی باقاعدہ ہیڈ لائینز اور بریکینگ نیوز کے ساتھ.....ابھی کہے گی 'انہوں' نے تو آج خود میرے لئے ناشتہ بنایا یا پھر مجھے دیر ہو رہی تھی تو 'انہوں' نے میرا دوپٹہ استری کر کے دیا.....مجھے تو لگتا ہے اِن کے 'اُنہوں' نے بی اے میں ہوم اکنامکس بھی رکھی ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ زارا حسد و رشک کے ملے جلے جذبات لئے گویا ہوئی۔'' ثوبیہ! ایسا لگتا ہے پوری دنیا میں اِن کے شوہر سے زیادہ کوئی چاہنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔ بہت آرزو ہوتی ہے کہ کاش میرے شوہر خرم بھی شبانہ کے شوہر جیسے ہوتے تو زندگی کتنی خوشگوار ہو جاتی۔'' یہ کہتے کہتے زارا کے خوبصورت چہرے پر حسرتوں کے تمام رنگ ایسے چھا گئے جیسے سردیوں کی صبح میں ہر طرف دُھند چھا جاتی ہے۔ اِس دھند میں اپنے حقوق تو بہت صاف نظر آتے ہیں لیکن فرائض دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اپنا غلط عمل بھی درست معلوم ہوتا ہے اور دوسرے کی صحیح نیت بھی مشکوک قرار پا جاتی ہے۔ زارا نے ہمیشہ کی طرح تصور میں اپنے شوہر خرم کو شبانہ کے آئیڈیل شوہر جیسے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا اور پھر خرم کو کسی صورت شبانہ کے 'اُنہوں' کے مقابلے پر

نہ پا کر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

سر مزمل نے بھی پیپر چیک کرتے کرتے نظر اُٹھا کر شبانہ کو اندر آتے دیکھا تو زارا کے شوہر اور انگلش ٹیچر خرم کے کان میں کچھ سرگوشی کی جسے سن کر وہ مکمل طور پر سر مزمل کی طرف گھوم گئے اور جھنجھلا کر بولے۔'' یار میں تو عنقریب مس شبانہ سے بات کرنے والا ہوں۔ اس طرح خاموش رہنے سے گزارہ نہیں ہوگا۔ اُن کی وجہ سے میرا تو ہنستا بستا گھر برباد ہونے والا ہے۔ یاد ہے ان کے آنے سے پہلے میں اور زارا کس قدر خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ اب تو جیسے وہ باتیں خواب خیال ہو گئی ہیں۔'' بات کرتے کرتے خرم کے لہجے میں تلخی ابھر آئی تھی۔ کہتے تو ٹھیک ہی تھے۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے زارا اُنہیں شبانہ کے شوہر جیسا بننے کے مشورے دیتی رہتی تھی۔ 'ہر وقت مقابلہ کرتی کہ آخر وہ اتنے برے شوہر کیوں ہیں؟ خرم بڑبڑائے۔'' نہ تو مجھے شبانہ کے شوہر کی طرح اپنا ناشتہ خود بنانا آتا ہے، نہ ان کی طرح روز کپڑے دھونے میں اپنی بیوی کی مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے پوری پوری رات ان کی طرح اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلنا بھی پسند نہیں اور نہ ہی اپنی بیوی کے ساتھ پیانو پر کوئی دھن بجا سکتا ہوں کیونکہ ایک تو میرے گھر میں پیانو ہی نہیں ہے دوسرے اگر ہوتا بھی تو مجھے کبھی بجانا نہ آتا۔ حد ہوتی ہے یار! میری بیوی کے نزدیک تو صرف یہی ساری باتیں پیار کی علامت ہیں اور چونکہ مجھ میں ایک بھی نہیں ہے تو طے یہ ہوا کہ میں پیار ہی نہیں کرتا۔ میں تو عورتوں کو بیوقوف سمجھتا تھا لیکن یہ تو بہت زیادہ بیوقوف ہوتی ہیں۔''

زارا اور خرم شادی سے پہلے سے اسی اسکول میں ٹیچر تھے۔ یہیں پر ان کے پیار کا سفر شروع ہوا اور شادی کے بعد ہنسی خوشی تمت بالخیر ہوا۔ اب پانچ سال سے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا کہ اچانک ایک سال پہلے یہاں جاب شروع کرنے والی خوبصورت سی شبانہ نے اپنے شوہر کے غیر معمولی قصے سنا سنا کر زارا کے زخم تازہ کر دئے۔ اُسے یکدم احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ جس آئیڈیل کے اُس نے خواب دیکھے تھے وہ اُس کی بجائے شبانہ کے نصیب میں آ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خرم سے اس کی نوک جھونک بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ چند ماہ سے دونوں کے تعلقات ایسے ہو گئے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی ان دیکھی دیوار سی کھڑی کر دی گئی ہو۔ دونوں ایک دوسرے سے کھچے کھچے سے رہنے لگے تھے۔ شروع شروع میں خرم مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اب بات حد سے باہر ہو گئی تھی اور وہ اس کا ذمہ دار شبانہ کو سمجھتا تھا۔

شبانہ نے اندر داخل ہوتے ہی سب کو سلام کیا اور اس کے بعد خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پرس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ فزکس کے 48 سالہ ٹیچر ریاض نے ایک حسرت بھری نگاہ شبانہ کے خوبصورت چہرے پر ڈال کر اپنی محرومی پر گہرا سانس لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اسے سات سال پہلے کیوں نہ ملی ورنہ آج زندگی سنور گئی ہوتی۔ حالانکہ اس کی اپنی بیوی آج شبانہ کی جگہ بیٹھی ہوتی تب بھی اُس نے یہی سوچ رہا ہونا تھا۔ بظاہر سب مصروف نظر آ رہے تھے مگر اندر سے اپنے اپنے کام روکے آج کا "شوہر نامہ" سننے کے منتظر تھے۔ سب بے قرار تھے کہ دیکھیں آج شبانہ کے شوہر نے اُس کی خاطر آسمان سے کون سے تارے توڑے ہیں لیکن شبانہ آج غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔'' کیسی ہیں آپ شبانہ؟'' زارا نے کچھ دیر انتظار کے بعد ہمت کی۔ اسٹاف روم میں موجود باقی لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔'' بس ٹھیک ہوں۔'' تھوڑی تھک سی گئی ہوں۔ اُن کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے ناں۔'' سب یکدم چونک

اٹھے.....۔''کیوں کیا ہوا آپ کے شوہر کو؟'' سرمزمل نے جلدی سے پوچھا۔

شبانہ نے ایک گہری سانس لی۔''دو دن سے سخت بخار ہے۔کسی دوا سے آرام بھی نہیں آ رہا۔ پوری رات اُن کے ساتھ جاگتی رہی۔ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی رہی لیکن بخار اُتر ہی نہیں رہا۔''

یہ سنتے ہی خرم نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک گہری نظر زارا پر ڈالی۔اگر وہ شبانہ کے شوہر جیسے نہیں تھے تو زارا کب شبانہ جیسی بیوی تھی۔اُنہیں بھی تو کئی دفعہ بخار ہوا تھا لیکن زارا نے تو کبھی پوری رات جاگنے کی زحمت نہیں کی تھی۔زارا خرم کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئی تھی اس لئے نظریں دوسری طرف کر لیں۔شبانہ کے شوہر کی طبیعت کا سن کر سب ہی کچھ پریشان سے ہو گئے کیونکہ آج تک وہ صرف اُس کی خوش مزاجی، زندہ دلی اور بزلہ سنجی کے قصے سن سن کر نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو ان کے عقیدت مندوں میں شمار کرنے لگے تھے۔اُن سب کے مشترکہ خیال میں ایسا آئیڈیل یا شائد احمق شوہر روئے زمین پر کوئی دوسرا نہ تھا اور نہ ہی ہونے کا امکان تھا اس لئے سب کو ایسے اچھے بندے کی بیماری کی اطلاع سن کر واقعی دلی دکھ ہوا تھا۔زارا تھوڑا قریب ہو گئی اور شبانہ کو دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔'' آپ اتنی فکر کیوں کر رہی ہیں، بخار ہی تو ہے اتر جائے گا۔اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے بھلا؟'' شبانہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔وہ خاموشی سے اقرار میں سر ہلا کر اپنی کلاس لینے کے لئے اسٹاف روم سے باہر چلی گئی۔ایک ہی پل میں سارا ماحول بوجھل سا ہو گیا اور ہلکی سی اداسی کی لہر پورے کمرے کو چھو کر چلی گئی تھی۔

اگلے دن جب شبانہ کی دو دن کی چھٹی والی درخواست موصول ہوئی تو زارا اور ثوبیہ نے اُس کے شوہر کی عیادت کا پروگرام بنا لیا۔خرم ایسے موقعے پر بھلا کیوں پیچھے رہتا۔وہ تو ہمیشہ ہی سے شبانہ کے شوہر سے ملاقات کا متمنی تھا اور ایسا چانس مس نہیں کر سکتا تھا۔سرمزمل نے بھی جانے کی خواہش ظاہر کر دی اور یہ چھوٹا سا قافلہ شبانہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا ہو گیا۔

''ہمیں ویسے ان کو ایک فون کر کے آنے کی اطلاع دینی چاہیے تھی۔اس طرح اچانک چلے جانا کیا ٹھیک ہے؟'' خرم نے گاڑی چلاتے ہوئے سب کی رائے جاننی چاہی۔

"یہ سارا قصور ثوبیہ کا ہے۔''زارا جھٹ سے بولی۔''صبح کہا تھا یاد سے شبانہ کو فون کر دینا، اب پوچھا تو محترمہ کو یاد ہی نہیں رہا۔چلو خیر ہے، کوئی بات نہیں۔ہم کون سا اُن کو زحمت دیں گے۔بس پانچ منٹ بیٹھیں گے۔ان کے شوہر کی عیادت کریں گے اور واپس آ جائیں گے۔''سب نے زارا کی ہاں میں ہاں ملائی اور ایڈریس ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک چھوٹے سے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔خرم نے آگے بڑھ کر گھنٹی دبا دی۔تھوڑی دیر تک کوئی جواب موصول نہ ہوا تو دوبارہ گھنٹی بجاتے ہی اندر سے شبانہ کی آواز سنائی دی۔''آ جائیں ڈاکٹر صاحب ! دروازہ کھلا ہے۔''اِن میں سے کوئی بھی ڈاکٹر نہ تھا لیکن شبانہ کی آواز سن کر وہ لوگ خوش ہو گئے کہ ٹھیک گھر میں پہنچے ہیں۔خرم نے زارا کو اشارہ کیا اور زارا اور ثوبیہ اندر داخل ہو گئیں۔خرم اور سرمزمل باہر ہی کھڑے رہے۔زارا اور ثوبیہ جیسے ہی سیدھے ہاتھ کے پہلے کمرے میں داخل ہوئیں، سامنے شبانہ کی نظر اُن پر پڑی اور وہ یکدم ہڑبڑا گئی۔ایک سیکنڈ کے لئے اس کے چہرے پر پریشانی سی چھا گئی جیسے کوئی چور عین چوری کرتے وقت رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ثوبیہ نے شبانہ کو اپنے

آنے کی وجہ بتائی اور اچانک آنے کی معذرت بھی کی۔اتنے میں کسی کے کراہنے کی آواز بلند ہوئی۔ثوبیہ اور زارا نے چونک کر کمرے کے کونے میں پڑی چارپائی کی طرف دیکھا جہاں ایک آٹھ نو سال کا بچہ نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہا تھا۔زارا اور ثوبیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔زارا کپکپاتے ہونٹوں سے بولی''شبانہ.....یہ.....یہ تو.....''

شبانہ کی آنکھیں نم ہو گئیں.....بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔''سمیر ہے.....میرا بیٹا.....''

''لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کے شوہر.....'' ثوبیہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

شبانہ کی آنکھیں جھک گئیں.....''وہ چھ سال پہلے مجھے طلاق دے چکے ہیں۔''

''کیا؟؟؟ "شبانہ اور زارا کی چیخ بلند ہوئی۔''لیکن.....وہ.....وہ سب کیا تھا.....آپ تو کہتی تھیں کہ.....''

"سب غلط کہتی تھی، جھوٹ کہتی تھی۔شبانہ کی آنکھیں چھلک پڑیں.....''مجھے شائد شوہر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اِس دُنیا کو ہے۔اکیلی عورت کا سنتے ہی ہوس میں لپٹی ہمدردیاں بانٹنے چلے آتے ہیں۔یہاں سب کو پتا ہے کہ میرے شوہر کراچی میں جاب کرتے ہیں۔شاید اسی لئے کسی حد تک زمانے نے مجھے قبول کیا ہوا ہے۔''بات ختم کرتے ہی شبانہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔زارا اور ثوبیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔زارا کو پتا نہیں کیا سوجھا۔تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔باہر خرم اور سرمزمل اندر آنے کی اجازت ملنے کے منتظر کھڑے تھے۔زارا کو دیکھتے ہی دونوں چونک اُٹھے۔زارا نے کسی کے بولنے سے پہلے ہی پراعتماد لہجے میں کہا.....''خرم ! آپ لوگ جا کر ڈاکٹر کو لے آئیں اور اندر نہ آیئے گا۔شبانہ کے شوہر ذرا مذہبی قسم کے انسان ہیں۔شاید اُنہیں آپ لوگوں کا اندر آنا اچھا نہ لگے۔'' اور آنکھوں کی نمی چھپاتی ہوئی تیزی سے اندر کی طرف لوٹ گئی.....!!!

◀◀ ● ▶▶

▶ Spring Field ,Virginia ,U.S.A.

نیاز اختر

کا

اولین افسانوی مجموعہ

بوڑھے برگد کا انت

شائع ہو چکا ہے

صفحات:۱۴۴ قیمت: ۲۰۰ روپے

رابطہ:306ڈی۔خان کمپلکس، آزادنگر، مانگو، جمشید پور (جھارکھنڈ)

● منیر احمد فردوس

خوابوں سے ڈرا ہوا آدمی

وہ زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا تھا، جتنا کہ اب تھا اور اس پریشانی کے باعث وہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنے آپ میں ہی کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کیا جائے اور کس سے بات کی جائے؟ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ اپنی بیوی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرے جو پہلے بھی ایک دو بار اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے اس سے پوچھ چکی تھی مگر پھر اس نے سوچا کہ بیوی کو خواہ مخواہ پریشان کرنا مناسب نہیں جو پہلے ہی گھر کے بکھیڑوں میں الجھی رہتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر کار اس نے اپنے ایک دوست سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور کوئی اچھا مشورہ دے گا۔ جب اس نے دوست سے بات کی تو وہ بھی فکر میں پڑ گیا۔ ''یار! میں تو کہتا ہوں، تمہارا معاملہ ایسا ہے کہ تم کسی مولانا سے ہی بات کرو۔'' دوست نے اسے تجویز دیتے ہوئے کہا۔ اور یہ بات اس کے دل کو لگی۔ ساتھ والے محلے میں نماز ادا کرنا اس کا معمول تھا۔ اس نے سوچا کہ وہاں کے مولانا صاحب سے ہی بات کرنی چاہئے، جو اکثر شرعی مسئلے بھی بتاتا رہتا تھا۔ ایک روز وہ نماز کے بعد اس سے ملا۔

''مولانا صاحب! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''میں سن رہا ہوں برخوردار، بولو کیا بات ہے؟''

''مولانا صاحب! میں کافی عرصے سے بہت پریشان ہوں۔ دو خوابوں میں بری طرح سے پھنسا ہوا ہوں اور میری ذہنی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔'' اس نے بہت ہی شکستہ لہجے میں کہا۔

''اللہ جلا شانہ خیر کرے گا برخوردار۔ تم مجھے خواب سناؤ۔'' مولانا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جی! میں آپ کو اپنا پہلا خواب سناتا ہوں جو میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ایک مذہبی جلوس ہے جو شہر کے مختلف حصوں سے گزر رہا ہے۔ جلوس میں نعرے ہیں، جوش ہے، غم ہے، واویلا ہے۔ چاروں طرف خون ہی خون ہے جو لوگوں کے جسموں سے بہہ رہا ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں موجود ہوتا ہوں جو خود بھی گلے پھاڑ پھاڑ نعرے لگا رہے ہیں۔ ہر طرف غمزدہ چہرے ہیں اور ماحول سوگوار ہے۔ یہاں تک کہ چھتوں پر بیٹھی عورتیں بھی بین کر رہی ہیں۔ بازار کے دونوں طرف کافی لوگ جلوس دیکھنے میں محو ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں۔ جلوس دیکھتے دیکھتے اچانک منظر بدل جاتا ہے اور میں خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پاتا ہوں۔ کچھ لوگ ہیں جو بپھرے ہوئے مجھے

مارنے کی غرض سے ہاتھوں میں خون آلود تلواریں اور برچھیاں اٹھائے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے شدید خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ میں وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں مگر ہر طرف سے راستے بند ہوتے ہیں اور میں بری طرح سے پھنس جاتا ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لئے میں اپنے دوستوں کو تلاش کرتا ہوں مگر اس وقت وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتے۔ میں پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں لیکن بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اتنی دیر میں وہ لوگ غضبناک ہو کر میرے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ بس وہ مجھے پکڑنے ہی لگتے ہیں کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میرا جسم کانپ رہا ہوتا ہے۔ خوف کے مارے مجھے پھر نیند نہیں آتی۔'' اس نے خواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے اور لہجے سے پریشانی واضح طور پر جھلک رہی تھی۔ وہ مولانا صاحب کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، جہاں گہری سنجیدگی چھا چکی تھی۔ لگتا تھا کہ خواب سن کر وہ بھی فکر میں پڑ گئے تھے۔ وہ انتظار میں تھا کہ دیکھو مولانا صاحب کیا تعبیر بتاتے ہیں۔ اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے مولانا نے کہا۔ ''برخوردار! اللہ جلا شانہ رحم فرمائے، تمہارا یہ خواب مبارک نہیں لگ رہا۔'' وہ مولانا صاحب کی بات سن کر سراسیمہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد مولانا اس پر نظریں گاڑتے ہوئے پھر گویا ہوئے۔ ''میں اس کی تعبیر بتاتا ہوں مگر بہتر ہوگا کہ تم دوسرا خواب بھی سنا دو۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے مولانا صاحب، میں سناتا ہوں۔ یہ دوسرا خواب مجھے تقریباً ایک سال سے مسلسل آ رہا ہے۔ خواب میں، میں دیکھتا ہوں کہ میرے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے، جس میں پوری دنیا ڈوب رہی ہے۔ دور سے آسمان جتنی بڑی بڑی لہریں میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہر طرف لوگوں کی چیخ و پکار ہوتی ہے اور نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے۔ قیامت آ گئی، قیامت آ گئی کی آوازیں بھی آ رہی ہوتی ہیں۔ میرے آس پاس کے سبھی لوگ چیختے چلاتے پانی میں ڈوب رہے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں پانی میں تیرتی پھر رہی ہیں۔ میں شدید ڈر جاتا ہوں۔ چاروں طرف کہیں بھی خشکی نہیں ہوتی سوائے اس جگہ کے، جہاں میں کھڑا ہوتا ہوں مگر میرے ذہن میں یہ خوف ہوتا ہے کہ دور سے تیزی کے ساتھ آتی ہوئی لہریں مجھے بس ابھی اپنے ساتھ بہا کر لے جائیں گی۔ ڈر کے مارے میں چھپنے کے لئے ادھر ادھر دیکھتا ہوں مگر ہر طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ ڈوبنے کے خوف سے میں تھر تھر کانپنے لگتا ہوں۔ جب پانی کی لہریں بالکل میرے سر پر پہنچ جاتی ہیں تو اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ دہشت کے مارے میں پسینے میں نہایا ہوتا ہوں۔ مولانا صاحب! اب آپ ہی کچھ بتائیں کہ اس طرح کے الجھے ہوئے خواب مجھے بار بار کیوں آتے ہیں؟'' اس نے دوسرا خواب سناتے ہوئے پوچھا۔ مولانا صاحب پہلے تو ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے کچھ ورد کرتے رہے اور پھر ہاتھوں پر دم کر کے اپنے پورے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو برخوردار! اللہ جلا شانہ معاف کرے۔ ایک بات تو واضح ہے کہ تمہارے دونوں خواب اچھے نہیں ہیں۔ مگر ایک لحاظ سے تم بہت خوش نصیب بھی ہو کہ اللہ پاک کی طرف سے خوابوں کے ذریعے تمہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ سنبھل جاؤ۔'' مولانا نے اپنی گھنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تنبیہہ کی جا رہی ہے؟ میں کچھ سمجھا نہیں مولانا صاحب۔'' اس نے الجھے ہوئے حیران کن لہجے میں کہا۔ ''برخوردار! گھبراؤ مت، ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم ساتھ والی کالونی میں رہتے ہو نا؟'' مولانا نے پوچھا۔ ''جی جی، میں ساتھ والی کالونی میں ہی رہتا ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس پھر تو بات واضح ہو گئی اور تم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اس کالونی میں کون لوگ رہتے ہیں؟ مگر کسی بات کا جاننا اور سمجھنا الگ الگ امر ہوتا ہے۔ اور بدقسمتی سے تم

صرف جانتے ہو، سمجھتے نہیں کہ ان لوگوں کی حقیقت کیا ہے؟ اب ظاہر سی بات ہے کہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ یقیناً تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہوگا اور شاید تم ان کی محفلوں میں بھی آتے جاتے ہوگے، کیا ایسا ہوتا ہے؟'' مولانا نے اس سے پوچھا۔ ''جی ہاں مولانا صاحب، ایک ہی محلّہ ہے۔ میں پیدا بھی وہیں پر ہوا اور پلا بڑا بھی وہیں پر ہوں۔ تو پھر ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ بلکہ میری تو ان کے ساتھ گہری دوستیاں بھی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تو برخوردار! کیا پھر بھی تمہیں ان خوفناک خوابوں کی سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ بار بار تمہیں کیوں آ رہے ہیں؟ اللہ جلا شانہ کی اپنے ساتھ محبت کا عالم تو دیکھو سبحان اللہ، کہ وہ خوابوں کے ذریعے سے اتنے واضح طور پر تمہیں بار بار خبردار کر رہے ہیں کہ اے غافل انسان سنبھل جاؤ مگر ہائے ... ہائے... یہ نادان انسان اللہ کی محبت کو سمجھتا ہی نہیں۔ جس طرح سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ برخوردار! تمہیں اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے۔ تم بہت خوش نصیب ہو اور مجھے تم پر رشک آ رہا ہے کہ خوابوں کے ذریعے سے تمہیں بار بار یہی تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تمہارا ایمان چاروں طرف سے شدید خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ اللہ جلا شانہ کی اس لازوال محبت کو سمجھو اور اپنے ایمان کی حفاظت کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ غیر لوگوں کے ساتھ رہ رہ کر کہیں تم اپنے ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔'' مولانا نے بڑے اعتماد کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ مگر اس ٹھہرے ہوئے لہجے نے اس کے اندر بھونچال پیدا کر دیا اور وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے خوابوں کی تعبیر ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو اپنی پریشانی مٹانے آیا تھا مگر اس کی پریشانی دوچند ہو گئی تھی۔ مولانا کی باتیں تو جیسے اس کے دماغ میں سما گئی تھیں۔ کئی دنوں تک وہ ان باتوں میں بری طرح سے الجھا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ اس دوران اسے پھر سے خواب آیا تو وہ اور بھی ڈر گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اگر مولانا صاحب کی باتیں سچ ہو گئیں تو....؟ اس کے آگے وہ نہ سوچ سکا اور لرز اٹھا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جو اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اب وہ مسجد میں مولانا صاحب کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ جوں جوں وہ اس کی محفل میں آنے جانے لگا، اسے مولانا کی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔ اسی لئے اس کا زیادہ تر وقت اس کے ساتھ ہی گزرنے لگا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ مولانا صاحب ایک اہلِ علم آدمی ہیں۔ اب وہ مختلف قسم کی مذہبی کتابیں بھی پڑھنے لگا اور ایسی ایسی باتیں جاننے لگا جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ اس کے پاس مذہبی علم بہت کم ہے۔ وہ جوں جوں کتابیں پڑھ رہا تھا، اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ حقیقت میں وہ دھیرے دھیرے بدل رہا تھا اور خود کو آس پاس سے آہستہ آہستہ سمیٹ کر محدود کرنے میں لگا ہوا تھا۔ مگر یہ اتنا بڑا ابدلاؤ تھا کہ اس کے علاقے کے لوگوں اور خاص طور سے اس کے دوستوں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ وہ علاقے کے لوگوں کے ساتھ اب بہت کم بولتا تھا، بلکہ اس کی کوشش ہوتی کہ ان سے بات کرنا ہی نہ پڑے۔ اس کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرنے لگا، اس کے اندر ایسی انقلابی تبدیلی آ چکی تھی کہ اس نے داڑھی رکھ کے ظاہر خدوخال یکسر بدل لئے تھے۔ اس نے خود کو اپنے اندر قید کر کے بچپن کی پالی ہوئی محلے کی ساری دوستیاں ختم کر کے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی ترک کر دیا۔ شروع شروع میں تو دوست اس کے دروازے پر آ کر اسے بلا لیا کرتے مگر آہستہ آہستہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ اور یہ بات اس کے دوستوں نے بھی جانچ لی تھی، اس لئے انہوں نے بھی اب آنا جانا ختم کر دیا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اڑوس پڑوس میں جانے سے منع کر دیا۔ یہاں تک کہ قریبی پڑوسیوں کے گھر سے اپنے بچوں کو ٹیوشن

سے بھی روک دیا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ اس سارے بدلاؤ کے بعد حیرت انگیز طور پر ان خوابوں سے اس کی جان چھوٹ گئی جنہوں نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس بات سے اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا کہ اس نے صحیح راستہ پا لیا ہے۔ وہ اکثر اوقات مولانا صاحب کا شکریہ ادا کیا کرتا کہ اس کی دوستی اور صحبت نے اسے گمراہ ہونے سے بچا لیا۔ اب وہ رات بھر مزے کی نیند سوتا اور ہر طرح کی فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔ مگر ایک رات تین بجے کا عمل تھا کہ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ خوف کے مارے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور وہ بری طرح سے سہما ہوا تھا۔ اس نے خواب میں پھر دیکھا کہ پوری دنیا پانی میں ڈوب رہی ہے اور وہ خود بھی ان طوفانی لہروں کی نذر ہونے والا ہے۔ وہ صبح تک اسی خواب میں الجھا رہا۔ صبح اٹھ کر وہ دفتر چلا گیا اور اس نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر اسی خواب نے اس کی نیندیں اڑا دیں۔ وہ ایک بار پھر پریشان ہو گیا کہ اب کیا ماجرا ہے؟ اس نے تو اپنے راستے بھی بدل لئے تھے۔ جب یہی خواب اسے مسلسل تنگ کرنے لگا تو اس نے پھر سے مولانا صاحب سے بات کی۔ ''رفیق میاں! گھبراؤ مت، اللہ جلا شانہ کو تم سے بہت محبت ہے اور اس کی طرف سے اس محبت بھرے اشارے کو سمجھو گے تو دل کا سارا بوجھ اتر جائے گا اور تمہاری یہ پریشانی ختم ہو جائے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اللہ کے حکم سے وہ تمام غلط دوستیاں ختم کر دی ہیں جن سے تمہارے ایمان کو شدید خطرہ تھا مگر پھر بھی تم رہتے تو ان ہی کے درمیان میں ہو نا؟ اور یہ تو ایک کھلی سچائی ہے کہ انسان جہاں رہتا ہے وہاں کے اثرات سے کسی طور نہیں بچ سکتا۔ رفیق میاں! بات یہ ہے کہ ہجرت کرنا ہمارے مذہب میں بہت بابرکت عمل ہے اور یہ ہمارے پیارے نبی پاک ﷺ کی سنت بھی ہے۔ اور اللہ جلا شانہ ایمان والوں سے ہمیشہ یہی چاہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ تم بھی اللہ پاک کے اس حکم کو پورا کرو اور اپنا مکان بیچ کر وہاں سے ہجرت کر کے ہمیشہ کے لئے ان غیر لوگوں سے دور ہو جاؤ۔'' مولانا نے اسے مدلل انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ لوہا پہلے ہی گرم تھا اس لئے بات سیدھی اس کے دل میں جا اتری۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے اپنے آباواجداد کا برسوں پرانا وہ مکان اونے پونے داموں بیچ ڈالا جسے اس کے پرکھوں نے بڑی محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ تعمیر کیا تھا اور جس کے کونے کونے میں بکھری محبت بھری چھاؤں میں وہ پل کر بڑا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے گھر والے اس بات سے بالکل بھی خوش نہیں تھے اور وہ اسے روکتے رہ گئے کہ مکان مت بیچو مگر اس نے کسی کی بھی نہیں سنی۔ اس کے لئے اپنا ایمان بچانا سب سے زیادہ اہم تھا اور وہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھا۔ اس نے نیا مکان ساتھ والے اسی محلے میں ہی لیا تھا جہاں وہ نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ مکان کی چابی ملنے کے بعد اس نے ایک ہفتے میں ہی اپنی شفٹنگ مکمل کر لی اور آج اس نئے گھر میں اس کی پہلی رات تھی۔ سارے دن کی تھکن اس کے جسم میں رچی ہوئی تھی۔ جلد ہی نیند نے اسے آ لیا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر سویا تھا کہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا اور اس کا پورا بدن خوف سے کانپ رہا تھا۔ خواب میں اس نے پھر سے اپنے آپ کو جلوس میں گھرے ہوئے پایا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Noble Town, near Jaamia Eid Gaah Kalaan,
District Dera Ismail Khan, KPK, Pakistan.

● نعیم بیگ

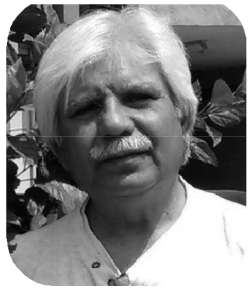

یوڈیم سالا

پام ڈیرہ بیچ کورنش پر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔نوجوان لڑکیاں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم کورنش کی دیوار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھا۔سورج دور سمندر کے اس پار ٹھہرے ہوئے پانی کے اندر آہستہ آہستہ آسمان کی وسعتوں پر نارنجی رنگ بکھیرتا ہوا غروب ہو رہا تھا۔چھوٹے چھوٹے بادل ٹکڑیوں کی صورت میں قطار در قطار تیرتے ہوئے مشرق کی جانب سفر کر رہے تھے۔کورنش کی تین فٹ اونچی اور کافی چوڑی دیوار پر بیٹھا ایک نوجوان اپنے سامنے اخبار کے چند صفحات پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھا۔پچھلے دو دن سے تو میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا معمول تھا وہ شام ہونے سے پہلے اخبارات کا ایک پلندہ اٹھائے کورنش پر آ جاتا۔ پہلے وہ چند منٹ آہستہ آہستہ واک کرتا پھر برسک واک کرتے ہوئے کورنش کے دونوں طرف گھوم کر اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا اور اخبار کا مطالعہ کرتا۔بظاہر شکل سے وہ انڈین لگتا تھا۔

پام ڈیرہ بیچ دبئی کے مشہور تجارتی علاقے ڈیرہ میں ہے۔ایک طرف آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بلند و بالا عمارتیں جن میں سب سے بڑی عمارت حیات ریجنسی نامی مشہور ہوٹل ہے۔دوسری طرف سامنے نائف کا بازار اور تجارتی مرکز۔لہذا بیچ کورنش پر شام ہوتے ہی سینکڑوں رہائشی اور نوجوان سیاح آ جاتے۔دوپہر کو البتہ گرمی ہونے کی وجہ سے یہ جگہ تقریباً سنسان ہی رہتی۔آج جب میں نے اس نوجوان کو دوبارہ دیکھا تو میرے اندر تجسس نے انگڑائی لی اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔''آپ کے پاس ماچس ہوگی۔'' میں ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور انکار کرتے ہوئے سر ہلا دیا اور دوبارہ اخبار میں منہمک ہو گیا۔میرا تجسس اور بڑھ گیا اور میں اچھل کر اس کے پاس ہی دیوار پر بیٹھ گیا۔میں ابھی اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ کس طرح اس سے بات کی جائے کہ واک کرتے ہوئے قدرے ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے اسے چلتے چلتے مخاطب کیا۔"ہیلو اشوک۔"نوجوان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جواباً ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"سی یو ٹو مارو۔"یہ کہتا ہوا وہ شخص آگے نکل گیا۔

ہوں تو میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔لڑکا انڈین نکلا۔میں نے دل میں سوچا۔

یوں تو دبئی جیسے شہر میں ذات پات، برادری، رنگ و نسل، مذہب اور کسی بھی ملک کا شہری ہونا کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے۔یہاں صرف دو طبقات ہیں۔ملکی اور غیر ملکی یعنی تارکین وطن۔ملکی مالک و آقا ہیں اور تارکین وطن چاہے کسی بھی ملک سے ہوں ورکر ہیں۔یہ سوچ کر اشوک مجھے کچھ اپنا اپنا سا لگا اور میں نے اپنی ہچکچاہٹ دور کرتے

ہوئے خود ہی اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔''اچھا تو تمہارا نام اشوک ہے۔کہاں کے رہنے والے ہو؟''اشوک نے میری طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ میں بات کرنے کے لئے ابتدا کر رہا ہوں لہذا اس نے اخبار ایک طرف کھسکایا اور انگریزی میں بولا۔''یس۔آئی ایم اشوک، اشوک شری واستری پٹیل اینڈ آئی ایم فرام گجرات انڈیا۔''اعتماد اس کے لہجے میں نمایاں تھا۔

''آئی ایم سوری بٹ مجھ کو اردو نہیں آتا۔ڈو یو سپیک انگلش؟''اس نے مجھ سے پوچھا۔سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں تھوڑی بہت انگریزی تو سبھی بول لیتے ہیں حالانکہ مجھ جیسے گریجویٹ کو تو انگریزی فر فر آنی چاہئے لیکن ہمارے ہاں ایسا ماحول نہیں ہے۔لہذا میں بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہی بول سکتا ہوں۔چونکہ مجھے بات کرنی تھی لہذا میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کا ہی سہارا لیا۔

''یس آئی سپیک انگلش بٹ ویری لٹل۔''اشوک میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔''نو پرابلم، چلے گا۔''تم کدھر کا ہے؟''''میں پاکستان سے ہوں۔''میرا لہجہ قدرے مایوسانا سا تھا۔''وچ سٹی؟''''کالا پل کلوز ٹو لاہور۔''''اوہ! یو فرام پنجاب؟ آئی لو پنجاب!''''یس، یس" میں نے فوراً اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔یہ سنتے ہی اشوک نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف مصافحہ کے لئے بڑھایا اور بولا۔''ویری نائس ٹو سی مائی فرینڈ.....''اسے میرا نام جاننے کے لئے خاموش ہونا پڑا۔''میرا نام؟ اوہ سوری مائی نیم از منظور علی۔''اور میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔میں نے اس کے مصافحہ میں گرم جوشی کا ایک طوفان سا محسوس کیا اور سچ پوچھئے تو میرے اندر بھی کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔میں کافی دنوں سے دبئی میں رہ رہا تھا لیکن کسی اچھے انسان کی دوستی سے محروم تھا۔پچھلے چند دنوں سے نوکری کی تلاش نے مجھے تقریباً ادھ موا ہی کر دیا تھا لیکن میں بھی ہمت ہارنے والے انسانوں میں سے نہ تھا لہذا کوشش جاری تھی۔اور یہ بات الگ تھی کہ نوکری کی امید اب دن بدن مدھم ہوتی جا رہی تھی۔''تم کیا کرتا ہے۔''اشوک کے سوال پر میں خیالوں سے نکل آیا۔میں نے ایک سگریٹ نکالی اور ماچس کے لئے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔''بھائی صاحب! ماچس ہوگی۔''میں نے گزرتے ہوئے ایک شخص کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا۔وہ شخص رکا اور مجھے سلگانے کے لئے اپنی سگریٹ پیش کر دی۔میں نے اپنی سگریٹ سلگائی۔اسے شکریہ کہا اور دوبارہ اشوک کی طرف متوجہ ہو گیا۔''ابھی تک کچھ نہیں۔''میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''اوہ، ویری بیڈ بٹ نو پرابلم۔دونوں ایک ساتھ ڈھونڈے گا۔''تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اخبار کا مطالعہ اتنی باقاعدگی سے کیوں کرتا ہے۔''اپنا سٹوری بولو؟''لمحے بھر کے لئے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے پھر ایک جھماکہ سا ہوا۔''میری سٹوری کچھ خاص نہیں۔لاہور کے قریب کالا پل ہمارا گاؤں ہے۔ماں باپ دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ماں بیمار رہتی ہے۔ایک بہن اور چھوٹا بھائی۔میں سب سے بڑا ہوں۔شروع میں باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کی پھر منڈی کا کام کیا۔پھر لاہور سے گریجوئشن کی اور دو سال نوکری ڈھونڈتا رہا۔گزارہ تو چلتا تھا لیکن مستقبل نہ تھا۔ایک دوست کے مشورے پر یہاں چلا آیا۔باپ نے بیل کی جوڑی بیچ دی اور پیسے دیئے۔اب سوچتا ہوں کہ اگر یہاں معاملہ نہ بنا تو آگے کیا ہوگا۔بس اپنی تو یہی کہانی ہے۔فصل کی بوائی کے دن آنے والے ہیں۔بیل نہ ہوئے تو ابا کھیت کیسے بوئیں گے فی الحال تو یہی فکر ہے۔''

''سیم ڈیم سٹوری!'' اشوک نے قدرے منہ بنا کر کہا۔

''تم بولو۔تمہاری کیا کہانی ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"سورت معلوم ہے؟'' ''سورت؟'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔

اوکے، آئی ٹیل یو۔گجرات میں سورت کے نام کا ایک بڑا شہر ہے۔احمد آباد کے قریب ہے۔زیادہ تر کاروباری لوگ رہتے ہیں۔ہم لوگ بھی ادھر رہتا ہے۔مائی فادر ٹیلر ماسٹر ہے اینڈ آئی ہیٹ دس جاب۔آئی ٹولڈ مائی فادر دیٹ آئی ول ناٹ ورک ایز ٹیلر ماسٹر۔آئی ڈِڈ مائی ماسٹرز فرام احمد آباد۔بٹ یونو اِن انڈیا نو جاب اٹ آل۔پھر مدر بولا۔آئی گو یو مائی جیولری۔یو گو ٹو دبئی۔پھر ہم یہاں آ گیا۔یہ سیکنڈ منتھ ہے، سٹل نو جاب۔'' ''تو پھر اب گزارہ کیسے کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔''ایک دوست کو بیڈ سپیس کا پیسہ دیا فار ٹو منتھ۔ادھر رہتا ہے۔''

''شام کو ایک ہوٹل والے سے بات کیا ہے۔ادھر نائٹ میں اب رات کو دس بجے جائے گا اس کے ہوٹل کا سارا برتن دھوئے گا پھر وہ رات کا کھانا دے گا اور صبح کا ناشتہ۔بس اب تو ایسے ہی گزارہ کرنا ہے۔''

''تو سارا دن کیا کرتے ہو۔'' میں نے رنجیدگی سے پوچھا۔''بس جاب کا تلاش۔کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔شام کو کورنش پر آ جاتا ہے۔گلف نیوز میں جاب تلاش کرتا ہے اور اپنا بھوک اور پیاس کو رات تک روک کر رکھتا ہے۔''

''بس اب ٹائیم ہونے والا ہے۔کچھ دیر میں جائے گا کام کرے گا اور کھانا کھائے گا۔''

''میں نے کچھ دیر سوچتے ہوئے اس سے کہا۔''کیا میں بھی تمارے ساتھ چل سکتا ہوں۔آئی وِل شیر یور ورک۔''

اشوک نے کچھ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔''یو۔ڈیم سالا! کل رات سے بھوکا پیاسا ہے اور بولتا نہیں ہے۔'' اور آگے بڑھ کر اس نے مجھے گلے لگا لیا۔

ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

8-Nayab Homes, Near NETSOL,
Airport Road Lahore Cantt. Pakistan.

نوشابہ خاتون

کے دو افسانوی مجموعے

نقار خانہ

اور

بالا دست

شایع ہو چکے ہیں۔

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر

● **فرخ ندیم**

عبدل کی قسمت

''میں نہیں جانتی تھی اس اصطبل کو ریسٹ ہاؤس کہتے ہیں''۔کمشنر ہربرٹ کی سنہرے بالوں والی خوبصورت اور جواں عمر بیوی نے اپنے شوہر کو ٹھنڈے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

''شکر کرو یہ جگہ مرکز سے دور ہے۔اتنی دور جتنی یہ مقامی دنیا تاج محل سے دور ہے۔یہاں بلوائی کم اور سکون زیادہ۔جہاں شورش زیادہ ہو وہاں اچھے سے اچھا گھر بھی قبر لگتا ہے۔'' کمشنر آدھا گلاس پانی پینے کے بعد بولا۔

''تم نے کوشش ہی نہیں کی ہربرٹ ورنہ ہم آسٹریلیا چلے جاتے۔کسی خوبصورت سے جزیرے پر یا.....''

''یا.....؟'' کمشنر نے اپنی بیوی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اور اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''یا کسی ایسی جگہ جہاں پہ ڈر نہ ہو اور مکھیاں نہ ہوں۔رات کو مچھر نہ ہوں.....زندگی ہو رونق ہو''۔

''اگر ہمیں افریقہ بھیج دیا جاتا.....پھر کیا کہتی تم.....؟''

''مَیں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں کمشنر صاحب۔'' کیتھرین واپس گلاس پکڑتے اور اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیتھرین میری ذمہ داریوں اور مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے اس ثقافت سے کس قدر لگاؤ ہے۔مَیں چاہتا ہوں ہر اچھے بُرے تجربے کو قلمبند کروں اور لندن سے یہ چھپواؤں تاکہ ہمارے تاجر، آفیسرز اور دوسرے سرکاری لوگ یہاں آنے سے پہلے ان لوگوں کے مزاج، رسوم و روایات، سیاست اور موسمی سختیوں سے آگاہ ہو جائیں۔''

''تمہاری دلچسپیاں اپنی جگہ۔تم تو آفیسر ہو، منصف ہو، سیاست دان ہو، جنگجو ہو اور مصنف ہو۔مَیں اور میرے جیسی کئی انگریز عورتیں ہیں جو اپنے شوہروں کے ساتھ اس لئے آتی ہیں کیونکہ وہ ان کے شوہر ہیں۔''

''اچھا ایسی بات ہے تو چلو ایک کام کرتے ہیں۔عبدل کو آنے دو۔تم تیار ہو جاؤ چلتے ہیں شام کو اس علاقے کا مطالعاتی دورہ کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر کمشنر نے اپنی فائلیں کھولیں اور نقشوں پہ جھک گیا۔

ابھی کیتھرین تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ایک محافظ نے اطلاع دی کہ دروازے پہ عبدل پہنچ چکا ہے۔

''کیا تم عبدل ہو؟'' کمشنر نے اپنا قلم میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں صاحب۔مَیں عبدل ہی ہوں۔سامان آ گیا ہے راشن بھی۔''عبدل اِدھر اُدھر دیکھتے اور اپنے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے سب کچھ سٹور میں رکھوا دو۔گاڑی بانوں کو مناسب ادائیگی کر دو۔کچھ کھاؤ پیو اور ہاں تمہاری مالکن تمہارے علاقے کی سیر کرنا چاہتی ہیں۔آس پاس کے جتنے بھی دیہات ہیں ہمیں دکھاؤ۔ان دیہاتوں کے زمینداروں اور نمبرداروں کو میرا پیغام پہنچا دو کہ اپنے اپنے دیہات سے اگر غائب پائے گئے یا کہیں بھی کوئی گڑ بڑ پائی گئی تو یہی لوگ ذمہ دار ٹھہرائیں جائیں گے۔''

''ابھی گیا صاحب۔آپ فکر نہ کریں۔سب کو اطلاع ہو جائے گی۔''عبدل باورچی خانے سے اپنی روٹیاں اور سالن نکالتے اور فرش پہ بیٹھ کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

''جلدی کھاؤ.....ہاں.....برتن گھر واپس آ کے صاف کر لینا۔''اس کی مالکن نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عبدل ہر فقرے کو جی ہاں جی ہاں کہہ کر مکمل کرتا رہا۔حالات ہی ایسے تھے کہ نہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔جب سے یہ نوکری ملی تھی عبدل کی چال ڈھال بول چال میں تبدیلی آ رہی تھی۔گھریلو ملازم ہونے کی وجہ سے وہ کمشنر کی فیملی سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ان کی عادات واطوار سے متاثر بھی بہت تھا۔کمروں کی صفائی کے دوران انگریزی بولنے کی مشق کرتا اور ہیٹ پہنتا تو عجیب سی کیفیت سے گزرتا۔آدھا تیتر آدھا بٹیر.....دکھ میں خوشی اور خوشی میں دکھ۔کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے کوئی انوکھا سانپ ہو جو روزانہ کئی بار اپنی سر کنج بدلتا ہے۔نہیں وہ سانپ نہیں وہ تو زیبرا ہے کیونکہ اس کی میم اکثر اسے جوان زیبرا کہہ کر پکارتی۔

''تم تیار ہو ینگ زیبرا؟''

''جی جی.....ہاں ہاں.....میں تیار ہوں''اس نے برتن سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔''

ہر طرف لہلہاتے کھیت ننگی ننگی ہوا، ہوا میں اُڈاریاں مارتے رنگ برنگے پرندے۔پکی ہوئی فصلوں کی خوشبو،ندیوں نالوں سے پانی نکالنے والے رہٹ۔کہیں پودینے کی خوشبو اور کہیں سونف کی۔کہیں سبزیاں کہیں پھل۔میم صاحبہ نے کئی بار گھوڑے سے اُتر کر فصلوں میں گھومنے پھرنے کی خواہش کی مگر کمشنر صاحب کے منع کرنے پر اپنا ارادہ ترک کر دیتی۔حالات ٹھیک نہیں ہیں.....دوست دشمن واضح نہیں ہیں۔سب کچھ ٹھیک ہونے میں وقت لگتا ہے۔

''میرا جی چاہتا ہے کہ میرا ایک گھر ادھر ہو.....میرا اپنا.....''کیتھرین درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے بولی۔

''کیتھرین تم تاجِ برطانیہ کے ایک طاقتور کمشنر کی بیوی ہو۔یہ سب کچھ تمہارا ہے۔''

''عورت کی اصل سلطنت اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔کمشنر ان سرسبز وشاداب کھیتوں کے درمیان مجھے ایک گھر چاہئے۔ایک خوبصورت بنگلہ۔''

کمشنر اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ کر بولا۔''فکر نہ کرو تمہارا اپنا موجودہ بنگلہ اتنا خوبصورت بن جائے گا کہ تم اپنا

لندن والا گھر بھول جاؤ گی۔رہی بات فصلوں،سبزیوں،پھلوں اور میوہ جات کی تو تمہارا حصہ تمہیں پہنچ جاتا ہے۔وہ سامنے دیکھو سینکڑوں کی تعداد میں مرد اور عورتیں تمہارے استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔''

''بہت خوبصورت لمحات ہیں میری زندگی کے۔مجھے ان کو اس طرح دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرت ہو رہی ہے۔ایسا تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔''پھر وہ عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کیا نام ہے اس گاؤں کا عبدل؟''

عبدل ہری شاخ ہاتھ میں لئے دس گھوڑوں کے آگے آگے پیدل چل رہا تھا۔دو گھوڑوں پر میم اور صاحب اور اُن کے پیچھے اُن کے محافظ سپاہی۔عبدل اس علاقے کا باسی ہونے کے ناتے سبھی راستوں اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے واقف تھا۔آس پاس کے سبھی قصبوں،دیہاتوں اور ان میں بسنے والی ذاتوں برادریوں کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔اپنے مالکوں کی خواہش پر لوگوں کو جاننے پہچاننے کی رفتار تیز کر چکا تھا۔جونہی میم نے سامنے والے گاؤں کا نام پوچھا تو جھٹ سے عبدل نے جواب دیا۔

''ملہہ ہے اس کا نام،جاٹوں کا گاؤں ہے۔جاٹ مسلمان بھی ہیں اور سکھ بھی''

گاؤں کے قریب پہنچے تو عبدل کی میم نے دیہاتیوں سے ہاتھ ملانے کی خواہش کا اظہار کیا۔کمشنر نے گاؤں کی چھتوں اُس کے آس پاس کے کھیتوں اور لوگوں کے ہاتھوں کا بغور جائزہ لیا اور جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں تو اُس نے عبدل سے کہا کہ وہ لوگوں کو اونچی آواز میں خبردار کر دے کہ کسی بھی قسم کی گڑ بڑ کا مطلب ہے گولی۔حکم کی تعمیل میں عبدل نے مٹی کے ایک ڈھیر کا انتخاب کیا۔اس کا قد چھوٹا تھا اس لیے ایڑھیاں اُٹھا اُٹھا کر اونچی آواز میں اعلان کرنے لگا۔

''اے گاؤں والو!غور سے سُن لو!ہمارے علاقے کے کمشنر جناب عزت مآب ہربرٹ صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کیتھرین صاحبہ آپ لوگوں سے ملاقات کرنے اور آپ کے دیہاتوں کی سیر کرنے کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔آپ لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ دل و جان سے ان کا سواگت کریں۔میم صاحبہ آپ لوگوں کو ہاتھ ملانے کا شرف بھی بخشیں گی تاکہ انگریز سرکار اور رعایا کے درمیان فاصلے مٹ جائیں۔مگر کسی بھی قسم کی شرارت،گڑ بڑ اور بلوے کو انگریز سرکار کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔جس کی سزا.....تم سب کو معلوم ہے۔اب آپ ایک قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں۔میم صاحبہ باری باری سب سے ہاتھ ملائیں گی۔''

''عبدل!''صاحب نے پیچھے سے آواز دی۔

''جی صاحب''

''اپنا بھاشن مختصر کرو اور کیتھی کے گھوڑے کی رکابیں تھامو۔''جی جی ہاں ہاں کرتا عبدل بھاگ کر میم کے گھوڑے کے پاس گیا اور رکابیں تھامنے لگا۔

''عبدل میرے جوتے پہ ہاتھ رکھنا۔اگر تم نے صحیح طرح رکابوں کو نہ تھاما تو میں گر بھی سکتی ہوں اور ان سب کے سامنے تمہاری پٹائی بھی کر سکتی ہوں۔''

میم کے الفاظ نے عبدل کا سارا بھاشن کرکرا کر دیا۔اگر وہ آس پاس سبھی دیہاتوں کو جانتا تھا تو یہاں کے

لوگ بھی اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ بڑی حویلیوں سے ہوتا ہوا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ خود شناسی کے شوق سے لبریز وہ دوکانوں اور بیٹھکوں میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتا اور اپنی عقل اور چالاکی کے قصے سنانے لگتا۔ کچھ روز پہلے وہ ساتھ والے گاؤں سنکیالی میں شاہوں کی حویلی میں بیٹھا لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ انگریز کو سمجھنا آسان نہیں۔ انگریز کا ذہن ہم سے اتنا ہی دور ہے جتنا یہاں سے لندن ہے۔

''وہ تو ٹھیک ہے عبدل پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ لندن کتنا دور ہے یہاں سے۔'' مہنگے سنگھ نے حقے کا کش لگاتے ہوئے پوچھا۔

''سردار جی آپ بھی کمال کرتے ہو۔ اب میں یہاں بیٹھے بیٹھے کیسے بتاؤں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ بہت دور ہے۔ گھوڑے پر کوئی سودن لگ جائیں گے۔''

موہنے نے حقے کی نلی پر کھردری تلی والا کسانوں سا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''عبدل سنا ہے لاہور میں ابھی تک ہنگامے ہو رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے جب تک تمہارے کچھ لگتے یہ گورے لوگ ادھر ہیں حالات سدھرنے والے نہیں''

''سدھریں گے موہنے جی سدھریں گے۔'' عبدل اتنی آہستہ سے بولا جیسے سرگوشی کر رہا ہو۔ ''بس تم لوگوں کی خاموشی کی ضرورت ہے۔ کیوں قاسم شاہ جی مَیں نے غلط کہا.....؟'' گدی نشین قاسم شاہ جی حالات کی نزاکت سمجھتے تھے اور عبدل کی مجبوری سے بھی واقف تھے۔ چاروں طرف نظر گھما کر بولے۔

''عبدل حالات سدھریں یا نہ سدھریں پر تمہاری چال بہت تیز ہوگئی ہے۔''

''شاہ جی مجبوری ہے۔ انگریز خود بھی بہت تیز چلتا ہے۔ بھاگنا پڑتا ہے اُس کے ساتھ چلنے کے لئے۔ سو جتن کریں تب جا کے کہیں وہ خوش ہوتا ہے۔''

''ہاں گورے کے پاؤں دھونے پڑتے ہیں۔ مالش کرنی پڑتی ہے۔ جوتے دھونے پڑتے ہیں اور اُن کے کتے نہلانے پرتے ہیں۔''

عبدل بالکل بے خبر تھا کہ مکھن سنگھ اس کی پشت پر کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ انگریز سرکار کی نظر میں مکھن سنگھ باغی تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایرا غیرا ہندوستان پر حکومت کرے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ جا وہ جا۔ بندوق اس کی پشت پر ایسے جھول رہی تھی جیسے آزادی کا جھنڈا لہراتا ہے۔ بندوق کو دیکھ کر تو عبدل کی بات پسلیوں میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔

''قسمت ایسے نہیں پھرتی شاہ جی۔ میرے جیسے کتنے لوگ ہیں جو ہر وقت کسی نہ کسی نظرِ کرم کا انتظار کرتے کرتے قبر میں اُتر جاتے ہیں۔ کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ کرنا پڑتا ہے''

اس سے پہلے کہ حویلی میں بیٹھا کوئی شخص کچھ اور بولتا عبدل چپل گھسیٹتا ہوا حویلی سے باہر نکل گیا۔ کمشنر صاحب نے اُسے یقین دہانی کرائی تھی کہ حالات بھی بدلیں گے اور عبدل تمہاری قسمت بھی۔ بس جیسا تمہیں سمجھایا ہے ویسا کرتے جاؤ۔ لوگوں کی باتیں سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے ان کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ایک تو جاہل ہیں اور اوپر سے پاگل۔

سرکار کے حکم کے مطابق اس نے میم کے جوتے اور رکاب کو مضبوطی سے تھاما۔ مگر میم کے ہاتھوں میں ٹومی اپنی مسند چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ قطار میں کھڑے لوگ غور سے دیکھے جا رہے تھے۔ جب میم صاحبہ کو احساس ہوا کہ کتا چھوڑے بغیر اس کا گھوڑے سے نیچے اُترنا ناممکن ہے تو عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''عبدل میرے پاؤں چھوڑو اور ٹومی کو سنبھالو۔''

عبدل کسی بھی قیمت پر رکاب چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ سو اُس نے بائیں طرف کتے کو بغل میں لیا اور دایاں ہاتھ رکاب پر ہی رہنے دیا۔ بڑے اعتماد سے میم نے لہلہاتے کھیتوں کے پار مٹی کے فرش پر قدم رکھے اور عبدل سے ٹومی لے کر لوگوں سے ہاتھ ملانے کے لئے جونہی آگے بڑھی لوگ ایسے پیچھے کی طرف ہٹے جیسے تماشائیوں پہ ریچھ نے حملہ کر دیا ہو۔ ایک دوسرے کے پاؤں کچلنے لگے۔ سٹپٹائی میم کبھی عبدل کی طرف دیکھتی اور کبھی کمشنر ہربرٹ کی طرف۔ کمشنر کے پوچھنے پر کہ بالآخر ماجرا کیا ہے عبدل نے بتایا کہ جب تک میم کے ہاتھوں میں کتا ہے مقامی لوگ ہاتھ نہیں ملائیں گے۔

''تو کیا ہوا تھوڑی دیر کے لئے میں ٹومی عبدل کو تھما سکتی ہوں۔'' میم جھلاہٹ سے بولی۔

کمشنر صاحب صورتِ حال کو بھانپ چکے تھے۔ اُنہوں نے عبدل کو حکم دیا کہ کتا کیتھرین سے لے کر ایک طرف کھڑا رہے۔ سارے لوگوں کے سامنے عبدل کتا اُٹھا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مگر جونہی میم دیہاتی عورتوں سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھی وہ پہلے کی طرح پھر پیچھے کی طرف چھلانگیں مارنے لگیں۔ خفت سے میم کو پسینہ آنے لگا۔

''اب کیا ہوا.....؟'' اس نے کمشنر کی طرف دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''آپ کے ہاتھ پلید ہیں۔'' عبدل کتے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ہمیں واپس جانا ہوگا۔'' کمشنر اپنی بیوی کو سمجھانے لگا۔

''تو کیا میں مقامی لوگوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتی.....

''اس وقت نہیں کیتھی کسی اور دن۔ کتے کو ساتھ لا کر ہم نے غلطی کی۔''

واپسی پہ سبھی چہروں پر خاموشی چھائی رہی۔ ایک ہی گاؤں کے تجربے نے میم اور صاحب کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ عبدل کو کتے کے بچے پر شدید غصہ آیا۔ اُسے اُس نواب پہ بھی غصہ آ رہا تھا جو میم کو یہ سفید لمبے بالوں والا پستہ کتے کا بچہ تحفہ دے گیا تھا۔ صدیوں سے یہ لوگ مغلوں کو خوش کرتے آئے ہیں۔ اور اب انگریزوں سے مال بٹور رہے ہیں۔ کاش انگریز اُس سے پوچھیں کہ کس کو کتنا اور کیسے دینا ہے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ جو بھی معاہدہ ہو اس کے سامنے ہو یا پھر کچھ ایسا ہو کہ ہر چھوٹا بڑا اس کا مطیع ہو جائے۔ ابھی تک زمین کا ایک ٹکڑا بھی اس کے نام نہیں ہوا تھا۔ پسینہ خشک نہیں ہوتا اور مال ہڑپ کرنے والے کوئی اور..... آخر وہ کیا کرے کہ کمشنر اور اس کی بیوی کو اس کے بے پناہ خلوص کا یقین ہو جائے۔

بنگلے پہنچتے ہی کمشنر نے ضروری کاغذات اور زمینوں کی الاٹمنٹ کے بارے میں عبدل کو ہدایات دینی شروع کر دیں۔ نئے سرے سے بنگلے کی تعمیر شروع کرنی تھی۔ مزدوروں اور مستریوں کا انتظام کرنا، اس کے علاوہ ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی عبدل ہی کے ذمے ٹھہرا۔

''مگر ایک کام اور جو اہم بھی ہے'' کمشنر نے عبدل اور میم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''دو دن بعد سہلو والی

شریف کا میلہ ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد عورتیں اور بچے کھیل تماشوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مجھے اس تہوار کی ایک جامع رپورٹ تیار کرنی ہے۔ اس کے لئے مجھے آپ دونوں کی مدد درکار ہے۔'' کیتھرین اپنے شوہر کی آنکھیں پڑھنے لگی اور عبدل جی جی ہاں ہاں سر سر کرنے لگا۔

''کیا میں بھی اس تہوار کو دیکھنے جا سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں کیتھرین۔ اعتماد سازی کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے اور آپ کے گلے شکوے بھی کم ہو جائیں گے اور ہاں عبدل! شام کے وقت میلے میں کبڈی کشتی اور کئی دوسرے مقابلے ہوتے ہیں۔ علاقے کے معززین نے مجھے بھی دعوت دی ہے۔ مگر سرکار چاہتی ہے کہ اس میلے سے ایک اور فائدہ اُٹھایا جائے۔ ان کھلاڑیوں کو انگریز سرکار کی فوج میں بھرتی کرنا ہے۔ دن کے وقت تم اپنی میم کو میلے کی سیر کرانا اور سہ پہر میرے پاس چلے آنا۔ ایک ایک کر کے سبھی کھلاڑیوں کو قائل کرنا ہے کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ہماری سرکار کی خدمت کریں۔''

عبدل ہمیشہ کی طرح جی جی ہاں ہاں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا کہ کئی مقامی اور انگریز افسروں کے ساتھ چلتے پھرتے جب اُسے لوگ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے اور کچھ تو جل کے کوئلہ ہو جائیں گے۔ مقامی لوگ واقعی عبدل کی خدمت پہ حیران تھے۔ دن رات فرنگیوں سے چپکا رہنا کئی لوگوں کو کھٹک رہا تھا۔ مگر عبدل کو کب پرواہ تھی لوگوں کی باتوں کی۔ سو نئے کپڑے اور نئے جوتے پہن کر بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر عبدل اپنی میم کے ساتھ ساتھ سیلو شریف کے میلے میں پہنچ گیا۔ تمبو تانے دکاندار ایک دوسرے سے اونچی آوازیں لگانے میں مصروف تھے۔ بڑی دلچسپی سے میم ان کی آوازیں سنتی اور عبدل ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھاتا جاتا۔ ٹولیوں کی صورت عورتیں مرد ایک خوبصورت فرنگی عورت کو دیکھنے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ کیتھرین سات سمندر پار سیلو شریف کے میلے میں اپنے میم ہونے پر فخر محسوس کر رہی تھی۔ کوئی ویلکم کہتا، کوئی خوش آمدید اور کوئی جی آیاں نوں۔ منچلے نوجوان عبدل پہ فقرے کسنے لگے۔

''عبدل بھائی کیا بات ہے آپ کی.....''

''جے ہو عبدل کی.....''

''قسمت کی دیوی مہربان ہے عبدل بھائی.....''

''خدمت ہو تو ایسی.....''

ایک پھٹے پرانے تمبو کی اوٹ سے کسی نے کچھ ایسا کہا کہ عبدل کے قدم مٹی میں دھنس گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پھر وہی آواز آئی۔ غصے سے بپھرا ہوا عبدل مجمع کو چیرتا ہوا آواز کی سمت تمبو کے پیچھے بھاگا۔ میم کے ٹومی نے بھی بال لہراتے چھلانگ لگائی اور آوؤ آوؤ کرتا ہوا عبدل کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ جب تک محافظ پہنچے عبدل دو لڑکوں سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ وہ کبھی لاتیں چلاتا، کبھی گھونسے اور کبھی ٹکریں۔ بڑی مشکل سے محافظوں نے اس کو کنٹرول کیا۔ غصے سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی دفعہ عبدل نے کچھ ایسے ہاتھ پاؤں چلائے کہ خبر آخری تمبو تک پہنچ گئی۔ ہکا بکا کیتھرین کبھی اس کے سٹپٹائے چہرے کی طرف دیکھتی اور کبھی ہجوم کی طرف۔

''خبردار آئندہ کسی نے میری ہتک کی''۔ یہ عبدل کی کانپتی ہوئی پھٹی ہوئی آواز تھی۔ ''میں کوئی ہما شما نہیں ہوں.....''

میم کا ٹومی بھی کبھی عبدل کی طرف اور کبھی ہجوم کی طرف دیکھ کر آوؤ آوؤ کرتا جا رہا تھا۔ عبدل کی طرح وہ بھی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی بڑی مشکل میں ہو۔ دائرے میں چکر کاٹتے کاٹتے اسے عبدل کی کالی ٹانگ نظر آئی۔ عبدل ان دو لڑکوں کی طرف گھور گھور کے دیکھ رہا تھا جنہوں نے آواز لگائی تھی۔ کیتھرین پلٹ جانے کا سوچ رہی تھی۔ سارا مزہ کافور ہو کے رہ گیا۔ سیکیورٹی کا بھی مسئلہ ہے کہیں سے بھی کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ آس پاس کے لوگ عبدل کی حالت پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ دو تین محافظ پیچھے ہٹو پیچھے ہٹو کہتے ہوئے اندر آئے اور ان دو لڑکوں کو کھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔

''یہ باغیوں کے ساتھی ہیں۔'' عبدل نے پیچھے سے آواز دی۔ لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

عبدل نے پاؤں کو جھٹکا دیا۔ خفت اس کے سر پر منڈلانے لگی کیونکہ ٹومی ٹانگ اُٹھا کر عبدل کی ٹانگ گیلی کر چکا تھا۔ پاس کھڑے لوگ کھی کھی کرنے لگے۔ اس نے جلدی سے کتے کو اُٹھایا اور میم کا منہ تکنے لگا۔

''غصہ تھوک دو عبدل۔'' میم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم واپس چلیں گے۔'' منہ لٹکائے اور کتا اُٹھائے ینگ زیبرا محافظوں کے درمیان اپنی مالکن کے ساتھ چلتا رہا۔ جانتا تھا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہونگے۔ اپنے آپ کو منوانے کے لئے اسے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

رات سے پہلے تک عبدل کمشنر کے پاس اپنی خدمات احسن طریقے سے انجام دیتا رہا۔ اس کے رعب اور دبدبے کا دائرہ اس کی خواہش کے مطابق پھیلتا جا رہا تھا۔ کئی بار اس نے 'سلام عبدل' بھائی' کا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر جواب دیا۔ رشک بھری نظروں سے اس کی برادری کے لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔ ایڑھیاں اُٹھا اُٹھا کر بھی چلاتا کہ اس کا قد بڑا لگے۔ سانسیں بھر بھر کر چھاتی پھیلائی۔ شریکا نبھاتے ہوئے مخالفین کی طرف ہنس ہنس کر دیکھا۔ صاحب کو بھاگ کر پانی پلایا۔ کاغذات کا تھیلا سنبھالا۔ اپنی طرف سے محافظوں کو چوکس رہنے کی ہدایات دیں۔ اور شام سے صاحب کے ساتھ گھر پہنچ کر بھاگ بھاگ کر اپنا کام ختم کرنے لگا۔ مگر اسی رات کچھ ایسا ہوا کہ نہ صرف عبدل کی نوکری ختم ہوتے ہوتے بچی بلکہ اس کی قسمت بھی پھر گئی۔

''عبدل اندر آؤ، میم نے آواز دی تھی۔'' کام ختم کرنے کے بعد وہ دن کے وقت پیش آنے والے واقعات کے بارے سوچنے لگا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتا بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں صاحب اپنے کمرے میں کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔

''یہ دیکھو زیورات۔ بہت خوبصورت ہیں نا! میں نے پچھلے سال شملہ سے خریدے تھے۔ چمکتے ہوئے پتھروں اور چاندی کے زیورات..... تمہاری کوئی محبوبہ یا منگیتر تو ہو گی عبدل.....؟'' میم نے اس کی بے چینی بھانپتے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

عبدل شرماتے ہوئے جی جی کرنے لگا۔ ''سُگاں کتنی خوش ہو گی!''..... آنکھوں میں چمک پھیلنے لگی۔ غصے سے سکڑے ہوئے اعصاب آسودہ ہونے لگے۔ بے چینی بڑھنے لگی..... قسمت کی دیوی مہربان ہو رہی تھی..... وہ تیز تیز ڈگ بھر رہا تھا۔ حالانکہ چار سو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مگر ستاروں بھرا آسمان صاف تھا۔ راستوں کی اونچ نیچ سے بے نیاز وہ خواب

بنتا بنتا سگاں کے محلے پہنچ گیا۔ چاندی کا ہار اور بُندے اس کی جیب میں ہی تھے۔ اپنے یقین کی خاطر کئی بار اس نے اپنی جیب پہ ہاتھ پھیرا۔ بنگلے اور گاؤں کے درمیان فاصلہ اس نے فیصلہ کن انداز میں طے کیا۔ پھر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا چلتا چھپتا چھپاتا وہ سگاں کے گھر کے پاس پہنچ گیا۔ ڈرتھا تو بس محلے کے کتوں کا۔ اسوج کا تک کے دنوں لوگ برآمدوں میں ہی سوتے۔ عبدل اور سگاں موسم کے بدلتے ہی اپنی حکمتِ عملی بدل لیتے۔ ویسے بھی گھر میں دو ہی لوگ تھے سگان اور اس کی بوڑھی اور بیمار ماں۔ ماں سوئی رہتی اور عبدل دیوار پھلانگ کر تنور کے پیچھے سگاں سے گرم گرم ملاقات کر لیتا۔ جونہی عبدل نے مٹی کی دیوار پہ ہاتھ جمائے اسے اپنے پاؤں زمین کی طرف کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ کتا اپنے دانت اس کے جوتے پہ مضبوطی سے گاڑ چکا تھا۔ اس نے پاؤں کو جھٹکا دیا۔ چپل اور لٹکتا ہوا کتا دونوں گر گئے۔ ''ہو چھ ہو چھ'' اس نے ڈرتے ڈرتے کتے کو دھتکارنے کی کوشش کی۔ ایک جانی پہچانی آواز آئی ''آووٗ'' اور ٹومی اُچھل کر اس کی شلوار سے لٹک گیا۔ وسوسے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ منحوس ٹومی کیسے اس کے پیچھے چلا آیا اور اس کو خبر تک نہ ہوئی!۔ بنگلے اور گاؤں کے درمیاں ڈیڑھ دو میل تک اس نے کوئی آواز بھی نہ نکالی۔ اسے اپنی شلوار چررر کرتے پھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زور سے اس نے پاؤں کو جھٹکا دیا۔ شلوار کے پھٹے کپڑے سمیت کتا گلی کی دوسری دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ برآمدے میں دو بستروں میں سے ایک میں حرکت ہونے لگی۔ ''ہو چھ ہو چھ'' اس نے پھر دبی آواز میں کتے کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔

''کون ہے.....؟'' برآمدے سے سگاں کی ماں کی خوف زدہ آواز آئی۔

عبدل کا سر دیوار کے اوپر اور دھڑ گلی میں لٹک رہا تھا۔ اور کتا مسلسل بھونکتا جا رہا تھا۔ محلے کے دوسرے کتے اجنبی کتے کی آواز پہ پاگلوں کی طرح بھاگتے اور بھونکتے قریب آتے جا رہے تھے۔ سامنے دو سائے بھی اس کی طرف بڑھنے لگے۔ آگے پیچھے..... ماں اور بیٹی۔ محلے کے ایک آوارہ کتے نے شکار سونگھ لیا تھا۔ اس کے پیچھے نہ ختم ہونے والی بپھری ہوئی واوؤ واوؤ۔ عبدل کی پسلیوں سے نکلنے والا پسینہ اس کی ٹانگیں گیلی کرنے لگا۔ ٹومی کو دو دانت بھی لگ گئے تو اس کی خیر نہیں۔ دیوار سے لٹکے لٹکے اس نے ایسی لات چلائی کہ آوارہ حملہ آور چیختا بھونکتا دوسری گلی کی طرف مڑ گیا۔ جہاں پہلے ہی ''یلغار ہو'' کا کاشن مل چکا تھا۔ کون ہے کون ہے کرتے سائے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی طرف بڑھ رہے تھے کہ برآمدے کے اندر کنڈی کھلنے کی آواز نے اس کے ہوش اُڑا دیے۔ دیوار چھوڑی اور سانس بند کر کے وہ سرکتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا۔ سامنے دم ہلاتے ٹومی کا سانس بھی بحال ہوا۔ جھپٹ کر عبدل نے ٹومی کو گود میں جکڑا اور قمیض کے اندر چھپا لیا۔ وقت اس کے ہاتھوں سے سرکتا جا رہا تھا اور یلغار طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔

''لگتا ہے کوئی ہے.....'' یہ مردانہ آواز تھی اور کوئی اور نہیں تھا یہ سگاں کا چچازاد موہنا تھا۔ مکھن سنگھ باغی کا دوست۔ کمشنر پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ کچھ مقامی لوگ انگریز سرکار کے خلاف گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کچھ شاہوں کی شہہ پر ہو رہا ہے۔ موہنے کا گھر گاؤں کی دوسری طرف تھا۔ اس کا سگاں کے گھر ہونا عبدل کو کھٹکنے لگا۔

''دس مربع زمین اور نوکری میں ترقی.....'' کتا اور جوتے بغل میں تھامے ینگ زیبرا اندھیرا چیرتے اور وقت پھلانگتے بنگلے کی طرف بھاگنے لگا۔ چاندی کا ہار بھاگتے ہوئے جسم پہ بوجھ بن رہا تھا۔ مقامی کتوں کی ''یلغار ہو''

تھکے ہوئے سناٹے کی طرح اونگھتی سستا رہی تھی کہ لندن کے اخباروں میں کمشنر ہربرٹ کی کامیابیاں چھپنے لگیں۔ تب سے سگاں گنگ ہے اور عبدل کی خوش قسمت نسلیں قیامت تک ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

◀◀ ● ▶▶

▶ Lecturer in English, Block No-1, International
Islamic University Islamabad, F- 10 Sector, Islamabad

● قدرت اللہ شہاب

"سولہ آنے"

ایک روز ایک بے حد مفلوک الحال بُڑھیا آئی۔ رو رو کر بولی کہ میری چند بیگھہ زمین ہے جسے پٹواری نے اپنے کاغذات میں اس کے نام مُنتقل کرنا ہے لیکن وہ رشوت لئے بغیر یہ کام کرنے سے انکاری ہے۔ رشوت دینے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں۔ تین چار برس سے وہ طرح طرح کے دفتروں میں دھکے کھا رہی ہے لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔

اُس کی دردناک بپتا سُن کر مَیں نے اُسے اپنی کار میں بٹھایا اور جھنگ شہر سے ساٹھ ستر میل دُور اُس کے گاؤں کے پٹواری کو جا پکڑا۔ ڈپٹی کمشنر کو اپنے گاؤں میں یُوں اچانک دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ پٹواری نے سب کے سامنے قسم کھائی کہ یہ بُڑھیا بڑی شر انگیز عورت ہے اور زمین کے انتقال کے بارے میں جُھوٹی شکائتیں کرنے کی عادی ہے۔ اپنی قسم کی عملی طور پر تصدیق کرنے کے لئے پٹواری اندر سے ایک جزدان اُٹھا کر لایا اور اسے اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگا، "حضور دیکھئے مَیں اِس مُقدّس کتاب کو سر پر رکھ کر قسم کھاتا ہُوں"۔ گاؤں کے ایک نوجوان نے مُسکرا کر کہا۔ "جناب ذرا یہ بستہ کھول کر دیکھ لیں"۔ ہم نے بستہ کھولا تو اُس میں قرآن شریف کی جلد نہیں بلکہ پٹوار خانے کے رجسٹر بندھے ہوئے تھے۔ میرے حُکم پر پٹواری بھاگ کر ایک اور رجسٹر لایا اور سر جُھکا کر بُڑھیا کی انتقالِ اراضی کا کام مکمل کر دیا۔ مَیں نے بُڑھیا سے کہا "بی بی! لو تمہارا کام ہو گیا۔ اب خُوش رہو"۔

بُڑھیا کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ اپنی تشفی کے لئے اُس نے نمبردار سے پوچھا "کیا سچ مچ میرا کام ہو گیا ہے؟"

نمبردار نے اس بات کی تصدیق کی تو بڑھیا کی آنکھوں سے بے اختیار خُوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اُس کے دوپٹے کے ایک کونے میں کچھ ریزگاری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے کھول کر سولہ آنے گن کر اپنی مٹھی میں لئے اور اپنی دانست میں دوسروں کی نظر بچا کر چپکے سے میری جیب میں ڈال دیئے۔ اس ادائے معصومانہ اور محبوبانہ انداز پر مجھے بھی بے اختیار رونا آ گیا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے کئی دوسرے بڑے بوڑھے بھی آبدیدہ ہو گئے۔

یہ سولہ آنے واحد ''رشوت'' ہے جو مَیں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران قبول کی۔ اگر مجھے سونے کا ایک پُورا پہاڑ بھی مِل جاتا تو میری نظر میں ان سولہ آنوں کے سامنے اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ مَیں نے ان چند آنوں کو ابھی تک خرچ نہیں کیا۔ کیونکہ میرا گمان ہے کہ یہ ایک ایسا متبرّک تحفہ ہے جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے مالا مال کر دیا۔

(شہاب نامہ سے اقتباس)

● تبسم فاطمہ

جرم

چھت ٹپک رہی ہے۔

چھت سے ٹپکتی پانی کی بوندیں ایسے گرتی ہیں کہ دیپا اندر ہی اندر ایک پل کو سب کچھ بھول کر عجیب سی لذت میں ڈوب جاتی ہے..... عجیب سی درد بھری لذت..... جسے مباشرت کے وقت چت لیٹی عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔

کبھی اس موسم میں وہ کتنی رومانٹک ہو جاتی تھی..... کل جب وہ عورت نہیں تھی..... آج کی طرح..... عورت..... جانگھوں میں بسنے والی عورت..... منیش بھی اکثر مذاق کے موڈ میں ہوتا ہے تو کہتا ہے..... عورت جانگھوں میں ہی تو بستی ہے۔

عورت..... اسے خود سے شدید نفرت کا احساس ہوا..... ایسا کیوں ہے؟ عورت ہر معاملے میں زندگی کے ہر موڑ پر..... تقدیس کی گرد جھاڑتے ہی چت کیوں ہو جاتی ہے..... ایکدم سے چت اور ہاری ہوئی..... مرد ہی جیتتا ہے۔ عورت چاہے کتنی بڑی کیوں نہ ہو جائے..... اندرا گاندھی..... مارگریٹ تھیچر..... سے لے کر— عورت کی عظمت کہاں سو جاتی ہے اور صرف وہی جانگھوں والی عورت.....

پانی کی بوندوں میں ٹپ سے منیش کا چہرہ ابھرتا ہے، جو اکثر منیش سکسینہ بن کر صرف ایک مرد بن کر اسے ٹوکتا ہے..... تم پھیل رہی ہو..... تم سوٹ مت پہنا کرو..... تمہارا جسم کافی پھیل گیا ہے..... کولہے..... سینہ..... پشت کا حصہ..... تم بہت بھدی ہوتی جا رہی ہو دیپا۔

کچن کے پاس..... ذرا ہٹ کر جو بیسن ہے..... وہاں اس نے بڑا سا آئینہ لگا رکھا ہے..... اپنے سراپا کو روزانہ دیکھنے کے لئے..... بدن کی ان برائیوں کو جاننے کے لئے..... جسے شادی کے صرف چند سالوں بعد منیش کی آنکھوں میں بارہا محسوس کیا ہے دیپا نے..... آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے..... اپنے ہاتھ پاؤں پر چڑھتے ہوئے گوشت کو بار بار چھو کر دیکھتی ہے..... وہ فربہ ہونے لگی ہے..... اور منیش لمحہ لمحہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

ہوا کرے..... شٹ..... بڑے بڑے فلسفوں کے درمیان اصلی چہرے کو پہچاننے میں برسوں پہلے دھوکا ہوا ہے اسے۔

چھت ٹپک رہی ہے..... رات آہستہ آہستہ گھرتی جا رہی ہے..... ایلیشا ایک بار چیخ کر روئی ہے..... دیپا جب تک

اس کے پاس دوڑ کر پہنچتی، کروٹ بدل کر وہ پھر گہری نیند میں سو گئی ہے۔ ایک ٹک وہ ایلیشا کو دیکھتی ہے..... یہاں اس جسم سے..... پورے نو ماہ گوشت پوست کے اس ٹکڑے کو..... سلائی کی طرح کھول کر باہر نکالا ہے اس نے— اسی بدن سے جس کے نشان پر انگلیاں پھیرتا ہوا منیش ٹھہر جاتا ہے..... پوچھتا ہے..... تمہارے پیٹ پر یہ لمبے لمبے نشان کیسے آ گئے..... کیا سبھی کو ہو جاتے ہیں..... کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کیوں نہیں کرتیں..... یہاں اتنا گوشت کیسے آ گیا.....؟

نشان..... گوشت..... چربی..... اسے لگتا ہے جسم کی ڈکشنری کے بس یہی لفظ رہ گئے ہیں، جسے اپنی انٹکچوئل آنکھوں سے پڑھتا ہے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے..... اسے کریدتا رہتا ہے— چھیلتا رہتا ہے..... دیپا..... تم یہاں..... یہاں اور یہاں سے بدصورت ہو رہی ہو..... تمہارا پیٹ کافی نکل گیا ہے..... چہرے پر جھائیاں پڑ رہی ہیں۔ اور کبھی کبھی مذاق میں پوچھتا ہے— دیپا تم عورت لگنے لگی ہو..... اماں جیسی عورت.....!

بارش لگاتار ہو رہی ہے۔ جب سے بارش شروع ہوئی ہے ایک عجیب سا سناٹا باہر اور اس کے اندر اتر گیا ہے..... اس کے ایک دم اندر اندر..... اس نے دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج گئے ہیں..... ایک ہمدرد، تشویش میں ڈوبی عورت چپکے سے اس میں سما جاتی ہے..... منیش اتنی دیر کہاں رہ گیا.....؟ آج ضرورت سے زیادہ دیر ہو گئی..... باہر کسی کام میں پھنس گیا ہوگا.....

آخر کو پریس رپورٹر ہے نا..... جرنلسٹ..... خود کو انٹلکچوئل سمجھنے والا۔

بارش کی ہلکی ہلکی پھوہار اور چھت سے ٹپکتی پانی کی بوندوں میں کچھ گزری بسری یادیں بھی گھل مل گئی تھیں۔

منیش سے اس کی لو میرج ہوئی تھی۔ تب ان دونوں کی شادی کو لے کر گھر میں کافی ہنگامہ ہوا تھا۔ کتنا طوفان مچا تھا..... کمزور سا منیش..... بزدل سا..... گھر والوں کے سامنے بالکل سہما سہما اور اس کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی تھی دیپا..... گھر، زمانہ، حالات— اپنے فیصلے پر کمزوری اور بزدلی کی خاک مت ڈالو۔ فیصلہ کرو فوراً..... پھر پورے تیور اور اعتماد کے ساتھ وہ منیش پر کسی حکمراں کی طرح چھا گئی تھی۔

''لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں..... تھوڑی سی پامسٹری مجھے بھی آتی ہے..... غلطی تمہاری نہیں منیش۔ تمہارا نام ''م'' سے شروع ہوتا ہے..... سنگھراشی..... اس راشی کے لوگ، جن کی اگر بچپن سے ٹھیک پرورش نہ کی گئی تو وہ یا تو بہت بزدل بن جاتے ہیں یا پھر بہت خودسر— اور پھر تمہارا انگوٹھا بھی جھکا ہوا ہے۔ ول پاور کی کمی ہے تمہارے یہاں۔ تم خود فیصلہ کر ہی نہیں سکتے..... چلو یہ فیصلہ اب مجھے ہی کرنا ہوگا۔'

منیش نے ہار مان لی تھی۔ ایک کمزور ہنسی کے ساتھ اس نے دیپا کا ہاتھ تھام لیا تھا..... ہاں! مجھ میں فیصلے کی بڑی کمی ہے دیپا..... وہ روہانسا ہو کر بولا تھا..... اعتماد کی رسی میرے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے پھسل رہی ہے..... پلیز دیپا.....

وہ اور قریب آ گئی

منیش کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی— دیپا عورت کی ایک الگ سی تصویر ہے میرے اندر..... ایکدم

سیتا..... مریم..... ساوتری کی داستانوں جیسی نہیں..... ان سے مختلف..... شانہ بشانہ میرے ساتھ چلتی ہوئی..... آج بھی اس دور میں بھی لڑکیوں کو مظلوم اور مرد کی جابر سلطنت کا ادنیٰ کھلونا کیوں تصور کیا جاتا ہے دیپا—؟ بتا سکتی ہو..... ہم دونوں مرد عورت کی عام پریبھا شا بدل دیں گے دیپا..... ہمیشہ دوست رہیں گے جیسے دو دوست رہتے ہیں۔

وہ بولتا رہا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی رہی۔ تصور میں ست رنگے سپنوں کو بنتی رہی۔

یہ سپنا اتنی جلدی کیسے ٹوٹ گیا تھا؟

مسز منیش سکسینہ بن کر دلی کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں شامل ہوتے ہی یہ دوستی کیسے ٹوٹ گئی تھی۔

دوست.....؟

ہنسی آتی ہے..... دوستی تین سالوں تک نبھی..... ہاں نبھی ہی کہا جا سکتا ہے..... دھیرے دھیرے فلسفوں کے کانٹے دار جنگل میں وہ کالے گھنے بادلوں کو دیکھتی رہی۔ خواب اتنے بدصورت کیوں ہوتے ہیں.....؟ اور فلسفے زندگی کی حقیقت کیوں نہیں بنتے.....؟ ذرا دور تک— ایکدم پانی کے بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے ہیں..... پھوٹتے ہی سامنے والا ننگا کیوں ہو جاتا ہے۔

وہ منیش میں اب ''بھوت'' دیکھتی تھی۔ تنہائی میں جبلت والا ایک درندہ اس میں سما جاتا ہے— Sadist کہیں کا..... وہ اسے توڑتا تھا۔ نوچتا تھا۔ چہرے پر پسینے کی بوندھیں چھلچھلا آنے تک اس کے پورے وجود میں دیر تک گھناؤنی نفرت پیوست کر دیتا تھا۔

وہ محبوبہ اور دوست سے جانگھوں والی عورت بن جاتی تو جیسے خود پر شرم آتی۔ یہ مرد ہی کیوں جیتتے ہیں اور عورت چت کیوں ہو جاتی ہے..... ہمیشہ ہارنے والی..... مہینہ دو مہینے اور سال گزرتے ہی وہ منیش میں اپنے آپ سے اوبے ہوئے دوست کو محسوس کرنے لگی تھی۔

جیسے اس کے لئے جو جذبہ یا احساس تھا اس کے اندر وہ بس سوتا جا رہا ہے..... جو احساس تھا وہ اسے نہیں اس کے جسم کو لے کر تھا۔ ایک سدا بہار غنچے کی طرح چٹکنے والے جسم کو لے کر..... جیسے ایک جابر بادشاہ کی نظریں بدلنے لگی تھیں۔ وہ بدل سا گیا تھا..... دھیرے دھیرے وہ پیٹ بنتا جا رہا تھا..... نہیں پیٹ نہیں..... کمپیوٹر یا مشین جو بھی کہیے..... بس ایک میکانکی عمل رہ گیا تھا ان دونوں کے درمیان..... باسی مکالمے— ''کیسی ہو..... کوئی خط آیا ہے..... کوئی آیا تھا آج..... ایلیشا سوگئی.....'' نپے تلے جملے..... اور تھکان..... اسے دیکھتے ہوئے بھی اس کے اندر کوئی مسکراہٹ نہیں جنم لیتی تھی..... کوئی پیار..... کوئی امنگ..... کوئی اضطراب..... کوئی ہلچل نہیں جاگتی تھی۔ بس ایک میکانکی عمل.....

رات ہوتے ہی..... اندھیرا پھیلتے ہی..... اس کے ہاتھ دیپا کے بدن پر..... طوائف کے کوٹھے پر آئے عام گاہک کی طرح مچل اٹھے..... اسے لگتا..... انجانے میں کوئی اور اس کے مقابل سو گیا ہے..... اسے نفرت ہوتی..... اسے لگتا یہ منیش نہیں ہے کوئی اور ہے..... جو اسے، اس عمل سے دیپا کو عورت ہونے کی رسوائی اور طعنوں سے لہولہان کر رہا ہے..... لگاتار لہولہان کیے جا رہا ہے.....

اور..... اس نے محسوس کیا۔

رات کے اندھیرے میں اسے محسوس کرتے ہی..... منیش اندھیرا کیوں کر دیتا ہے..... اس کے بدن پر مچلتے ہوئے اس کے ہاتھ اسے بیگانے کیوں لگتے ہیں؟ اس کی آنکھیں رم جھم بارش کے وقت بند کیوں ہو جاتی ہیں۔

نہیں..... تب وہ نہیں ہوتی ہے.....

اس وقت دیپا نہیں ہوتی ہے.....

کوئی اور ہوتا ہے منیش کے سامنے..... کوئی اور..... جو کم از کم دیپا نہیں ہے..... منیش کی بیوی نہیں ہے..... یہ کوئی اور ہوتی ہے..... کوئی بھی..... فلم ایکٹریس..... منیش کے دفتر میں کام کرنے والی کوئی لڑکی..... مگیزین اور رسائل میں چھپنے والی کوئی ماڈل..... یا بس اسٹاپ پر کھڑی کوئی لڑکی..... کوئی بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ نہیں ہوتی..... دیپا نہیں ہوتی۔

اسے لگتا ہے وہ ہانپنے لگی ہے..... پہاڑ پر چڑھنے والے آدمی کی طرح..... وہ ایسا کیوں محسوس کرتی ہے..... منیش بدل رہا ہے..... بدلا کرے..... لیکن جب وہ اس کے ساتھ..... اس کے ساتھ رہتا ہے تو..... منیش کو اس میں دیپا کو ہی محسوس کرنا ہوگا..... ہاں دیپا کو یعنی مجھے..... مجھے ہی محسوس کرنا ہوگا۔

کبھی کبھی وہ صدمے سے یا غصے سے زوروں سے چیخ پڑتی۔

''نہیں منیش میں یوں نہیں لیٹ سکتی۔''

اس کے ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھ جاتے..... لائٹ آن کرو منیش..... مجھے وحشت ہو رہی ہے— منیش نے لائٹ جلا دی..... چونک کر اسے دیکھا..... نائٹی پھینک کر وہ غصے سے اس کے سامنے تن جاتی.....

''یہ میں ہوں..... میں ہوں منیش..... دیپا..... میں.....''

''ہاں تم ہی ہو..... میں نے کب کہا کہ.....''

''ہاں تم نے نہیں کہا..... لیکن میں جانتی ہوں..... میرے لیٹتے ہی میں مر جاتی ہوں۔ مجھ میں کوئی اور آ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے منیش..... کوئی اور..... تم جسے بھوگتے ہو..... جسے محسوس کرتے ہو..... اور میرے وجود میں پگھلے شیشے کی طرح نفرت اتار دیتے ہو.....''

''کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو دیپا.....''

منیش حیرانی سے دیکھتا ہے..... ''پتہ نہیں میری غیر موجودگی میں کیا کیا پڑھتی اور سوچتی رہتی ہو..... صبح دفتر جانا ہے..... ضد مت کرو..... اس وقت میں Relax ہونا چاہتا ہوں.....''

وہ چیخ پڑتی ہے..... ''میں Relax ہونے کے لئے نہیں بنی ہوں منیش.....''

وہ بستر سے ایسے ہی اٹھ جاتی ہے..... ''مجھے دیکھو..... مجھ میں بھی ایک آگ دہک رہی ہے..... یہ میں ہوں..... دیپا.....''

ہسٹریائی کیفیت کے تحت وہ رونا شروع کر دیتی ہے.....

منیش دھیرے دھیرے اسے منانے کو آگے بڑھتا ہے تو وہ غصے میں ہاتھ جھٹک دیتی ہے.....

''پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می.....لیومی الان.....پلیز.....سوجاؤ.....اور مجھے بھی سونے دو''

دیپا دیکھتی ہے.....منیش کے چہرے پر الجھن کے آثار ہیں.....شکار کے پاس آ کر بھی نامراد لوٹ جانے والے شیر کی طرح.....وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا ہے.....اور وہ محسوس کر رہی ہے.....پلنگ مسلسل چیخ رہا ہے.....بج رہا ہے.....!

شٹ منیش ایسے کیوں ہو جاتا ہے.....کیا سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔؟

صبح جب اس کا غصہ کافور ہوتا تو وہ نہائی ہوئی صبح کی طرح خوشگوار بن کر ایک گرم میٹھے چائے کے کپ کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر جاتی ہے۔

''منیش ڈیر! معاف کر دو مجھے.....پتہ نہیں.....رات، بستر پر ایک خبطی عورت کہاں سے سما جاتی ہے مجھ میں.....معاف کر دونا.....!

''کر دیا.....'' منیش ہنستا ہے.....جانتا ہوں.....ایبنورمل ہو تم.....تھوڑا تھوڑا میں بھی ہوں۔تبھی تو تمہارے ساتھ مزہ آتا ہے.....دراصل تمہارے پانے کے سپنے میں بھی تھوڑی سی Abnormality شامل تھی۔

آفس جاتے جاتے وہ جیسے اس کی دکھتی رگ پر پھر ہاتھ رکھ دیتی ہے.....''تم سارے مرد.....اس طرح بیوی سے ناراض ہو کر رات میں چارپائیاں کیوں توڑنے لگتے ہو.....کوئی تو ہوتا ہے نا.....مانو مت مانو.....ہوتا ہے نا.....''

منیش پلٹتا ہے.....اسے یاد ہے ایلیشا کی پیدائش کے دو ماہ بعد اس سوال کے جواب میں منیش نے کہا تھا۔

''تم غلط جا رہی ہو دیپا.....تمہاری سوچ غلط ہے.....تم سب کچھ غلط Angle سے کیوں دیکھتی ہو.....یعنی جو ہے وہ غلط ہے.....تم میں ایک دوسری عورت اندھیرے میں ہم بستری کے وقت آ سکتی ہے.....مگر ابھی نہیں.....جب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے باسی اور بور ہو جائیں گے۔ بہت بور۔تب اندر کے احساس کا جگانے کے لئے کسی چٹخارے کی ضرورت تو پڑے گی نا.....ابھی نہیں.....اور ایسا کیوں سوچتی ہو کہ اندھیرے میں ہی مرد کے ذہن میں کوئی تصور بن سکتا ہے، بتی جلنے پر نہیں.....ذہن میں خاکے تو کبھی بھی بن سکتے ہیں.....لیکن عورت اپنے مرد کو اس کا موقع ہی کیوں دیتی ہے.....''

اور اسے لگا تھا منیش اس کے عورت ہونے کے نام پر ایک گندی سی گالی دے کر چلا گیا ہو.....عورت اپنے مرد کو اس کا موقع ہی کیوں دیتی ہے.....کیوں دیتی ہے.....ہتھوڑے کی طرح یہ جملہ اس کے ذہن پر بجنے لگا تھا.....عورت.....کیونکہ وہ بھوگ بن جاتی ہے۔مسلسل بھوگ کی چیز.....وہ نو ماہ اپنے مرد کی جبلت کو اپنی کوکھ میں سنجوتی ہے اور بدن پر بھدے نشان ابھار لیتی ہے.....عورت اگر بھدی ہوتی ہے تو اس میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے.....کتنی صفائی سے مرد سارا الزام عورت پر ڈال دیتا ہے۔

اسے لگتا ہے وہ ٹوٹ رہی ہے.....ایلیشا کے آنے کے بعد وہ لگاتار ٹوٹتی جا رہی ہے.....اس کے برابر بستر پر اس

کے ساتھ ایک چھپکلی چل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی چھپکی اچانک اس کے بدن پر پھیل جاتی ہے.....اور اس پر اس لمحے صرف جسم سچ ہو جاتا ہے.....برسوں سے پوسا پالا پیار.....ایک میٹھے تیکھے وقتی احساس کے لئے—اتنی دور تک ساتھ چلا یقین دھندلا کیوں ہو جاتا ہے.....کیوں؟

ٹپ ٹپ بارش کے قطرے لگاتار گر رہے ہیں.....

اسے خود سے نفرت ہوئی.....نہیں.....وہ بہت بری بنتی جا رہی ہے.....اس کے خیال.....اس کے حواس.....سب پر کوئی انقلابی حملہ ہوتا جا رہا ہے.....حملہ.....اور حملے کا پہلا وار منیش کی طرف سے کیا گیا ہے۔

یہ مرد.....باہر سے آتے ہی فلسفوں کی تان عورت کے بدن پر کیوں ٹوٹتی ہے۔ وہ ایلیشا کو دھیرے دھیرے تھپک رہی ہے.....سو جا بیٹا.....سو جا.....

نیچے منیش کی گاڑی رکنے کی آواز آتی ہے۔

اس کی مٹھیاں بھینچ گئی ہیں.....نہیں.....وہ فاتح بننا چاہتی ہے.....کسی کمزور لمحے میں بھی.....فاتح.....جیسے زندگی کے ہر موڑ پر وہ ہے.....یہاں بھی وہ فتح جیسا احساس پیدا کرنا چاہتی ہے۔

منیش کے پیروں کی چاپ زینے تک آ گئی ہے.....اور اسے محسوس ہو رہا ہے.....وہ ڈھال بن گئی ہے اور.....منیش تلوار ہے.....تلوار میں بجلی کی سی چمک ہے.....اور ڈھال میں زبردست قوت مدافعت.....چمکتی ہوئی برہنہ تلوار لہراتی ہوئی ڈھال کو زیر کرنا چاہتی ہے.....مگر زناٹے دار ناچتی ہوئی ڈھال کے آگے تلوار کو سپر ڈالنی ہی پڑتی ہے.....ڈھال اچھل کر تلوار کی نوک پر گرتی ہے.....اور ڈھال کی قوت تمازت سے تلوار پگھل پگھل کر اپنی شکستگی کو قبول کر لیتی ہے.....

ڈور بیل لگاتار بج رہی ہے.....اور بالکنی پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے ہی جا رہے ہیں.....

◀◀ ● ▶▶

▸ D-304 Taj Enclave Geeta
Colony , Delhi - 110031

اگر زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے ہو تو افسانے پڑھا کرو۔

اقبال حسن آزاد

● محمد نعیم دیپالپور

اک بات ذرا سی

''کیا بات ہے رحمت؟ خیریت تو ہے نا!'' میں نے اُس کے زانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

جواب میں اُس نے سلگتی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بے چینی سے اپنی چھدری داڑھی میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ انگلیوں میں لرزش بڑی واضح تھی۔ اُس کی باہر کو ابلتی ہوئی آنکھیں اور سُجا ہوا چہرہ دیکھ کے مجھے سارے بدن میں ایک جُھرجُھری سی محسوس ہوئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اُس کے دوسرے ہاتھ سے تسبیح کے دانے بڑی آہستگی سے خود بخود پھسلتے چلے جا رہے تھے۔ شش و پنج میں الجھا وہ چند لمحے میرے چہرے پر نظریں گاڑے رہا، پھر سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ تسبیح کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی تسبیح کے دانے اب بڑی سرعت سے نیچے گرنے لگے تھے۔ اُسکے بند متورم پپوٹوں کے پیچھے آنکھیں اتنی نمایاں ابھری ہوئی تھیں کہ محسوس ہوتا تھا ابھی پردے پھاڑ کر باہر آ گریں گی۔

پاس بیٹھے رحمت سے یہ سوال میں نے مغرب کی نماز کے بعد درود و وظائف پڑھنے کے دوران رک کر پوچھا تھا۔ سوال پوچھنے کی وجہ رحمت کا غیر معمولی طرزِ عمل تھا۔ آج جمعہ کی نماز پر وہ پچھلی صف میں میری دائیں طرف تین چار لوگوں کا فاصلہ چھوڑ کر کھڑا تھا۔ صف قائم کرتے ہوئے میں نے یونہی پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ کھڑے نمازی سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا رہا تھا۔ خشک لرزتے ہونٹوں پر زبردستی لائی گئی مسکراہٹ میں تلخی نمایاں تھی، آنکھیں سوجی ہوئیں اور چہرہ بہت بھاری ہو رہا تھا..... اُس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا تھا۔ میں جان گیا کہ وہ دانستہ ایسا تاثر دے رہا ہے کہ جیسے اُس نے مجھے اگلی صف میں کھڑے ہوئے نہ دیکھا ہو۔

رحمت نسبتاً کم پڑھا لکھا اور انتہائی سادہ مزاج آدمی ہے۔ ہمارے محلے میں سب سے بڑا provision سٹور اُسی کا ہے۔ آٹھ دس سال پہلے کرائے کی ایک مختصر سی دکان سے بڑا ذاتی سٹور بننے تک میں رحمت کی انتھک محنت، دیانت، خلوص اور خوش مزاجی کو دخل ہے۔ گاہک اُس پر اندھا دھند اعتماد کرتے ہیں۔ اوّل تو کسی گاہک کو شکائیت کا کبھی موقع ہی نہیں ملتا، تاہم کسی کو کبھی کچھ شکائیت ہو بھی جائے تو وہ ذاتی نقصان کی پرواہ کیئے بغیر فوراً اُس کا ازالہ کرتا ہے۔ ایسے صالح خصائل کا حامل کوئی کاروباری آج خال خال ہی ہوگا۔ میرے حساب سے وہ نفسِ مطمئنہ کی ایک عمدہ مثال ہے۔

دکان کے ہمسائے میں رہنے کی وجہ سے رحمت سے میری کافی بے تکلفی ہے۔ جب بھی وقت ملتا ہے میں اُس کے سٹور پر جا بیٹھتا ہوں، ہمارا تعلق گوڑھے راز و نیاز کر لینے کی حد میں مدتوں پہلے داخل ہو چکا ہے۔ تعلق کی ایسی نوعیت! اور وہ مجھے دیکھا ان دیکھا کر رہا تھا؟ اُسے خود سے دانستہ نظریں چراتے دیکھ کر میں نے کافی خجل اور بے چین محسوس کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اُس سے کچھ پوچھ پاتا وہ میرے نماز سے فارغ ہونے سے پہلے ہی مسجد سے جا چکا تھا۔

جمعہ کے روز رحمت اپنی دکان نمازِ عصر کے بعد کھولتا ہے۔ سوچا چلو دکان کھولے گا تو اُس سے وجہ جاننے کی کوشش کروں گا، مگر عصر کی نماز پر نہ تو وہ مسجد آیا اور نہ ہی اُس نے دکان کھولی۔ اُسے مسجد میں نہ پا کر میری بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔ گھر جاتے ہوئے ارادہ کیا کہ حال احوال پوچھتا چلوں مگر اُس کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے ہاتھ اُٹھایا ہی کہ جھجک گیا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

نمازِ مغرب پر رحمت کی حالت مزید دگرگوں ہو رہی تھی۔ اُس کی ایسی ابتر حالت نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے میرے ارادے کو اور بھی پختہ کر دیا۔ مبادہ وہ پھر طرح دے جائے، میں نے اُسے آنکھیں بند کیئے تسبیح پڑھتے وہیں چھوڑا اور باہر آ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ باہر آیا تو میں نے اُسے آگے سے لیا۔ وہ سر جھکا کر چپ چاپ میرے برابر چلنے لگا، گویا میرا ارادہ بھانپ کر طے کر چکا ہو کہ معاملہ کھولے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔

''تم آج عصر کی نماز پر نظر آئے ہو اور نہ ہی دکان کھولی ہے۔ گھر کا کچھ سامان خریدنا تھا۔'' میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے بات شروع کرنے کا بہانہ تراشا۔

وہ محض میری طرف دیکھ کے رہ گیا۔

''.....اور یہ آنکھیں اور منہ کیوں سُجا رکھے ہیں بھئی؟..... بات کیا ہوئی ہے؟''

''بات؟..... آپ مذاق اُڑائیں گے..... یا میری بات سُن کے آگے سے کوئی ڈونگھی بات کرنے بیٹھ جائیں گے۔'' رحمت نے موت سی سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے ہر کسی سے گہری باتیں کرنے کی اپنی عادت پر کچھ شرمندہ سا ہوتے ہوئے کہا: ''اچھا ٹھیک ہے بھئی! کوئی ڈونگھی بات بالکل نہیں کروں گا..... مگر تم کچھ کہو بھی تو!'' پھر میں نے اُس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''بلکہ چلو تمھاری دکان پر ہی بیٹھ کے بات کرتے ہیں..... واپسی پر میں سامان بھی اُٹھا لوں گا..... تمھاری بھابھی نے دوپہر سے واویلا مچا رکھا ہے۔ کیوں مجھے.....'' اُسے ریلکس کرنے کے لئے میں زبردستی مسکرایا۔

''ابھی جی نہیں چاہ رہا..... ذرا ٹھہر کے کھولوں گا..... یا کیا پتہ نہ ہی کھولوں۔''

''چلو وہ تو جیسے تمھاری مرضی!..... پر تم بات تو بتاؤ، شائید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں..... آخر بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے۔''

''میاں صاحب، اب آپ سے کیا چھپاؤں اور کیا بتاؤں!..... ہاہ..... کل رات دُکان بند کی تو آپ کی بھابھی نے بڑے چاؤ سے استقبال کیا۔ ایک یہی رات تو ہوتی ہے ہم مزدوروں کے پاس! باقی دنوں میں تو آپ جانیں

کہ تڑکے دکان کھولنا پڑتی ہے، گھر جاتا ہوں تو کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو کے سو جاتا ہوں..... کہنے لگی تم نہا لو میں کھانا لگاتی ہوں..... میں ہلکا پھلکا ہو کے چارپائی پر آن بیٹھا اور کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ بھوک بڑے زوروں پر تھی..... وہ کھانا رکھ کے پاس ہی بیٹھ گئی، میں نے شرارت سے اُس کا بازو پکڑ لیا..... شادی ہوئے اتنے سال ہونے کو آئے ہیں، مگر بازو پکڑتے ہی وہ ساری کی ساری کچی ٹہنی کی طرح لچک کے رہ گئی اور بڑی ادا سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی: 'تم کھانا شروع کرو، میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں۔'''

ہماری لاکھ بے تکلفی سہی مگر رحمت نے اپنی بیوی کے متعلق اس انداز میں پہلے کبھی بات نہ کی تھی..... مگر آج! میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور میرے قدم ایک ساعت کے لئے رک گئے، مگر وہ اردگرد سے بے نیاز سر جھکائے بولے چلا جا رہا تھا۔

''بچے تو پہلے ہی گھوک سو رہے تھے۔ وہ تو بس!..... میں نے اُسکی طرف آنکھ بھر کے دیکھا اور بازو چھوڑ دیا..... اُسکے اشارے نے اندر بھانبڑ لگا دیا تھا..... وہ چلی گئی تو میں نے مچتے مچتے پنڈے کے ساتھ پہلا لقمہ توڑا..... ابھی لقمہ منہہ میں ڈالا ہی تھا کہ بجلی چلی گئی..... ایک دم میرے دماغ میں جیسے بھٹی سے تازہ تازہ نکلی ہوئی کوئی سلاخ گھستی چلی گئی۔ ساتھ ہی میری گھنڈی (کنٹھ) میں شدید تکلیف اُٹھی، جیسے کسی نے پوری طاقت سے میرا گلا دبا دیا ہو۔ میری ہچکی نکل گئی..... وہ بیچاری اندھیرے میں گرتے پڑتے ایمرجنسی لائٹ کی طرف دوڑی۔ لائٹ آن کر کے وہ دوڑتی ہوئی آئی اور پانی میری طرف بڑھایا، مگر ہڑبڑاہٹ کی وجہ سے پانی کا گلاس اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے لپک کے اُس کے گال پر ایک لپڑ مار دیا..... وہ کرمانوالی اپنے گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے میرا منہ تکنے لگی..... پچھلے بارہ سال کے دوران اُن نے مجھے کبھی ایسے غصے میں نہ دیکھا تھا۔ بلکہ مجھے غصہ آتا ہی کب ہے..... خوف خدا نہ ہوتا تو میں کھانا بھی اُٹھا کے دیوار پر دے مارتا۔

میں نے جیسے تیسے گلے میں اٹکا لقمہ نگلا اور دھاڑتے ہوئے اُسے کھانا اُٹھانے کو کہا..... اس چیخم دھاڑ سے بچے بھی اُٹھ بیٹھے اور واویلا کرنے لگے..... میرا جی چاہا کہ بچوں کو بھی کوٹ پیٹ کے رکھ دوں..... مَیں غصے میں باہر آ گیا اور گلی میں ٹہلنے لگا..... ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس گھر آیا تو چارپائی سے بستر اُٹھا کے زمیں پر دے مارا اور رڑکتی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ باقی کی ساری رات ہی کروٹیں بدلتے گزر گئی..... کل تڑکے سے مسلسل جاگ رہا ہوں۔ کل دوپہر سے لیکر اب تک کچھ نہیں کھایا ہے۔ آنکھیں اور منہہ کیوں نہ سوجیں گے بھلا!..... میری وجہ سے وہ کرمانوالی بھی ساری رات ہی کروٹیں بدلتی رہی..... وقفے وقفے سے چہرہ گھما کر مجھے دیکھتی اور اپنا ہاتھ میری منجی (چارپائی) پر رکھ دیتی، مگر مجھے چھونے یا بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اُسکی.....''

رحمت چلتے چلتے رکا اور میری چہرے پر نظریں گاڑ کے بولا: ''یہ نہ سمجھیں کہ میں نے کوشش نہیں کی..... پر وہ پیڑ، وہ چبھن..... اُس کرمانوالی پر ہاتھ اُٹھانے کا منظر، ساری رات اُس کا کروٹیں بدلتے رہنا اور بچوں کا کُرلانا، کہیں گچھے لُک کے بیٹھ گئے ہیں..... رات تو برباد ہوئی سو ہوئی، دن میں بھی ذرا بھر سکون نہیں ملا..... دماغ میں ابھی تک چیسیں اُٹھ رہی ہیں..... نماز میں بھی کچھ سکون نہیں مل رہا.....'' رحمت اپنی کنپٹیاں دبانے لگا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے

بعد وہ بڑے گھمبیر اور بے بسی کی حدوں کو چھوتے ہوئے لہجے میں بولا: ''میاں صاحب، سچی کہوں!..... جی چاہتا ہے کسی کو مار دوں!!!''

''ذرا سی بات'' پر رحمت جیسے بندے کے منہ سے کسی کو مار دینے والی بات سُن کے میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اللہ کرے وہ آج دکان نہ ہی کھولے۔

میں راستہ بھر مبہوت سا رحمت کی باتیں سنتا آیا تھا۔ ردعمل میں انتہائی گہری سانس کے ساتھ میرے نتھنوں سے صرف ایک لمبی سی ''ہُووں'' برآمد ہو سکی۔ رحمت کو سمجھانے کو آج میرے پاس کوئی سادہ سی بات بھی نہ بچی تھی۔

◂◂ ● ▸▸

▸ Street No. 4 Zeyauddin Colony
Dipalpur, Pnjab, Distt. Okarah, Pakistan

نوشابہ خاتون کا اولین ناول

نیا شوفر

منظر عام پر

صفحات: ۱۶۰

قیمت: ۲۵۰/روپئے

ملنے کے پتے: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱

: نوشابہ خاتون۔ ۴۰۶/لوچن انکلیو، کنکڑ باغ پٹنہ ۸۰۰۲۰

● ناصر علی وارثی

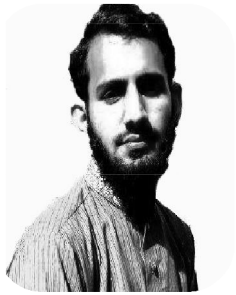

وصالِ یار

جب مجھے اُس سے محبت ہوئی تو میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا.....

محبت بھی کیا عجب شہ ہے؟ جب بھی وہ میرے سامنے آتی تو میری نگاہیں بے اختیار جھک جاتیں اس کے چہرے کو دیکھنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر اس کے سامنے سے ہٹتے ہی میں اپنی ہستی اور وجود کو ختم کر بیٹھتا تھا اور پھر بس وہ سیاہ گنگھریالے بال، پری پیکر، مست و بے خود نشہ آور سی آنکھیں، شیشے کی طرح شفاف بدن ماہ جبیں میری آنکھوں کے سامنے رہتی اور میرے دل کو اسکے سوا کچھ اور طلب نہ تھی۔ بس ایک ہی حسرت ہوتی کہ وہ گل جو گلستاں کیلئے ایک روح پرور نظارے کا باعث ہے میری آنکھوں کے سامنے ہو اور میں دیکھتا رہوں۔ مگر اس میں مجھے اختیار نہ تھا کہ جب وہ پھول میری نظروں کے سامنے آئے تو میں اسے دیکھ سکوں۔ مگر شاید دل کو اسی میں راحت تھی کہ سامنے آئے تو نہ دیکھے مگر بعد میں چین نہ آئے۔

میٹرک کا امتحان دیکر جب میں فارغ ہوا تو گھر والوں کی زبان پر دو باتیں تھیں کہ آگے تعلیم حاصل کرنی ہے یا کوئی نوکری کرنی ہے۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے تو خود بخود ہی ایک ایسی نوکری ملنے والی ہے جس کے ملتے ہی دنیا و مافیہ سے بے خبر ہو جاؤں گا۔ خیر میں گھر والوں کی طرف سے ان دو اختیارات پہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ ابھی اسی کشمکش کے ہی دن تھے کہ ایک روز اچانک پتہ چلا میرے ماموں زاد بھائی عباس کا حادثہ ہو گیا ہے جس کے نتیجہ میں انکی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اسکو ایمرجنسی میں ہسپتال منتقل کیا گیا۔ اگلے دن میں اسکی تیمارداری کیلئے پہنچا تو وہاں میری ڈیوٹی لگا دی گئی کہ سلیمان! ان دنوں آپ فارغ ہو نہ تو کوئی پڑھائی کا سلسلہ ہے اور نہ ہی کوئی ملازمت وغیرہ ہے اس لئے آپ ہسپتال میں اپنے بھائی (ماموں کا بیٹا) عباس کے پاس رہو گے۔ میں نے بھی بخوشی قبول کر لیا۔ اور یوں چند دن میں اسکی دیکھ بھال کیلئے وہاں ٹھہر گیا۔

ہسپتال کی وارڈ میں مریض کثیر تعداد میں تھے۔ ہر کوئی اپنی جگہ تنگ اور بیماری کے رونے رو رہا تھا مگر وارڈ تھی خوبصورت اور صاف ستھری۔ ٹھنڈے پانی کا مناسب انتظام تھا اور ہر کسی کو فضول میں اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ میں عباس صاحب کے پاس ٹھہر گیا اسکی دیکھ بھال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس میں میرے ساتھ ڈاکٹر بھی شامل تھے مگر وہ اپنے کام پر اور میں اپنے کام پر۔ نرسیں آتیں اور دوا وغیرہ کا سلسلہ کر کے چلی جاتیں۔ غالباً دو روز

بمشکل گزرے تھے کہ ایک نرس جو کہ عباس اور اس جیسے دوسرے مریضوں کیلئے وقتِ مقررہ پر آتی تھی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ جاتا، خدا جانے یہ عشق تھا، محبت تھی، دل کا پاگل پن تھا یا اپنے اپنے ذہن کے مطابق خود سمجھ لیجئے کہ کیا تھا۔ میں یہ بحث بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

چنانچہ پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا اور ایک انجانی آواز آئی کہ تو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب حالت یہ تھی کہ عباس کے گھر والے، رشتہ دار اور دوست احباب وغیرہ جہاں یہ دعا مانگ رہے تھے کہ عباس کو اللہ جلد از جلد صحت عطا فرمائے وہیں ان سب کے مقابل میری یہ دعا تھی کہ یا اللہ اب چند دن جیسے بھی ہو میں یہاں ٹھہر جاؤں۔ محبت و دل لگی اپنے نقطہ کمال تک پہنچ رہی تھی، گھر میں دل لگنا مشکل ہو رہا تھا۔ گھر والے اور رشتہ دار سمجھ رہے تھے کہ میں بڑی جانفشانی سے عباس صاحب کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ مگر کیا معلوم کہ کس کی دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ میں عباس کے پاس پہلے سے بھی زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ فارغ تو میں تھا ہی اور نہ ہی کوئی کام، سوچا چلو عشق کو ہی پروان چڑھا لیا جائے۔ میرے ان سب کاموں میں عباس برابر کا شریک تھا۔ میں اُس کے دکھ درد بانٹنے ہسپتال رہتا اور وہ اسکے ساتھ ساتھ شاید میرے زخموں کو سمجھنے لگا تھا۔ اور اکثر مجھے دن میں کئی کئی بار یہ شعر سناتا۔

نہ تو اپنے گھر میں قرار ہے نہ تیری گلی میں قیام ہے
تیری زلف کا فریفتہ کہیں صبح ہے کہیں شام ہے

شاید یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی کہ جب بندے کو محبت ہو جائے تو پھر وہ اسی چیز کی تمنا کرتا ہے جس سے محبت ہو۔ باقی وہ ہر چیز کو جھوٹ ہی سمجھتا ہے اور اگر محبت مل جائے تو آہستہ آہستہ اپنا اثر کم کر دیتی ہے۔ اگر نہ ملے تو پھر یہی حال ہوتا ہے جو کہ عباس نے اس شعر میں بیان کیا۔

میں اس محبت کو کیا نام دوں کہ جب بھی وہ آتی تو میں اسے دیکھنے کی ہی حسرت رکھتا۔ کبھی اس سے بات کرنے اور ملنے جیسی کوئی حسرت نہ ہوئی تھی۔ عباس آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا اور میری پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ شاید یہ سب یہاں تک ہی محدود ہے اس سے آگے کچھ نہیں اور نہ ہو گا۔ مگر عشق جس کو اپنی بانہوں میں جکڑ لے پھر شفاء ناممکن ہے۔ مجھے حضرتِ عشق نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا اب علیحدہ ہونا مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر یہ دن شاید اپنے اندر ایک نیا طرزِ دیوانگی لیکر آ رہے تھے یہ سوچتے ہوئے بھی کہ یہ سب ہسپتال تک ہی ممکن ہے اسکے بعد کچھ نہیں مگر پھر بھی دل کو قرار نہ تھا۔ اسی بیقراری سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ ہم یہاں سے چند دنوں میں فارغ ہونے والے ہیں اور پھر مستقبل کی کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی جو میں بیان کر چکا.....عباس نے اس معاملہ میں میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ اس سے پہلے ہمیں وہاں سے فارغ کیا جاتا ہم نے گھر والوں سے کہا کہ ڈاکٹرز عباس کو مزید چند دن یہاں رکنے کا کہہ رہے ہیں اس لئے ابھی مزید کچھ دن ہسپتال میں رکنا ہو گا۔ اور دوسری طرف ہم نے ڈاکٹروں سے بھی کچھ ایسا ہی ساز باز کر رکھا تھا کہ عباس کو چند دن اور ہسپتال میں رکھا جائے تاکہ یہ بہتر طریقہ سے صحت پا سکے۔ اور ساتھ ہی ساتھ گھر والوں کی طرف سے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ ڈاکٹر اس بات پر راضی ہو گئے اور یوں ہمیں کچھ دن وہاں اور رکنے کا موقع مل گیا اور ساتھ ساتھ ان دنوں میں نے وہاں کے چھوٹے طبقہ سے لیکر بڑے طبقہ

تک کے تمام لوگوں سے اپنی جان پہچان کافی حد تک بڑھالی تھی مگران میں بڑے طبقے یعنی ڈاکٹر اور افسر وغیرہ مجھ سے اتنا آشنا نہ تھے اور میں نے سب کے سامنے اچھا بننے کیلئے چند طریقے بھی اختیار کئے ہوئے تھے جن سے میں وہاں اور زیادہ مقبول ہو گیا تھا۔سب سے پہلے تو ایک کام جو شروع دن سے ہی اخلاقی لحاظ سے اچھا سمجھ کر بہ احسن سرانجام دے رہا تھا۔اس سے لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ اور زیادہ بڑھ رہی تھیں۔میں صبح سویرے اُٹھتے ہی سب سے پہلے پورے وارڈ کے مریضوں سے ملتا اور انکا حال دریافت کرتا۔اوران سے کسی بھی قسم کا کام پوچھ کر خود کرتا اور انکی اسطرح کی خدمت کو میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔رات کو سونے سے پہلے اور صبح اُٹھنے کے بعد میرا معمول بن چکا تھا۔اور عشق کے ساتھ ساتھ مجھے ان کاموں میں بھی مزا آنے لگا تھا۔میں فارغ ہونے کے بعد بھی اکثر وہاں چلا جاتا اور وہی اپنا معمول دہراتا۔اس میں ایک خاص قسم کا لطف آنے لگا تھا۔اوراس کے علاوہ سارا دن بھی میں اس طرح کے کام کرتا اور آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں پر راج کرنے لگا۔مگر افسوس اس بات کا تھا کہ جس کے دل پر راج کرنا چاہتا تھا اس کی بے نیازی میرے لئے نہ صرف باعثِ پریشانی ہی تھی بلکہ مجھے اس بات پہ سوچنے پر مجبور بھی کر دیا تھا کہ میں ایسا کیا کام کروں جس سے میں اس کے دل پر راج کر سکوں۔جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ میرے بس میں نہ تھا کہ میں اس سے بات کروں اور اپنے دل کا کچھ حال بیان کر سکوں۔

اچھے اور بڑے طبقے کے لوگوں سے ملنا تو ہر کسی کی چاہ ہوتی ہے مگر میری وہاں بڑھتی ہوئی مقبولیت میں ایک بڑا کام یہ بھی تھا کہ میں صفائی کرنے والوں کو بھی نہ صرف ایسے ہی ملتا جیسے کہ ڈاکٹرز کو، بلکہ اُن سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے پیش آتا تھا۔کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جنکو کسی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت گوارہ نہیں ہوتی بالکل یہی حال کچھ میرے ساتھ ہوا۔ان لوگوں نے کچھ چامیگوئیاں شروع کر دیں، میں اس بات کو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جسطرح کے مجھ پر الزام لگائے گئے۔مگر مجھے ان سب کی پرواہ نہ تھی اگر پرواہ تھی تو صرف ایک حسن کے پیکر کی۔مگر اس کی بے نیازی دل کو تباہ کئے جا رہی تھی۔ان لوگوں کی باتیں اتنی بڑھ رہی تھیں کہ الزامات کی بارش ہو رہی تھی، مگر میں ان سب باتوں سے نا آشنا تھا اور اندر ہی اندر سے لوگ میرے مخالف ہونے لگے۔میری پریشانی میں اضافہ کرنے والی باتوں میں اک یہ بھی تھا کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں اس سے پہلے کہ مجھے وہاں سے نکالا جاتا مجھے بعد میں اس بات کا علم ہوا کہ انتظامیہ کے سامنے میری وکالت کرنے والے وہ سب صفائی کرنے والے اور چھوٹے طبقہ کے لوگ تھے جن سے مجھے کچھ خاص لگاؤ اور محبت تھی۔میرے متعلق ہر قسم کی الزام تراشی کو روکا اور ہسپتال کی انتظامیہ کے سامنے مجھے ایک سچا اور اچھے اخلاق والا انسان ثابت کیا اور میں ایک بار پھر سب کی نظر میں ویسے ہی پہلے کی طرح اچھا انسان بن گیا تھا۔مگر اس کو دل کی پریشانی کہیے یا حیرانی کہیے یا پھر اپنے اپنے ذہن کے مطابق مزے کی بات کہہ لیجئے کہ ایسے واقعات اور اُترتی چڑھتی مقبولیت کی وجہ سے بھی کسی پری چہرہ کی طبیعت پر کچھ اثر نہ ہوا تھا اور وہ ویسے ہی پہلے کی طرح بے نیازی کی راہ پر چلی جا رہی تھی۔وہ دنیا و مافیاء سے بے خبر صرف اپنے کام میں ایسے لگی ہے کہ جیسے کوئی بندہ تین چار روز کیلئے کسی جگہ مہمان ہو اور پھر وہ جگہ چھوڑ جانی ہو سارے لوگ اس کیلئے اجنبی چہرے محسوس ہوں۔میری حیرانی میں اس وجہ سے اضافہ تو تھا ہی لیکن زیادہ پریشانی عباس کو چھوٹی ملنے کی تھی۔

رُت بیت گئی، جیسے بھی بیتی اور آخر وہ قیامت خیز دن آن پہنچا جو اپنے کرشمے دیکھانے کیلئے بیتاب تھا، اور اوپر سے ستم ظریفی یہ تھی کہ جس دن عباس کو چھوٹی مل رہی تھی اس دن اس اجنبی کی ڈیوٹی نہ تھی۔دل میں خواہش ہی رہی کہ جاتے جاتے ہی ایک لمحہ کیلئے اُسے دیکھ لوں۔مگر دل کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔حضرتِ عشق کسی بھوت کی طرح میری طبیعت پر سوار تھے۔ہم گھر پہنچ چکے تھے، میری طبیعت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی اور مجھے کسی طرح سکون نہ تھا۔خدا خدا کر کے گھر میں وہ دن گزارا اور دوسرے دن صبح صبح ہی اپنے معمول کے مطابق ہسپتال پہنچ گیا۔اپنے روزمرہ کے کام سر انجام دیے، بدنامی سے بچنے اور لوگوں کے دلوں میں وہی اپنا مقام رکھنے کیلئے وارڈ سے نکل کر ہسپتال کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔عشق بھی کتنی عجیب چیز ہے بدنامی ہو یا بے عزتی، آدمی کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ہسپتال کے سامنے ایک بہت خوبصورت گھر تھا، اور اسکے باہر اک باغ کا سا سماں تھا جس میں چھاؤں دار درختوں کے علاوہ پھولوں والے اور کچھ دوسرے خوبصورتی کے درخت تھے۔میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا کہ ان میں سے کسی درخت کی چھاؤں تلے اپنا وقت گزار لیا کروں گا۔کیوں کہ اب ویسے تو میں اندر پہلے کی طرح نہیں جا سکتا تھا۔دل میں یہ ارادہ کیا اسی جگہ بیٹھ کر حُسن کے پیکر کو آتے جاتے دیکھ کر اپنے دل کی غذا کو پورا کروں گا۔درختوں کی گھنی چھاؤں اور پھولوں کی خوشبو میں پینے کا ٹھنڈا پانی بھی موجود تھا اور بیٹھنے کیلئے سیمنٹ کی ایک میز نما کرسی بھی پڑی تھی، مگر یہ سب چیزیں بھی میرا اس طرف سے دھیان نہیں ہٹا رہی تھیں میں بدستور اپنے کام میں تھا۔کام یہ کہ میں اس کی ڈیوٹی کا ٹائم شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ہسپتال پہنچ جاتا اور اسکو بس اندر جاتے دیکھ لیتا اور وقت ختم ہوتا تو اسے باہر آتے دیکھ کر دل کو سکون ہوتا، دیکھنے کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔اور پھر دیکھنے کیلئے وہ آنکھ کہاں سے لاؤں جب وہ سامنے آتی میری آنکھیں بے اختیار جھک جاتیں، لیکن دیکھنے کا شوق وہی موسی کا سا تھا۔

وقت مقررہ پر میں اپنے چھوٹے سے باغ میں پہنچا مگر آج وہاں کا منظر کچھ اور ہی تھا۔ٹھنڈا پانی، چھاؤں والے درخت، پھولوں کے پودے تو ویسے ہی موجود تھے مگر اُن کے درمیان ایک چوکیدار نما شخص کھڑا تھا۔لمبی لمبی مونچھیں اور اپنی مخصوص اکڑ میں آنے جانے والوں کو گھور رہا تھا۔مگر میری حیرت یہ تھی کہ یہ شخص آج باہر کیوں بیٹھا ہے۔وہ بیٹھا تو باہر تھا مگر اسکی باتیں اور اسکا انداز یوں لگ رہا تھا کہ اس کا دل وہاں بیٹھنے کو نہیں کر رہا۔میں نے بڑی عزت سے سلام کیا مگر ان صاحب کا جواب دینے کو شاید موڈ نہ تھا۔چند منٹ مجھے وہاں کھڑا دیکھنے کے بعد وہ شخص برسنے کے انداز میں گرجا.....جی کیا کام ہے؟، کس سے ملنا ہے؟ میں نے اپنے اُسی لہجے میں کہا کہ بس چند منٹ کھڑے ہونا ہے کسی کا انتظار ہے۔اس نے دوسری طرف منہ کرتے ہوئے اپنی زبان کو بولنے کی زحمت دی ''تم اِدھر نہیں کھڑے ہو سکتے''۔میں بارہا مرتبہ یہ کوشش کی کہ اس سے کوئی رشتہ داری یا تعلق بن جائے مگر وہ صاحب تو ایسے کہ اس بڑے سے گھر کے مالک ہی بن بیٹھے تھے، وقت ابھی کافی پڑا تھا میں ویسے ہی سڑک کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ذہن میں بس یہی ایک لگن تھی مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔عشق کا بھوت سر پر سوار تھا اور ایک دلفریب سی صورت آنکھوں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔میں اپنے مقررہ وقت پر واپس پہنچا اور دیدارِ حُسنہ سے اپنے جسم کا آدھا کلو خون بڑھایا اور اپنے گھر کی راہ لی۔میرا گھر اس ہسپتال سے تقریباً ایک آدھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔میں کبھی تو

سائیکل، موٹر سائیکل اور کبھی پرائیویٹ ویگن پر وہاں پہنچتا تھا۔ مگر یہ سر پھرا عشق مجھے بعض دفعہ اپنی ٹانگوں کے سہارے بھی لے آتا تھا۔ اور اتنی مسافت پتہ ہی نہ چلتا کہ کن خیالوں میں گزر جاتی اور وہاں پہنچ کر ہسپتال کے باہر مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرتا اور اس کو دیکھتے ہی میری ساری تھکن اُتر جاتی، میری نظریں جھک جاتیں اور میرا سر نیچے ہو جاتا۔ البتہ اسکے جاتے تھی پھر وہی لگن کہ اُسے ایک بار دیکھوں۔

میرا یہ معمول کچھ ماہ جاری رہا مگر اس کے انجام سے واقف نہ تھا کہ یہ سب کب تک ہوگا۔ اور آگے کیا ہونے والا ہے۔ میرے اس معمول کو اس خبر نے ضعیف کیا کہ جب میں ایک صبح وہاں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ ایک دو دن سے وہ یہاں نہیں آ رہی۔ ٹرانسفر ہوئی؟ نکال دیا گیا؟ اپنی مرضی سے چھوڑ دیا؟ کسی دوسرے ہسپتال یا ڈسپنسری میں منتقل ہوگئی؟ یہ سب وہ سوال تھے جن کا میں وہاں اپنے خالی ہاتھوں کے ساتھ جواب ڈھونڈتا رہا مگر میرے وہ تمام تعلقات اور ہمدردیاں بھی رنگ نہ لا سکیں اور میں ایک اجنبی مسافر کی طرح واپس گھر لوٹا۔ دل میں یہ ارادہ ضرور کر لیا کہ ہے تو وہ نرس ہی نہ، جائے گی تو کسی ہسپتال یا ڈسپنسری ہی میں، خواہ کہیں بھی ہو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا اور یہ عزم کیا کہ ہر ڈسپنسری اور ہسپتال میں اسے ڈھونڈ کر ہی سکھ کا سانس لوں گا۔ اس کے بعد پھر میرا یہ معمول بن گیا کہ ہر وہ جگہ جہاں ڈاکٹری کا کام یا نام آئے اُسے وہاں ڈھونڈنے پہنچا اور صرف ایک ایک وقت میں ہی نہیں بلکہ مختلف اوقات میں وہاں پہنچا یہ سوچ کر کہ شاید صبح کی بجائے شام کو یا شام کی بجائے رات تو اسکی ڈیوٹی ہو اور وہ وہاں آئے۔ فارغ تو میں تھا ہی یہ کام اپنے مشغلہ کہ طور پر، خود کو مصروف کرنے اور سب سے بڑھ کر اپنے دل کی جو ایک لگن تھی اُسے پورا کرنے کیلئے شروع کر دیا۔ سلمان صاحب! ابھی اور کتنی دیر فارغ رہنے کا ارادہ ہے؟ ایک دن والد صاحب نے ان الفاظ میں استفسار کیا۔ بیٹا یا تو کوئی پڑھائی کا سوچو یا پھر کسی جگہ نوکری ڈھونڈ لو۔ مگر مجھے فی الحال ان دونوں کاموں دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی تمام گھر والوں کے اسرار پر پڑھائی کرنے پر رضامند ہو گیا اور گیارویں جماعت کیلئے داخلہ لے لیا۔ کچھ عرصہ جو پہلے گزرا تھا وہ میں فارغ ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پوری محنت اور لگن سے ایک خزانے کی تلاش کی تھی اب کالج جانا اور پڑھائی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب چلتا رہا مگر ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ میرے خاص عمل میں زرا بھر بھی کمی نہ ہوئی تھی۔ میں نے بدستور تلاش جاری رکھی۔ کالج کی پڑھائی میں کچھ خاص دل نہ لگتا تھا بس یہی وجہ تھی کہ جتنے کالج کے آوارہ لڑکے تھے ان سب کے ساتھ میری دوستی کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا گیا۔ اکثر گھر سے کالج کے بہانے کسی ہسپتال یا ڈسپنسری کا دورہ ہو رہا ہوتا تھا۔ مشہورِ زمانہ بات ہے کہ خدا تعالیٰ کسی سے ایک چیز لیتا ہے تو دوسری نعمت زیادہ مقدار میں عطا فرماتا ہے۔ اگر میری قسمت میں کسی کا ساتھ نہ تھا تو دوسری طرف اللہ نے ذہانت جیسی نعمت خوب عطا کی تھی۔ میں نہ پڑھتے ہوئے بھی اور پڑھائی میں اپنے دل کو نہ لگاتے ہوئے بھی شاید ان دوسرے تمام طالب علموں سے اچھا تھا جو واقعی پڑھنا چاہتے تھے۔ میں تو صرف اپنے گھر والوں کو خوش کرنے کی خاطر خانہ پوری کرنے کالج جاتا تھا۔ اکثر کلاس سے غیر حاضر رہتا تھا، لڑائی جھگڑے میرا روز کا معمول تھا۔ وہ شاید اسی لئے کہ میں یہ سوچتا تھا میری زندگی ہی اب بیکار ہے، جو مجھے چاہیے وہ مجھے مل نہیں رہا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔ مجھے ان تمام باتوں کی پرواہ نہ تھی اور یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ ایک دن میرے

ایک اُستاد نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کچھ سوالات کا انبار میرے سامنے لگا دیا۔ تم اچھے طالب علم ہو پڑھتے کیوں نہیں ہو؟ کیوں لڑتے جھگڑتے ہو وغیرہ وغیرہ..... میں مسکرایا اور ان تمام سوالوں کے جواب ایک لفظ میں ہی دینے کی کوشش کی۔ کہ جناب مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ انہوں نے پوچھا بیٹا آخر وہ کیا بات ہے جو تمہیں پڑھائی سے دور کیے ہوئے ہے جو تمہارا پڑھائی میں دل نہیں لگنے دیتی۔ میں نے کہا جناب کہتے ہیں کہ عشق اندھا ہوتا ہے مجھ سے تو صرف ابھی پڑھائی کو ہی دور کیا ہے۔ اس بات سے شاید انکو سمجھ لگ چکی تھی۔ میری یہ بات سنتے ہی اُنہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہائے..... نہ جانے اس آہ میں کیا چھپا تھا میری قلب وجگر کو اس آہ سے اتنی ٹھنڈک ملی کہ ایک لمحے کیلئے ایسا لگا ہو جیسے اس ٹھنڈک میں کوئی چھپ کر بیٹھا ہے اور مجھے آواز دے رہا ہے کہ آؤ تم بھی میرے ساتھ بیٹھو۔ میں اس آہ کے سائے میں کسی اور ہی عالم میں پہنچ گیا تھا، اتنے میں اُستاد صاحب گویا ہوئے کہ:۔

''بیٹا یہ موضوع بہت وسیع ہے اگر اس پر بات کرنے بیٹھے تو شاید ہم کبھی بھی اس موضوع کو پورا کر سکیں۔ بیٹا یاد رکھنا ہر انسان کی زندگی میں بار بار نہ سہی دو تین بار نہ سہی ایک بار تو ضرور یہ لمحہ آتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اس موضوع پر بات کروں۔ بیٹا یہ لمحات زندگی کے خوبصورت ترین لمحات ہوتے ہیں انکی قدر کرنا۔ میری ان باتوں کو اُستاد کا سبق سمجھو، ایک دوست کا مذاق سمجھو، ایک بڑے بھائی کی نصیحت سمجھو، ایک پاگل کی احمقانہ بات سمجھو، ایک بچے کی معصومانہ بات سمجھو یا کسی عاشق کی دیوانگی کی باتوں سمجھو۔ بہر حال بیٹا ان باتوں کو جو بھی سمجھنا جیسے بھی سمجھنا انکو سمجھ ضرور لینا اور اچھی طرح ذہن نشین رکھنا یہ وقت پھر نہیں آئے گا اور یہ وقت گزر جائے گا۔ بیٹا اسکی قدر کرنا کبھی زندگی میں ان لمحات کو یاد کرو گے تو ہنسو گے بھی اور روؤ گے بھی''۔

اپنے اُستاد کی یہ باتیں میرے ذہن میں اور دل میں ایسے پیوست ہو رہی تھیں کہ گرمی کے سارے دن کا روزہ رکھنے کے بعد ایک مزدور افطاری میں ٹھنڈے پانی سے روزہ افطار کرے۔ انکی ان باتوں نے مجھے بہت سہارا دیا اور باتوں ہی باتوں میں شاید انکا دل میری رام کہانی سننے کو کر رہا تھا اور اُستاد صاحب کی ان باتوں سے انکا جو تجربہ جھلکا تھا وہ دیکھ کر مجھے بھی اشتیاق ہو رہا تھا کہ میں اپنے دل کی ہر بات ان سے کہہ دوں اور ان سے انکی زندگی کا تجربہ حاصل کر کے اس کے سائے میں چلوں۔ پتہ نہیں یہ میری کمزوری تھی یا اچھائی میں نہ تو پہلے کبھی اپنے دل کی بات کسی کو سنائی اور نہ ہی آئندہ کچھ ایسا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر انکی شائستہ باتیں سن کر میں واقعی اس معاملہ میں ان سے رہنمائی لینے کی ٹھان چکا تھا۔ خیر! میں نے انکے اور اپنے دل کی آرزو پوری کرتے ہوئے کچھ نامکمل سی باتیں کہہ دیں۔ میری اس داستان کو سنتے ہوئے وہ کہیں تو مسکرائے، کہیں پریشانی کے آثار جھلکے اور کہیں ایسے بھی تیور دیکھائے کہ میں انکو نہ سمجھ سکا تھا۔ میری یہ چند باتوں سن کر انہوں نے بہت پیاری بات کی کہ.....

''بیٹا اللہ نے انسان کو اپنی محبت کیلئے پیدا فرمایا ہے اور انسان کو محبت کا ہی درس دیا ہے۔ اللہ نے یہ نہ صرف درس دیا بلکہ خود اس کام کو کر کے بھی دیکھایا ہے۔ بیٹا یاد رکھنا! پاک عشق میں خدا مدد کرتا ہے، عاشق کا کام ہے انتظار عاشق بس انتظار ہی کرتا ہے جو کہ بعد مرگ کے بھی جاری رہتا ہے۔''

یہ تمام باتیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میں سن رہا تھا اور نہ جانے کن تصورات میں پہنچ رہا تھا۔ انہوں نے کہا:۔

''بیٹا کسی بزرگ کا قول ہے کہ ایک صورت کو پکڑ لو اسی کے ساتھ تمہارا حشر ہوگا۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ مگر ایسا نہ ہو کہ کہیں تم اپنے فرائض سے غافل ہو جاؤ۔ یہ وقت گزرنے والا ہے اپنے دل و دماغ کو اس بات پر اُکسائے رکھنا کہ کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جس سے اس خالقِ حقیقی نے منع فرمایا ہے۔ وہ عشق مجازی سے انسان کو عشق حقیقی کی طرف لے کر آتا ہے۔''

میرے اُستاد صاحب کی بات تو ختم ہو چکی تھی مگر نہ جانے کیوں میری بات اور زیادہ بڑھ رہی تھی۔ میں وہیں ان سے رخصت ہوا اور پھر سے اپنے ظاہر کو زندگی کی رنگینیوں میں لے گیا۔ مگر باطن میں کچھ اور ہی تھا جیسے تیسے کر کے میرے یہ حالات بھی کٹ گئے اور میرے کالج میں دو سال کا عرصہ بھی خوب گزر گیا اپنے اساتذہ کے دل بھی جیتے اور دوستوں کی تمنائیں بھی پوری کیں، اپنی پڑھائی سے بھی غفلت نہ کی اور کالج میں مختلف تنظیمات کو بھی اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلایا۔ مگر اپنے دل کی اصل لگن کو کسی صورت بھی پس پُشت نہ ڈالا اور تقریباً تین سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہر دن ایسا ہی ہوتا کہ شاید ابھی کل کی بات ہے۔ میں نے اُسے ڈھونڈا ہی نہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں نے کوئی جگہ چھوڑی بھی نہ تھی۔ کالج سے فارغ ہوا تو گھر والوں کی طرف سے سوال کی صورت میں دو اختیار تھے۔ ابّا جی نے سامنے بیٹھا کر پوچھا ''سلمان! پڑھائی کو جاری رکھنا ہے یا پھر شادی؟'' ظاہر ہے کہ اگر میں شادی کا اختیار لیتا تو مجھے اس سے پہلے نوکری کیلئے تگ و دو کرنا پڑتی تھی لیکن نوکری سے پہلے شادی کے سوال پر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے شادی تو بس اب .....!! خیر ایک دفعہ پھر دلِ ناتواں نے پڑھائی کرنے کے اختیار پر ہاتھ رکھا۔ نہ جانے کیوں اس کے ملنے کا اتنا یقین تھا کہ مجھے اس کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہ تھا۔ میں نے اپنے ایک دوست سے پڑھائی کے متعلق مشورہ کیا اس نے کہا کہ کپڑے کی ایک فیکٹری والوں نے نوجوان نسل کیلئے ایک ڈیزائننگ کورس کا اہتمام کیا ہے۔ چھ ماہ کا وہ کورس ہوگا جو کرنے سے زیادہ بھاگ دوڑ کئے بغیر کسی مل فیکٹری میں اچھی جاب مل جاتی ہے۔ مجھے یہ بات پسند آئی اور میں نے اسکی حامی بھر لی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میں نے جیسے بھی ہو اپنا وقت گزارنا تھا اور کسی منزل کی تلاش کرنی تھی۔ میں نے اس چھ ماہ کے کورس میں داخلہ لے لیا۔ فیکٹری کے ساتھ متصل ایک الگ جگہ میں اس کی کلاسز ہوتی تھیں۔ ایک بڑا حال کمرہ جو کہ فیکٹری کے شور و غل سے پاک..... پڑھائی کرنے کا بہت ہی سازگار ماحول تھا، طالب علموں کی زیادہ تعداد نہ تھی۔ کلاس کے باہر ایک چھوٹا سا گھاس کا پلاٹ تھا جس میں بہت خوبصورت پودے لگے تھے۔ میں اکثر وہاں جا کر بیٹھتا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی اس کی صفائی بھی کیا کرتا تھا۔ پڑھائی کی طرف میری لگن ایسی ہی تھی مگر کسی کی تلاش میں میری لگن میں ایک ذرہ کمی نہ آئی تھی۔ نہ جانے کب چھ ماہ کا عرصہ پورا ہو گیا اور میں اپنی کلاس میں پہلے نمبر پہ آیا۔ اس کورس میں پڑھانے والے میرے اُستاد طارق صاحب نے کہا کہ:۔ ''سلمان! میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں ہی رہو اور میرے ساتھ مل کر آئندہ آنے والی کلاس کو پڑھاؤ'' نوکری تو اچھی تھی مگر فکر اپنی منزل کی تھی۔ میں نے انکو اثبات میں سر ہلا دیا اور یوں میں نے پڑھائی کے بعد وہیں پر ہی نوکری شروع کر دی۔ اب میری زندگی نے رُخ بدلنا شروع کیا اور میری اُمیدوں کے برعکس کام ہونے لگا۔ نئی آنے والی کلاس میں طارق صاحب کا بھتیجا عابد بھی شامل تھا چند دن میں انکو پڑھایا تو عابد کو عادت کے لحاظ سے کچھ مغرور پایا۔ اس لئے میری اور اُس کی کلاس

میں نہ بن پائی۔ ایک بار کسی بات پر عابد نے اپنا مغرور پن دیکھایا اور بات لڑائی تک پہنچی کچھ ہاتھا پائی بھی ہوئی مگر طارق صاحب کی مداخلت سے بات لڑائی تک نہ پہنچی۔ عابد نے ایک کڑی شرط عائد کی کہ یا تو سلمان اس جگہ پڑھائیں گے یا پھر میں پڑھوں گا۔ مگر میں اپنے اُستاد طارق صاحب کی عزت کی وجہ سے چپ رہا۔ طارق صاحب کیلئے دونوں رشتے عزیز تھے ایک بھتیجا اور دوسرا ہونہار طالب علم اور بعد میں پڑھانے میں ساتھی۔ انہوں نے اپنے گھریلو ذرائع استعمال کرتے ہوئے عابد کو راضی کر لیا اور معاملا رفعہ دفعہ ہو گیا۔ بات نے دوسرا رُخ اختیار کیا اور وہ لڑائی آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوئی۔ اب وہ مجھے اُستاد سمجھنے لگا تھا اور میں نے بھی اُسکی غلطیوں اور مغرور پن کو پس پُشت ڈال دیا تھا۔ دوستی اس قدر درجہ کمال تک پہنچی کہ اس لڑائی نے دوستی کو گھریلو تعلقات میں بدل دیا اور وہ مجھے اپنے گھر کا ہی ایک فرد سمجھنے لگے تھے۔ میرا انکے گھر والوں سے نہ تو پردہ ہوتا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی رکاوٹ.....ایک دن عابد نے کہا کہ میں جس کالج میں پڑھتا ہوں وہاں میری کچھ لڑکوں سے لڑائی ہوئی ہے۔ لڑائی کے بڑھنے کا خدشہ زیادہ ہے۔ لڑائی وغیرہ کے معاملہ میں میں پہلے ہی سے نڈر تھا اور اسلئے میں نے حامی بھر لی اور اسکے ساتھ ہو لیا۔ جب اس کے کالج میں پہنچے تو جن لڑکوں سے عابد کی لڑائی ہوئی تھی وہ تمام لڑکے تنظیم سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اور تنظیم بھی وہ جس کا چند ماہ پہلے میں صدر رہ چکا تھا۔ ان سب نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا اور ہر طرف سے سلمان صاحب! سلمان صاحب! کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انکو میرے ملنے سے کئی برس بعد خوشی ملی ہے۔ انکے پوچھنے پر میں نے اپنے آنے کی وجہ بتائی تو انہوں نے نہ صرف عابد سے معافی مانگی بلکہ آئندہ کالج میں اس کی ہر قسم کی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا۔ موجودہ صدر نے عابد سے کہا اگر آپکو کالج میں کسی قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو آپ نے ہمیں بتانا ہے آپ ہمارے سلمان صاحب کے ساتھ آئے ہو آپ ہمارے لئے عزت کے لائق ہو۔ گزشتہ لڑائی میں قصور آپکا تھا یا ہمارا، اس سے قطع نظر ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں۔ عابد کی خوشی کی انتہا تھی کہ اس جگہ بھی لڑائی دوستی میں بدل چکی تھی ایک وقت تھا جب وہ ان لوگوں سے ڈر رہا تھا اور اب انہی لوگوں کی طرف سے معافی کے ساتھ ساتھ پیٹ پوجا جیسی خدمت .....یہ سب عابد کیلئے ایک نیا ماجرہ بنا تھا۔ وہ میری دوستی سے بہت متاثر ہوا تھا اور شاید اس کے دل میں میرے لئے محبت اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اپنی محبت اور دوستی کا ثبوت دینے کیلئے اس نے مجھے ایک دن درخواست کی کہ میں آپکو اپنے ساتھ لیجا کر کچھ کھلانا چاہتا ہوں۔ میں نے حامی بھر لی اور ہم شہر کے ایک ہوٹل میں پہنچے۔ ہم جوں ہی اندر داخل ہوئے تو استقبالیہ سے آواز آئی سلمان صاحب.....!!! میں ایک لمحہ کیلئے خود حیران ہوا کہ کون ہو سکتا ہے جو مجھے جانتا ہے اور پھر اتنی عزت بھی دے رہا ہے۔ جب دیکھا تو آواز دینے والا میرے گاؤں کا آدمی تھا۔ ''سلمان صاحب آج آپ ہمارے ہوٹل میں.....ہم سے ملنے کو کیسے دل کر پڑا آپکا؟؟'' میں نے بتایا کے آپ کا تو مجھے یہاں آ کر پتہ چلا ہے میں تو ویسے ہی اپنے دوست کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ انہوں نے ہمیں اچھے طریقے سے بیٹھایا اور بہت خاطر مدارت کی۔ ہم جو کھانے آئے تھے اس سے کئی گنا زیادہ ہمیں وہاں کھانے کو ملا اور زبردستی کچھ چیزیں کھلائیں، بہت زیادہ محبت ملی۔ ''سلمان صاحب کبھی چکر لگا لیا کرو یہ آپکا اپنا ہوٹل ہے اس بہانے بندہ مل لیتا ہے''۔ میں نے کہا جی ضرور۔ ہوٹل میں سے نکلنے سے پہلے عابد نے کہا کہ ہم نے جو کچھ کھایا ہے اس کے پیسے دینے ہیں۔ مگر

ان صاحب کا فرمان تھا کہ ہم سلمان صاحب سے پیسے لیں یا انکے ساتھ کوئی آئے تو اس سے لیں..... یہ نہیں ہوسکتا میں کیا کہہ سکتا تھا ان صاحب نے ناراض ہونے کی دھمکی سے بھی کام لیا۔ بلآخر میں نے عابد کو کہا اور عابد مان گیا۔ یوں ہم خدمت کروا کر جب باہر نکلے تو عابد کی حیرت کا چشمہ پہلے سے زیادہ ہوگیا تھا اور وہ مجھ سے اور زیادہ متاثر ہوا تھا۔

''سلمان! آپ بھی عجیب ہو جس جگہ جاتے ہو آپکی واقفیت ہوتی ہے''..... ہاہاہاہاہا..... نہیں یار یہ تو اتفاق ہی ہوتا ہے۔ لیکن شاید وہ میری انہیں باتوں سے متاثر ہوکر دوستی کا رشتہ مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ رفتہ رفتہ میری اور اسکی دوستی اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ میں اسکے گھر بغیر کسی پردہ کے آنے جانے لگا تھا۔ اور ہمارے گھریلو تعلقات رشتہ داروں کی طرح ہوگئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا تھا مگر اتنا ضرور پتہ تھا کہ میرا مقصد کچھ اور ہے۔ میں اپنی منزل سے لمحہ بھر کیلئے بھی غافل نہ ہوتا تھا۔ عابد کو کبھی کبھار شک پڑتا تھا کہ سلمان کن خیالوں اور کاموں میں مصروف ہے۔ مگر کبھی تو وہ مجھ سے پوچھنے کی زحمت نہ کرتا اور بعض دفعہ وہ سرسری سا پوچھ بھی لیتا۔ مگر پتہ نہیں اس دل کی اس میں کیا مرضی شامل تھی اس کے سامنے کبھی زبان نہ کھولی۔ حضرت عشق کا بھوت میرے دل و دماغ پر سوار تو تھا ہی مگر میری زبان پر ہر بار آنے سے قاصر رہتا تھا۔ یہ شاید کوئی خاص وجہ تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ عابد نے اس کا ذکر اپنے گھر والوں سے بھی کیا ہوا تھا یا پھر انہوں نے میری طبیعت کو دیکھ کر خود اندازا لگا کر عابد سے دریافت کیا ہوگا۔ خیر جو بھی تھا یہی تھا کہ ہر وقت بات اس کی کرنا چاہتا تھا اسی کے تذکرے چھیڑنا چاہتا تھا مگر کسی سے بات کرنے میں زبان میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی تھی اور میری تلاش پہلے دن کی طرح جاری تھی۔ اب تو میں شہر سے باہر ہسپتالوں کی طرف نکل رہا تھا مگر یقین ایسا کہ ساڑھے تین سال بعد بھی اس نوکری سے اُکتایا نہ تھا۔

ایک دن طبیعت بہت اُداس تھی اور عجیب طرح کی کیفیت ہو رہی تھی اس سے پہلے کہ میرے دماغ میں کوئی غلط خیال آتا اور میں اپنے آپ کو کسی بڑی مصیبت میں ڈالتا۔ میں نے عابد کو ساتھ لیا اور اُسی ہسپتال کے باہر جا پہنچے جس جگہ میری حضرت عشق سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک عجیب طرح کا سکون میسر آیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جس طرح سردیوں کی سرد رات میں بغیر کوئی کپڑا اوڑھے ٹھنڈی ہوا میں ایک کھلے میدان میں جا رہا ہوں اور سردی سے کانپ رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں سردی کی وجہ سے غش کھا کر گرتا میرے بدن پر کسی نے گرم شال اُڑھا دی ہو اور ماں کی سی شفقت سے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا ہو.....!

ہسپتال پہنچ کر مجھے ایک دم اسطرح سکون میسر آ گیا تھا کہ اس سکون میں ایک ایسا درد چھپا تھا جو اندر ہی اندر سے میرا دل چاہ رہا تھا کاش یہ وقت آج سے ساڑھے تین سال پیچھے چلا جائے اور میں ایک بار پھر وہی حُسن کی ملکہ کا دیدار کروں۔ مگر تقدیر اسطرح کے دلاسوں کی ایک جھلک ہی دیکھا سکتی ہے۔ اس کشمکش میں ہم ہسپتال کے اندر داخل ہوئے اور وہ جگہ جو مجھے جنت جیسے محسوس ہو رہی تھی اُسے دیکھتے ہی میں کسی پُرانے وقت کی حسین یادوں، وادیوں میں غرق ہوتا گیا۔ بے چینی کے عالم میں میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا شاید اُس جگہ جا کر وہی عادت یاد آ رہی تھی کہ کسی کہ آنے میں اور جانے میں کتنا وقت رہ گیا ہے۔ مگر اب کے بار شاید صرف دلاسہ ہی تھا۔ میری یہ ساری کیفیات دیکھتے ہوئے عابد نے کہا ''سلمان! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم اس لئے یہاں آئے ہو کہ کسی ڈاکٹر

سے کوئی دوا وغیرہ لینی ہے''..... ہائے ڈاکٹر.....!! ڈاکٹر کا لفظ سنتے ہی میرے سینے میں میری بیچینی کو جلا دینے والی ایک ٹھنڈی سی آگ بھڑکی۔ ہاں یار..... کسی ڈاکٹر کو ہی ملنا ہے اور اس سے دوا لینی ہے۔ مگر وہ ڈاکٹر مل نہیں رہا۔ اتنی بات کی اور میری زبان کو ایک بار پھر سے جیسے روک دیا گیا ہو کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ ہم کچھ دیر رکنے کے بعد وہاں سے چلے آئے۔ شاید باقی دنوں کی نسبت آج مجھے کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا اگلے دن میں عابد کے گھر گیا تو عابد کے والدین نے مجھے علیٰحدہ کمرہ میں بیٹھایا اور بہت ہی پُر یقیں و پُر انہما کانہ لہجے میں پوچھا کہ ''سلمان! ہم کافی دنوں سے غور کر رہے ہیں کہ آپکی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ہر وقت چُپ چُپ، اُداس رہنا، میل جول بہت کم رکھنا اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک رہتی ہے نا؟'' اتنے میں عابد کی والدہ گویا ہوئی ''بھئی دیکھو سلمان! تم ہمارے لئے عابد کی طرح ہی ہو رات کو عابد تمہاری طبیعت کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ کیا بات ہے کھل کر کہو جو بھی بات ہے کسی چیز کی پریشانی ہے؟؟'' واہ حضرت عشق تیرے کیا کہنے میری زبان جو کبھی بولنے سے نہ بولی تھی آج عجیب معاملہ ہوا میں نہ چاہتے ہوئے بھی بولنے لگا۔ شاید میری زبان کو تقدیر نے اشارہ کر دیا تھا کہ آج وہ وقت ہے آج بول اور اپنے دل کی بات کہہ دے۔ یوں محسوس ہوا کہ پتہ نہیں آج کیا ہونے والا ہے۔ یہ کائنات اور یہ معاشرہ وسیع نظر آ رہا تھا جو آج سے کچھ دن پہلے تک بہت تنگ لگ رہا تھا۔ میرا دل اندر ہی اندر سے بغیر کوئی خوشی ملے بڑا ہو رہا تھا میری بے چینی دور ہو رہی تھی اور میری عجیب سی کیفیات ٹھیک ہونے لگی تھیں۔ مگر شاید تقدیر میرے ان جذبات و احساسات پر ہنس رہی تھی۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے زبردستی میری زبان کو جنبش دے دی ہو اور میری زبان خود بخود بولنے لگی تھی۔ میں نے اپنی ساری کہانی انکو بیان کر دی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے ملے اور میں اُسے دیکھتا رہوں بس میری اور کوئی تمنا نہیں کوئی خواہش نہیں اور نہ ہی اس کے علاوہ اور کوئی دعا ہے۔ ''بس بیٹا اتنی سی بات ہے؟؟ صرف ایک لڑکی کا عشق!! جو تم کو ہر مقصد سے روکے ہوئے ہے۔ اطمینان رکھو!! اگر اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن تمہارے دل کی مراد ضرور پوری ہوگی۔'' میں یہ باتیں سن کر وہاں سے چلا آیا مگر میرے دل کو اس سے کافی اطمینان ہوا تھا۔ اگلے دن دوبارہ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں پہلے سے قدرِ خوش تھا عابد کے والدین نے مجھے بیٹھایا اور کہا ''سلمان! آپکے لئے ایک خوشخبری ہے۔ آج آپکو ساڑھے تین سال کی نوکری کا معاوضہ ملنے والا ہے۔'' یہ کلمات میرے قلب و روح تک شہد کی مانند اُترے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی، میں برجستہ بولا ''آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے آپ کی سمجھ نہیں آ رہی''۔ وہ مزاقانہ انداز میں بولے ''جی جی سمجھ آئی گی بھی کیوں محنت کا صلہ جو مل رہی ہے''..... یہ آ آ وہ آ آ آپ کیا کہہ رہے ہیں میں سمجھ نہیں رہا۔ عابد کی امی بولی ''تم جسکو اتنی مدت سے ڈھونڈ رہے ہو وہ ہماری ہی بیٹی ہے''..... ہیں۔ آ۔ وہ۔ یہ۔ آ۔ آ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ عابد کے ابو نے کہا ''ہاں یہ سچ ہے وہ لڑکی جس سے تم محبت کرتے ہو اور ڈھونڈتے پھرتے ہو وہ ہماری بیٹی ہے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ جب سے تم ہمارے گھر آنے جانے لگے ہو وہ یہاں نہیں رہی، وہ کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی اور ابھی چند دن پہلے واپس گھر آئی ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ تم جب بھی گھر آئے ہو وہ گھر نہیں ہوتی تھی''۔ یہ تمام باتیں میرے لئے خوشی کی تو تھیں ہی لیکن اسکے ساتھ ساتھ میرے دل میں تیر کی طرح لگیں۔ میں وہاں سے انکی باتوں کے دوران ہی اُٹھا اور نکل آیا۔ عابد کے والدین

کہہ رہے تھے کہ ''اب ہم تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔اُداسی ختم کرواوراب خوش ہوجاؤ''۔مگر میں ویسے ہی منہ بنائے وہاں سے چل دیا۔راستے میں کئی طرح کی خیالات آئے تقدیر نے یہ کس موڑ پہ لاکھڑا کیا ہے اس کا ملنا میرے لئے خوشی کی بات تو تھی ہی مگر کس جگہ ملنا یہ میرے لئے اس خوشی سے زیادہ شرم کی بات تھی۔شرم کے مارے میرا ان لوگوں کے سامنے جانے کو اب دل نہیں کررہا تھا۔پتہ نہیں ابھی تقدیر نے اور کیا کیا رنگ دکھلانے تھے۔یہ سارا دن میرا پہلے سے زیادہ بے چینی میں گزرا۔میں سوچ رہا تھا کہ میں ان لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔شام کو انکی طرف سے مجھے پیغام ملا کہ ہم سب کہیں جارہے ہیں اور رات کو آپ گھر آجانا۔پہلے بھی اکثر ایسا ہوتا تھا جب بھی وہ شہر سے باہر کہیں جاتے تو گھر کی تمام تر ذمہ داری مجھے سونپ دی جاتی۔انکا مجھے بلانا چونکہ حسبِ معمول تھا۔لہٰذا میں شرمسار منہ لئے رات کو انکے گھر پہنچ گیا۔میں دروازے پر پہنچا تو سب لوگ میرے ہی انتظار میں گھر کے باہر ہی کھڑے تھے۔حسبِ معمول گھر کی تمام تر ذمہ داری مجھے سونپی اور خود چلے گئے۔میں نے دروازہ کھولا اور گھر کے اندر داخل ہوگیا۔عین اسی وقت مجھے گھر میں کسی دوسرے بندے کی آہٹ سنائی دی اور یہ احساس ہوا کہ گھر میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔میں نے ڈرتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھائے تو جس کمرے میں مجھے آہٹ محسوس ہوئی تھی، میں اس کی طرف لپکا۔کمرے کے اندر مجھے کیا نظر آیا اور کیا نہیں نظر آیا اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں..... ''خدا اور محبت دونوں ہی ایک ہیں''.....اتنی دیر تک میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی نکل چکی تھی میں انہی قدموں بھاگ کر باہر آیا تو وہ سب جا چکے تھے۔میں پھر اس کا رُخ کیے بغیر باہر کے کمرے میں چلا گیا۔ایک گھر کے باہر والے کمرے کے اندر میں تھا اور اسی گھر کے اندر والے کمرے میں میری منزل۔میری محبت، میری تلاش اور میری محنت کا پھل تھا جو اب مجھے مل چکا تھا۔مگر اب اس کے ملنے کی خوشی سے زیادہ غم تھا۔اس گھر میں ساری رات تڑپ تڑپ کر گزاری، نہ جانے وہ میرے بارے میں جانتی تھی یا نہیں اور اسکے گھر والوں کا کیا ارادہ تھا۔مگر اس کو گھر میں اکیلے چھوڑ جانا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔رات کو میں نے آرام تو کیا کرنا تھا میرے رات جس طرح گزری اس کا اندازہ آپ اپنے ذہن سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔صبح ہوتے ہی میں اسے بغیر ملے اور اور کچھ بتائے وہاں سے نکل آیا۔میرے دل و دماغ میں اب ایک ہی بات تھی کہ اے اللہ یا مجھے کہیں ادھر سے دور بھیج دے کہ میں یہاں واپس نہ آؤں اور نہ کسی کو مل سکوں۔یا پھر دوسرا حل.....موت.....خودکشی !! جو میں نہ کرسکتا تھا۔کیونکہ شاید تقدیر کے فیصلے سننے کی عادت پڑ چکی تھی۔اور اب اسی کا انتظار تھا، گزری شبِ غم کی طرح سارا دن بھی اسی حال میں گزارا، کسی سے ملا، کسی سے بات کی اور نہ ہی کسی کو کچھ بتانا چاہتا تھا۔اسی اثناء میں یہ پہاڑ جیسا دن بھی گزر گیا۔میری طبیعت اس طرح ہورہی تھی جیسے کڑاہی میں دودھ آگ پر اُبل رہا ہو اور اُبل اُبل کر وہی سوکھ جائے۔میں بھی اندر ہی اندر ابل ابل کر سوکھ رہا تھا۔اور میری اجل دور کھڑی تماشا دیکھ دیکھ ہنس رہی تھی۔میں نہ جانتا تھا کہ یہ سب کیا ہے، رات کے بعد دن آیا، دن میں صبح، دوپہر، شام ہوئی اور پھر رات ہوچکی تھی۔نہ جانے مجھ پر کیا گزر رہی تھی اور کیا گزرنے والی تھی۔میں اگلی رات بھی پانی کے بغیر مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔رات تقریباً 2 سے 3 بجے کا وقت تھا تو مجھے عابد کے گھر سے بلاوا آیا۔اور یہ بلاوا بہت ہی ایمرجنسی کا تھا۔لہٰذا میں اور زیادہ پریشانی کے ساتھ وہاں پہنچا۔میں دروازے پر پہنچا تو اُس کے گھر والے مجھے

دروازے پر ہی ملے۔''سلمان بیٹا تمہارے لئے دو خبریں ہیں۔ایک خوشی کی اور ایک غم کی''۔یہ عابد کے ابو کی آواز تھی۔''بیٹا خوشی کی خبر تو یہ ہے کہ تمہاری مستقبل کی شریک حیات''.....شریک حیات.....؟ میں نے حیرانی سے پوچھا!! ''ہاں شریک حیات ہی۔کیونکہ ہم نے اس کی اور تمہاری شادی کا سوچ لیا تھا۔تقریباً رات کے گیارہ بجے اس کے سرکاری نوکری کے مستقل ہونے کے آرڈر ملے ہیں۔غم کی خبر یہ ہے کہ اس کے تقریباً تین گھنٹے بعد اس کی وَفات''.....''اب ڈھونڈا نہیں چراغِ رُخ زیبا لیکر''

سوچ رہا تھا کہ اب یہ زندگی کس کام کی، میرا جینا مرنا فضول ہے۔مگر مرے دل و دماغ نے ایک دوسری آہٹ کو دستک دی اور میرے قلب وجگر کو کُرید کر کہا کہ یہی زندگی ہے یہی محبت ہے اور صبر بھی، اور اسی کو امتحان کہتے ہیں۔مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہوا اور آگے کیا رنگ کھلے گا۔میری ہر پل موت کی آرزو پر بھی دل کو سکون نہ ہوا۔مگر گھر، گلی، محلے حتیٰ کہ بازار بھی مجھے سنسان لگ رہے تھے۔یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے چند منٹ کا قیامت خیز طوفان آیا اور پوری دنیا کو بہالے گیا۔اور اس کائنات میں بس میں اکیلا ہی مارے مارے پھر رہا ہوں، سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کررہا ہوں۔حقیقت تو یہ تھی کہ میں رہ بھی اکیلا ہی گیا تھا۔

میں ہر پل مرنے یا پاگل ہونے کی دعائیں کرتا پھرتا تھا۔چند دن گزرے تھے کہ عابد کے گھر والوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ''سلمان ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے تھے مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ہم نے تمہاری شادی کی ساری تیاری کررکھی تھی مگر تمہاری محبت تمہاری تقدیر میں نہ تھی۔اب ہم تمہاری شادی خود کرنا چاہتے ہیں۔تمہاری محبت کیلئے جو سامان بنایا تھا وہ بھی اب تمہارا ہے۔اپنے والدین سے مل کر کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کرو اس کا سارا خرچ ہم کریں گے، اور آپکی شادی پہلے کی طرح ہوگی''۔شاید عابد کے گھر والے سارا غم بھلا چکے تھے مگر میرے زخم پہلے دن کی طرح تازہ تھے۔میں کوئی خوشی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔گھر والوں اور دوسروں کے بہت زیادہ اصرار پر میں نہ چاہتے ہوئے راضی ہوا اور یوں میری شادی ہوئی۔

◂◂ ● ▸▸

House no. E,37 steem power station
Nishatabad Faisalabad(Pakistan)

اقبال حسن آزاد کے اولین افسانوی مجموعے
قطرہ قطرہ احساس
کا دوسرا ایڈیشن
عنقریب منظر عام پر
رابطہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر

● علیم اللہ علیمؔ

معرفت

کلیدی تختے پر رقص کرتی ہوئی اس کی انگلیاں رُک گئیں..فارہ ہاتھ میں تھامے وہ تظاہر کا بغور جائزہ لیتا رہا۔سکینڈ کے ایک کروڑویں حصے میں اس کا ذہن برقیا گیا۔اک نئی برنامج اس کے عصابی نظام کو متحرک کر گئی،مگر وہ ساکن بیٹھا بدستور تظاہر پر کچھ تلاش کرتا رہا۔شمارندہ کے روشن وشفاف پردے پر اسے حروف کے بجائے ''صفر ''اور''ایک'' کے ان گنت اعداد دکائی دینے لگے۔اس کی نگاہیں پردے پر مصنع لطیف کے بجائے برنامج کی ہدایات کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔برنامج کی یہ ہدایات ایک نئے''حکم نامے کا پیش خیمہ معلوم ہونے لگیں۔یہ حکم نامہ''دس احکامات''،''عہد نامہ جدید'' یا آیاتِ مقدسہ کی تفسیر کو اشاروں کی زبان میں بیاں کررہا تھا۔اس انکشاف پر وہ بھونچکا رہ گیا۔

وہ ایک سافٹ ویر انجنیئر تھا۔پروگرامنگ کے عمل کو بخوبی جانتا تھا۔اس نے سی سی این اے اور اتھیکل ہیاکنگ میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔اب وہ اس درجہ ماہر ہو چکا تھا کہ کسی بھی software[مصنع لطیف] کو دیکھتا تو اس کی programming[برنامج] تک پہنچ جاتا۔اس کی آنکھیں پس پردہ ہدایات کو پہچاننے لگی تھیں۔''صفر''اور''ایک'' کے ہندسے ہی اس کے روزگار کا زریعہ تھے اور وہ انہیں خوب پہچانتا تھا۔مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ یہ ہندسے اسے اتنا عظیم علم بخشیں گے کہ اس کی نظر معرفت تک پہنچ جائے گی۔وہ خود کو پالے گا اور اک لمحے میں خود کو کھو بیٹھے گا۔اس عمل کی وساطت سے خوشی وانبساط کا ایک لازوال اور کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن جائے گا۔

وہ سوچنے لگا کہ ورچول تکنالوجی {Virtual Technology} کے اس دور میں کیا خواب بھی ٹھوس حقیقت کا روپ اختیار کرلیں گے۔وہ حیرت میں ڈوبا سوچتا رہا کہ آج اس کی نظریں اتنی باریک بین کیسے ہوگئیں۔کیا وہ ہر چیز کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔''جو جیسا دکھائی دیتا ہے وہ ویسا نہیں ہوتا۔اگر ظاہر وہ باتن کا یہ فرق مٹ جائے تو کیا ہو!'' وہ یہی ہمیشہ سوچا کرتا۔جب پروگرامنگ میں مہارت حاصل کرلینے کے بعد وہ اس قابل ہوگیا کہ کسی بھی سافٹ ویر کی باطنی شکل اسے دیکھتے ہی سمجھ میں آنے لگی تو پھر اتھیکل ہیاکنگ کے دوران اس نے ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے انٹرنیٹ کے مواد کو ٹریسنگ کرنے کی طرف توجہ دی تو اس کے لئے تکنیکی

زبان اور عام زبان میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔وہ علم کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ کر موتی اُٹھالانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔مگر آج اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ اس قدر حیرت زدہ کردینے والا تھا کہ ساکت بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔اس کامیابی کی لذت سے سرشار وہ اپنی زندگی کی کتابِ ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔

اس نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔اسی ماحول میں اس کا بچپن گزرا۔وہ تعلیم کے میدان میں پوری لگن سے جمارہا۔پھر ایسا ہوا کہ جب سے اس نے ماکسزم کی طرف توجہ دی تھی تب سے اب تک وہ''صفر ''اور''ایک'' کے درمیان کھڑا رہا۔کبھی خودساختہ مذہبی اجارہ داروں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر خدا کا انکار کر بیٹھتا تو کبھی معصوم ومفلس عوام پر ہورہے مظالم اسے خدا کے وجود سے منکر بنادیتے۔کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اچانک کسی عظیم وعالی مرتبت قوت کے وجود کے احساس سے اس کا ذہن جگمگا اُٹھتا۔اس ادھیڑبن میں اس نے دنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا،برگزیدہ اور مقدس مانی جانے والی ہستیوں سے ملاقاتیں کیں۔ان میں سے کتنوں ہی کی اصلیت جان لینے کے بعد ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ان پر لعنت بھیجنے لگا مگر خدا کے وجود کو نہ پاسکا۔

اسے اس کے دوست دہریہ کہتے،طبیعت میں بغاوت کے عنصر کے بموجب اسے''ناستک''یا''دہریہ'' کہلانے میں بڑا لطف آتا

تھا۔اسی ضمن میں اس کے ایک استاد نے اسے perverted ذہن کا مالک بھی قرار دیا تھا۔وہ ان کی کم عقلی پر مسکرا کے رہ گیا اور اپنی تلاش جاری رکھی۔اس کی پیاس بڑھتی ہی جارہی تھی۔زندگی میں تمام مادی عیش وآرام کا سامان میسر ہونے کے باوجود کہیں کسی کمی کا احساس اس کے قلب میں جاگزیں تھا۔کمپیوٹر پر کام کرتے کرتے جب تھک جاتا تو ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کرلیتا اور حقیقی دنیا سے بے نیاز ہوکر اک ماورائی دنیا میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔وہاں بھی اسے مشینی زبان ہی دکھائی دیتی ان گنت''صفر''اور''ایک'' کے ہندسے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے۔انہیں وہ ترتیب دے کر ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا تھک ہار کر آنکھیں کھول دیتا۔کلیدی تختے پر پھر اس کی انگلیاں ورچول تکنالوجی کا کوئی پروگرام بُننے لگ جاتیں۔اک خلش جو دل میں تھی وہ کسی طرح مٹتی ہی نہیں! آج اسے سمجھ میں آرہا تھا کہ جب وہ خدا کا انکار کرتا تو اس کی زندگی کی پروگرامنگ میں ایک''صفر''{0} کا اندراج ہوجاتا اور جب اس کے وجود سے آشنائی کا اظہار کرتا تو اس کی زندگی کی پروگرامنگ میں عدد''ایک''{1} درج ہوجاتا۔اس طرح صرف اس کا روزگار ہی نہیں بلکہ اس کی ساری زندگی بھی'' صفر''اور''ایک'' سے عبارت تھی۔

کام سے فارغ اوقات میں اینتھروپالوجی کی کئی جلدیں مکمل کرلینے کے بعد اس نے ارشد محمود کی کتاب''تصورِ خدا'' کو مطالعے کے لئے منتخب کیا تھا۔یہ برقی کتاب ابھی اس کے کمپیوٹر کی اسکرین پر روشن تھی۔حالانکہ اس نے تین دن پہلے ہی اسے مکمل کرلیا تھا۔رات کے پونے تین بج چکے تھے نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اس کتاب کو مکمل کرلینے کے بعد سے اس کی یہی کیفیت تھی کہ نہ وہ ٹھیک سے کھارہا تھا نہ سوپارہا تھا۔اک مسلسل اضطراب کی کیفیت میں وہ گھرا ہوا تھا۔کبھی سوچتا کہ خدا کے وجود سے انکار کردے،کبھی سوچتا کہ

یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا کوئی خالق ہی نہ ہو۔ یہ کائنات، یہ زمان ومکاں کا نظام کسی عظیم ہستی کے بغیر کیسے وجود میں آسکتا ہے۔ ان تین دنوں میں جس شدت سے اس نے خدا کے وجود سے انکار کیا تھا اسی شدت سے اس کے اپنے اندر کسی شئے کی کمی کا احساس اُبھر رہا تھا۔ حالانکہ ان تین دنوں میں وہ مکمل طور پر خدا کے وجود سے انکار کر بیٹھا تھا۔

جب نیند آنے کے کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ اپنی پریشانی واضطراب کے باوجود کسی نامکمل پروجکٹ کو مکمل کرنے کی خاطر اپنے کمپیوٹر ٹیبل کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی کمپیوٹر بوٹ اَپ پروسس سے گزر کر کام کرنے کے قابل ہوا تو اس کی انگلیوں نے لاشعوری طور پر ڈیسک ٹاپ پر رکھی اسی کتاب ''تصورِ خدا'' کے آئی کان پر کلک کر دیا۔ اسی کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کی سوچ فیصلہ کن انداز میں متاثر ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا اک جھماکا سا ہوا۔ اسکرین پر بکھرے حروف گڈمڈ ہونے لگے پھر اسے صاف دکھائی دینے لگے ''صفر'' اور ''ایک'' کے ہندسے۔ ان دو ہندسوں سے اس کا دماغ کی اسکرین بھری ہوئی تھی اور لامحدود کائنات کے خالق کو گویا اس نے تلاش کرلیا تھا۔ اس کے دل نے آواز دی جسے وہ صاف طور پر سُن رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ پچھلے تین دنوں میں وہ خدا کے وجود کا منکر رہا اگر اسی عالم میں اس کی موت واقع ہوجاتی تو.....!۔ اس نے سوچا ہا اگر اس کی موت واقع ہوجاتی تو....تو وہ یقیناً بے ایمان کی موت ہوتی۔ اس کی زندگی کا حاصل صرف ''0'' صفر رہ جاتا۔ آج اس نے پہچان لیا تھا کہ صرف ''صفر'' سے کچھ نہیں بن پاتا ''ایک'' اگر اس کے ساتھ نہ ہو۔ وہ اس خیال سے بے حد مسرور ہوا اور اسی سرور کے عالم میں اس کا سارا وجود اس ''ایک'' کے آگے سجدۂ شکر میں جھک گیا۔ یہ ایک ایسا سجدہ تھا جس نے اسے تمام سجدوں سے نجات دلادی۔ جسے وہ گراں سمجھتا رہا وہی سجدہ اس کے لئے باعثِ رحمت بن گیا تھا۔ آج وہ حقیقی معنوں میں ''صفر'' اور ''ایک'' کی حقیقت سمجھ چکا تھا۔ اس نے اس ''ایک'' کو پالیا جس کے بغیر اس کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Lecturer in Urdu
Govt. DRM P.U College
J.C Extension
Harihar 577601
Davanagere Dist. Karnataka

● فرخندہ رضوی

دیوار

شام ڈھلتے ہی آسمان کی لاجوردی چادر بادلوں کے پردے میں چُھپ جاتی۔ سیاہ بادل مغرب کے کناروں سے اُٹھتے اور پل بھر میں ساون اُتر آتا۔ پھر موسلا دار بارش روئی کے گالوں کی طرح ہوا کے دوش پر اُڑنے لگتی۔ سبھی جانتے تھے کہ پہاڑی مقامات کا کیا بھروسہ۔ ایبٹ آباد کی خوبصورت شامیں سردی سے لپٹے سڑک کنارے اُگے درخت یوں سمٹے ہوتے

جیسے ابھی کسی سے لپٹنے کو بیقرار.....اُسے سب یاد تھا جب وہ اپنی سہلیوں کے ساتھ پہاڑوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی سکول سے واپس لوٹتی تو سردی سے ٹھٹھرتے ہاتھ سُرخ ہوتی ناک سے گھر داخل ہوتی تو ایمان خان اُسے مرچی کہہ کر چڑاتا، وہ منہ پھلائے گھر کے صحن تک چلی آتی۔ اور پھولی پھولی سانس سے اُس پر غصہ کرتی.....اور ایمان خان قہقہ لگاتا باہر نکل جاتا.....

گھر تو ایک تھا مگر درمیان میں ایک دیوار نے گھر کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اُسے تو اکثر لگتا صرف اِس دیوار نے گھر کو نہیں رشتوں کو بھی بانٹ رکھا ہے۔ ایک طرف یہ لوگ اور دوسری طرف اُسکے چچا کی فیملی رہتی تھی۔

اکثر ہی وہ اِس مٹی کی دیوار کا تذکرہ گھر کے بزرگوں سے کرتی تو کوئی معقول جواب نہ پا کر خاموش ہو جاتی۔

کائنات کے دو چھوٹے بھائی اور ایک بڑی بہن تھی کُچھ عمر کی چھوٹی اور کُچھ لاُبالی پن، گھر والے کسی بات میں اُسے شامل ہی کہاں کرتے مگر وہ بنیادی طور پر ایک ہمدرد لڑکی تھی۔ دُکھ وخوشی کے لمحوں کو فرق سے سمجھتی،

اُسکے چچا کے دو بیٹے تھے ایک تو ایمان خاں جو ساتھ رہتا تھا دوسرا بھائی جس کے ساتھ کائنات کی باجی کی شادی ہوئی تھی، وہ یہاں نہیں بلکہ انگلینڈ ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی بزرگوں کے حُکم اور رسم ورواج کی سولی چڑھائی گئی تھی۔

وجہ صرف یہ رہی کہ اُنکے خاندان اپنی برادری سے باہر شادیاں کرتے ہی نہیں۔ کبھی کبھی وہ اِس بات پر اُلجھ سی جاتی کہ باجی کی شادی تو ہوچکی مگر اُسکی باجی ابھی تک اِسی گھر میں کیوں رہتی ہے۔ جبکہ اُسکے محلے میں بہت سی لڑکیاں جو باجی کی سہیلیاں تھیں اُن کی شادی بھی ہوئی اور وہ یہاں سے اپنے سسرال چلی گئیں۔

اُسکی سمجھ اتنی کم بھی نہ تھی۔ اُس نے تو یہ بھی سُن رکھا تھا کہ چچا کا بیٹا تو رضامند ہی نہ تھا مگر گھر والوں کی ضد

اور رسم ورواج کے ہتھے چڑھ گیا.....۔

پھر ایسے ہی ایک دن باجی کو تانگے کے گھوڑے کی طرح جوت دیا گیا۔ جو نصیب لکھ دیئے جائیں کون بدل سکتا ہے۔ سُنا ہے مرد پیار کرنے کے بہت کچے ہوتے ہیں، باجی بھی سب جانتی تھی اُس نے تو خاموشی کی مہر لب پر لگا رکھی تھی۔ نہ اپنے سسرال والوں سے شکایت نہ اپنے ماں باپ سے.....جنہوں نے اتنے نازوں سے پال پوس کر اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔

جہاں وہ لوگ رہتے تھے۔ اور بھی اُنکے رشتہ دار وہاں آباد تھے۔ اُن میں اُسکی ایک دوست سلمٰی تھی جس سے ہر بات فراغدلی سے شیئر کرتی.....کئی دنوں سے یہی سوال اُسکے دل میں بے چینی پیدا کیے ہوئے تھا۔

مگر آج جب دونوں سکول سے واپس آرہی تھیں سویرا ضرورت سے زیادہ ہی چُپ چُپ تھی۔

''کائنات! کیا بات ہے کئی روز سے تُم کچھ اُلجھی اُلجھی ہو.....''

وہ تو جیسے اِسی انتظار میں تھی کہ کوئی آئے اور اِسکے دل کا بوجھ ہلکا کر دے۔

''ہاں سلمٰی! نہ جانے کیوں اندر کی اُداسیاں چہروں پر اُمنڈ آتی ہیں۔ دُکھ جب کروٹیں لینے لگتے ہیں تو بے چینیاں بڑھ جاتی ہیں۔ میں بھی ایک ایسی ہی پہیلی میں اُلجھی ہوئی ہوں.....جب رات کو سب سو جاتے ہیں تو اپنی باجی کے بستر سے مجھے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، وہ بہن جو دن بھر لبوں پہ مسکراہٹ سجائے سب کے کام کرتی رہتی ہے مگر رات کا اندھیرا بڑھتے ہی کتنی تنہا ہو جاتی.....''

''کائنات! بہت سی باتیں وقت ہی سمجھا جاتا ہے دُکھوں کو نام دینے کی ضرورت نہیں پڑتی'' وہ اُسکا مُنہ دیکھتے بولی.....

''تُم صرف یہ جاننا چاہتی ہو نا؟ تمھاری باجی کی شادی بھی ہوئی مگر دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے خاوند کے ساتھ اپنے گھر کیوں نہیں گئی۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' بہت بے چینی سے بولی

تب سلمٰی نے کائنات کو سب بتا دیا کہ اُسکے بہنوئی نے ایک شادی انگلینڈ میں بھی کر رکھی ہے.....پھر اُسے بھی سب سمجھ آ گیا.....اُس دن کے بعد سے اُسے چچا کا گھرانا اور بھی بُرا لگنے لگا.....چچی جو ہر وقت ناک پر غصہ لئے پھرتی.....باجی اُسکی گھر کا سارا کام کرتی وہ اُسے نوکر کی حیثیت سے زیادہ سمجھتی ہی کب تھی.....!

اور اُسکی بیٹیاں بھی عناب کے ساتھ اچھا سلوک روا نہ رکھ سکیں.....ہر وقت جلی کٹی سناتی رہتیں.....کوئی بھی اُنہیں منع نہ کرتا.....اندر ہی اندر عناب دُکھی ہوتی مگر ایک سہارا اُسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیتا.....وہ تھا ننھا مُنا عجب خان۔ جس نے اُسے جینے کا سہارا دے رکھا تھا.....ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ عجب خان.....کو اُسکے باپ نے دیکھا تک نہ تھا.....وہ تو شادی کے کچھ ہفتوں کے بعد واپس لوٹ گیا تھا.....

ماں باپ کبھی کبھی اتنے خودغرض ہو جاتے ہیں کہ مُعاملات کو سُلجھانے کے بجائے اپنے مفاد سامنے رکھے نا انصافیاں کرتے چلے جاتے ہیں.....نہ تو اُسکی چچی نے کوشش کی کہ اُنکا بیٹا اپنی بیوی کو پاس بُلا لے نہ ہی عناب نے اپنے

حق کے لئے احتجاج کیا.....بس وقت ہی گزرتا گیا.....

کائنات بھی عمر کے اِس حصے میں پہنچ گئی کہ گھر میں اُسکی شادی کا تذکرہ ہونے لگا۔ ایک دن وہ کالج سے لوٹی تو چچا اور چچی کی فیملی کو گھر اکٹھے جمع دیکھا۔ اُسے کچھ حیرانی ہوئی کیونکہ اِس دیوار کے اُس پار جو نفرتیں پَل رہی تھیں اُن سے وہ بخوبی واقف تھی مگر انہونی دیکھ کر چونکے بنا پھر بھی نہ رہی۔ پھر ایک عمارت گرنے کا اندازہ اُس وقت ہوا جب اُسے معلوم ہوا کہ کل اُسکا نکاح.....ایمان خان.....سے کیا جا رہا تھا.....وہ سب خاموشی سے سُنتی رہ گئی.....اُس گھر کی دہلیز پر ایک بہن سسکیاں لے رہی تھی.....شادی شُدہ ہو کر بھی اکیلے زندگی کا سفر طے کر رہی ہے.....اُسی گھر میں ایک اور بیٹی کو قربانی کیلئے تیار کیا جا رہا تھا.....سب کے چلے جانے کے بعد وہ بہت چیخی.....بہن کے آنسوؤں کی تپش سے سکو پگھلانے کی کوشش کی مگر بے سود .....

سب کا ایک ہی جواب تھا سب ٹھیک ہے مگر ہم اپنے بزرگوں کی روائیتوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر ایک دِن اُسے ایمان خان کی دُلہن بنا دیا گیا.....وہ کائنات.....جو ہر لمحہ ہرنی کی طرح چھلانگیں لگاتی اِدھر سے اُدھر اُترتی چڑھتی.....اُداس بلبل کی طرح ایک پیڑ کی شاخ پر چپک کر بیٹھ گئی.....اُسکے سامنے ویران ویران سے راستے رہ گے.....اُسے لگا آج انتہائی جاذب نظر پہاڑی سلسلے نظروں سے دُور ہوتے جا رہے ہوں.....

پھر وہ دِن بھی طلوع ہوا جس دن ایمان خان بھی سب کے ساتھ اُسے بھی چھوڑ کر دوسرے مُلک سدھار گیا.....وہ کسی سے کچھ نہ کہہ پائی.....

کچھ دن گزرنے کے بعد اُسکی باجی کو پوسٹ کے ذریعے ایک رجسٹری موصول ہوئی جِسے کھولتے ہی اس میں لکھے الفاظ اُسکا مُنہ چڑانے لگے۔

کیونکہ اُسکے خاوند نے اُسے آزاد کر دیا تھا.....اُسے پوچھے بنا.....اسے پہلے یہ خوشی تو تھی کہ کم از کم شادی شُدہ کا لقب تو تھا.....!!

آج طلاق نامہ بھیج کر اُس سے یہ بھی حق چھین لیا گیا۔ اتنا بڑا انقلاب آیا کسی نے دُکھ کا اظہار تک نہ کیا.....

پھر یہ کیسے اپنے تھے.....ایک دوسرے کی جھولی میں خوشیاں نہیں ڈال سکتے.....صرف رسمیں نبھانے کیلئے رشتوں کی لڑیاں دروازوں کی دہلیز پر باندھ رکھی ہیں آج کائنات کو اِس دیوار کا مطلب سمجھ میں آنے لگا۔

یہ تو صرف اینٹوں کی دیواریں ہیں جنہیں کبھی بھی گرایا جا سکتا ہے مگر ہمارے رسم ورواجات تو اِس دیوار سے بھی زیادہ پُختہ ہیں.....جنہیں شاید ہم کبھی بھی نہ گرا سکیں!!!

◀◀ ● ▶▶

▶ Reading England
farkhandarazvi@hotmail.co.uk

● شاہین کاظمی

میاں جی

بچپن کی ملائمت اورنرمی چہرے پراُگنے والے روئیں نے کم کردی تھی،اس کی جگہ ایک عجیب سی جاذبیت نے لے لی تھی گوکہ میاں جی نے اسے منع کیا تھا کہ ابھی استرا نہ مارے لیکن اسے چہرے پراُگا ہوا بے ترتیب جھاڑ جھنکار اچھا نہیں لگتا تھا،اپنے ایک دوست کی مدد سے اس روئیں سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں چہرے کو دو تین جگہ سے زخمی بھی کر بیٹھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میاں جی نے دل کھول کر ڈانٹا تھا، وہ خاموشی سے سر جھکا کر ڈانٹ سنتا رہا۔

": چلو جاؤ اور جو کہا جائے اسے سنا بھی کرو۔"

میاں جی سخت ناراض تھے۔

"جی میاں جی "اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

میاں جی اس چھوٹے سے گاؤں کی اکلوتی مسجد کے پیش امام،گاؤں کے لوگوں کے روحانی پیشوا، قاضی، استاد،طبیب اورغمگسار،سبھی کچھ تھے،سب بے جھجک انھیں اپنے مسائل اور دکھڑے سنایا کرتے،میاں جی مقدور بھر مدد کی کوشش بھی کرتے۔

ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ گاؤں والوں کی طرف سے مقررہ کردہ معمولی سی وظیفے کی رقم کے ساتھ ساتھ وہ تحائف تھے جو سال بھر انھیں گندم،اوردوسری اجناس کی صورت میں ملتے رہتے تھے،دودھ دہی اورلسّی کے علاوہ روزانہ تازہ پکا ہوا کھانا بھی اس وظیفے میں شامل تھا۔اب دو بندوں کے اخراجات ہوتے ہی کتنے ہیں،میاں جی اکثر اجناس یا تو اطراف کے گاؤں میں ضرورت مندوں میں بانٹ دیا کرتے،یا کبھی کبھار اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے فروخت کر دیا کر دیتے تھے۔گاؤں کے بچوں بچیوں کو قران پاک پڑھانا،غمی خوشی کے وقت دعائیں دینا اور جھگڑے نبٹانا میاں جی فرائض میں شامل تھا،جسے وہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے تھے۔

دو سال کے بن ماں کے بچے کو کندھے سے لگائے میاں جی آج سے تیرہ سال قبل اس گاؤں میں آئے تھے اور ایک کمرے پر مشتمل اس کچی مسجد میں پہلی بار اذان دے کر خود ہی نماز پڑھی تھی،اس کے بعد گاؤں والوں نے انھیں کہیں جانے نہ دیا۔وہ کون تھے کہاں سے آئے تھے نہ کسی نے کبھی جاننے کی کوشش اور نہ ہی میاں جی نے بتانے کی جیسے ایک خاموش معاہدہ سا ہو،اس عرصے میں نہ تو میاں جی سے کوئی ملنے آیا اور نہ ہی وہ کہیں گئے،ان کی بڑے سے بڑی تفریح کسی قریبی گاؤں کی چوپال میں شمولیت ہوا کرتی تھی، ان کی معاملہ فہمی،تدبر اور متحمل مزاجی کی وجہ سے آس پاس کے تمام گاؤں میں ان کی بہت عزت تھی۔

سعید پندرہ سال کا ہو چکا تھا،اس کی خوبصورت اٹھان، پرکشش خدوخال اسے گاؤں کے باقی لڑکوں میں نمایاں کرتے تھے۔گاؤں کی بچیوں اور بچوں کے ساتھ مسجد کے کچے صحن میں ہل ہل کر زور زور سے سپارہ پڑھتے ہوئے وقت کتنی تیزی سے گذرا اسے اندازہ ہی نہ ہوا،چلچلاتی دوپہروں میں باغوں کے گھنے سائے میں چرائے گئے پھل کھانا اور غلیل سے گرمی سے گبھرا کر گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپے پرندوں کو تاک تاک کر نشانہ لگانا،نہر کے پانی میں شرطیں باندھ کر غوطے لگانا جیسے خواب سا ہو گیا تھا۔

میاں جی نے اسے قریبی قصبے کے کالج میں داخلہ کیا دلوایا وہ اپنے گاؤں سے جیسے لاتعلق سا ہو کر رہ گیا۔ شام ڈھلے سائیکل پر جب وہ چار میل کا سفر کر کے گھر آتا تو جوڑ جوڑ درد سے پھٹ رہا ہوتا تھا۔نمازیں بھی نہایت بے دلی سے پڑھتا اور سر شام ہی لمبی تان کر سو رہتا۔

اس دن رانو میاں جی کے لئے کھیر لائی تھی۔وہ بھی اس کی ہم عمر تھی۔سرخ لان کے سوٹ میں اس کا رنگ کھلا پڑ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں بسا ہوا کاجل، ڈوبتے سورج کی زرد شعاعوں نے اس گالوں کو جیسے دہکا دیا تھا،کھیر کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے غیرارادی طور پر اس کی انگلیاں رانو کے ہاتھ سے مس ہو گئی تھیں۔اسے لگا جیسے اس نے بجلی کی ننگی تاروں کو چھو لیا ہو۔سانسیں سینے میں اٹکنے سی لگیں۔جسم میں دوڑتی سنسنی....اسے کوٹھڑی تک آنا مشکل ہو گیا تھا۔وہ تو شکر ہوا کہ میاں جی مغرب کی نماز کے لئے وضو کر رہے تھے۔اس نے جلدی سے پیالہ اندر رکھا اور اذان کے لئے مسجد کی طرف چل پڑا۔

اس کے لئے یہ تجربہ بہت انوکھا اور پریشان کن تھا۔اسی رانو سے ہزار بار جھگڑا ہوا تھا۔وہ قرآن پڑھنے میں سب سے تیز تھی۔میاں جی کا ایک بار کا بتایا ہوا سبق اسے کبھی نہیں بھولا تھا،جبکہ اس نے اور باقی بچوں نے بارہا میاں جی سے چھڑیاں کھائی تھیں،اسی لئے سب رانو سے چڑتے اور اسے رٹّو طوطا اور میاں جی کی چمچی کہا کرتے تھے سعید نے اسے کبھی بھی کسی کی بات پر غصہ ہوتا نہیں دیکھا تھا،ایسے ظاہر کرتی تھی جیسے اس نے کوئی بات سنی ہی نہ ہو اور یہ بات باقی بچوں کو مزید چڑانے کے لئے کافی تھی۔

سعید کی کبھی بھی رانو سے نہیں بنی تھی وہ اسے بہت بری لگتی تھی میاں جی اس کا سبق سن کر اسے باقی بچوں کا سبق سننے کو کہا کرتے تھے اور اس وقت وہ دل کھول کر اپنا سارا غصہ نکالا کرتی تھی،معمولی سی غلطی پر میاں جی سے شکایت لگا دیتی،سعید نے اس کی وجہ سے بارہا میاں جی مار کھائی تھی۔

آج جو کچھ ہوا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھا،کہیں بہت اندر جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

" کیا بات ہے سعید سب ٹھیک ہے نا؟" میاں جی نے اس کی خاموشی بھانپ لی تھی۔

وہ ایک دم چونک گیا۔

" جی میاں جی۔ وہ آہستگی سے بولا۔

" اتنے چپ کیوں ہو؟" وہ مطمئن نہ ہو سکے

" سر میں درد ہے۔" اسے اور کوئی بہانہ نہ سوجھا۔

دھوپ کی وجہ سے ہوگا۔ کچی لسی بناتا ہوں۔ پی لینا آرام آ جائے گا'' میاں جی کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔

''یہ لو'' وہ بڑا سا گلاس اسے تھماتے ہوئے بولے۔ ''پی لو، انشاءاللہ آرام آ جائے گا۔''

''میاں جی۔'' وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میں خود بنا لیتا۔''

''کیوں میرے ہاتھ کی پسند نہیں ہے کیا؟'' وہ ہلکا سا مسکرائے اور کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماردی۔

''چلو اب پی لو'' انہوں نے بہت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

آتے جاتے اکثر اس کی ملاقات رانو سے ہو جاتی، وقت کے ماہر ہاتھوں نے رانو کے ہونٹوں پر گلاب دھکا دیئے تھے، گال لود ینے لگے تھے اور اٹھتی جھکتی لانبی پلکیں دل میں ترازو ہوئی جاتی تھیں، سعید اسے دیکھتے ہی جیسے بن پیئے بہکنے لگتا تھا۔

وہ انٹر کر چکا تھا اور میاں جی کی مار کھا کھا کر پندرہ سپارے بھی حفظ کر لئے تھے، قصبے میں واحد کالج صرف انٹر تک تھا، میاں جی اسے شہر بھیجنے کا سوچ رہے تھے۔

"پر میاں جی میں وہاں رہوں گا کس کے پاس" اسے میاں جی کا یہ آئیڈیا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"دوسرا میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔''

اس نے میاں جی کو صاف جواب سنا دیا۔

"جانا تو پڑے گا میرے بچے کہ اور کوئی حل ہے نہیں" میاں جی اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے میں نہیں چاہتا تم میری طرح یہاں مسجد میں ہی زندگی گذار دو، خدا کی دنیا بہت وسیع اور خوبصورت ہے، اور تمہیں بہت پڑھنا ہے میں نے ملک صاحب کو خط لکھا ہے وہ تمہارے رہنے سہنے کا انتظام کروا دیں گے۔

" کون ملک صاحب"؟ سعید نے آج پہلی بار میاں جی منہ سے کوئی نام سنا تھا۔

"ہیں ایک مہربان، اچھے وقتوں کے دوست ہیں۔"

لیکن وقت نے میاں جی کو مہلت نہیں دی۔ رات سوئے تو اتنی گہری نیند کہ پھر نیند ٹوٹ ہی نہ سکی سعید کو اس صدمے نے ہلا کر رکھ دیا، ابھی تو اس نے چلنا ہی سیکھا تھا کہ میاں جی نے اسے تنہا کر دیا، اس کی کیفیت اس ننھے بچے کی سی جو بھرے میلے میں اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا بیٹھے، چاروں طرف اجنبی چہرے، انجان لوگ، وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا لیکن آنکھیں جیسے بنجر ہو گئی تھیں، گاؤں کے لوگوں نے بہت محبت سے اس کے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش کی، دھیرے دھیرے اسے بھی قرار آتا گیا، میاں جی کے چالیسویں کے بعد اسے میاں جی کی گدی سونپ دی گئی اور اٹھارہ سال کی عمر میں وہ سعید سے میاں جی بن گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک گیا سامنے رانو کھڑی تھی۔

میاں جی یہ امّاں نے بھیجا ہے "اس کے لہجے میں وہی عزت اور احترام تھا جو کبھی میاں جی کے لئے ہوا کرتا تھا، وہ کپڑے سے ڈھکا ہوا ڈونگا سعید کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے میاں جی کیوں کہتی ہو؟'' سعید کے لہجے میں الجھن تھی۔

"تو اور کیا کہوں آپ میاں جی ہی تو ہیں "اس کی آواز میں شوخی تھی۔

سعید نے نظر بھر کر اسے دیکھا گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں اس کی رنگت کھلی پڑ رہی تھی بھرے بھرے ہونٹوں پر تھرکتی مسکان اور آنکھ کا کاجل سعید کا ایمان لوٹنے کو کافی تھے۔

"اچھا اب تم جاؤ" سعید نے ڈونگا پکڑ لیا۔

اسے اپنے سینے میں مچلتے دل سے خوف آنے لگا تھا کمبخت قابو سے باہر ہوا جاتا تھا۔

وقت جیسے تھم سا گیا تھا دن تو ہنگاموں کی نذر ہو جاتا لیکن رات ساری وحشتیں لئے پہلو میں آن بیٹھتی، بلبکی انتہائی مدھم سی روشنی میں دیواروں پر ناچتے سائے جیسے زندہ ہو جاتے اور اپنی نوکیلی انگلیوں اور تیز دھار ناخنوں سے اسے نوچنے لگتے، وہ ہر رات تنہائی کے ان خوفناک بھوتو سے لڑتے لڑتے گذار دیتا اور دن وہی سارے ان چاہے ہنگام ساتھ لے کر آتا وہ اکتانے لگا۔

ایسے میں رانو کا خیال جیسے واحد سہارا تھا وہ اپنی تمام تر خوبصورتیوں سمیت جب تصور میں وارد ہوتی تو وہ کچی کوٹھڑی کسی شیش محل میں تبدیل ہو جاتی، مریل روشنی والا مدقوق بلب چودھویں کے چاند کی سحر آگین روشنی لٹانے لگتا، کچی بدرنگ دیواروں پر ہزاروں رنگ جھلملانے لگتے اور سعید رانو کا ہاتھ تھامے خواب وادیوں میں اتر جاتا جہاں جھرنوں کا مترنم پانی الفت کے سرمدی سر چھیڑ دیتا، فضاؤں میں غنائیت سی گھل جاتی، ہوا رقص کرنے لگتی، کلیوں کے نازک لبوں پر چنچل مسکان بکھر جاتی اور مخملیں سبزے پر تھرکتی چاندنی بیخود ہو کر اپنے بلوریں جام بھر بھر کر محبت کرنے والی روحوں کو چاہت کی مے بانٹنے لگتی، تشنگی مٹنے لگتی اور روح بے خود ہو کر عشق کے در پر دھمال ڈالنے لگتی۔

اس کے پور پور میں اکتاہٹ اتر آئی تھی، انتہائی بے دلی سے نمازیں بھی ادا کرتا، معمولی غلطی پر قرآن پڑھنے کے لئے آنے والے بچوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا اور بعد میں انھیں بہلاتے ہوئے خود بھی سسک پڑتا، وہ اس ماحول سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن کہاں؟ یہ سوال اس کے قدموں میں زنجیر ڈال دیتا، اس کی تعلیم کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا، دن رات مسجد کے حجرے میں پڑا رہتا، اسے لگتا شاید وہ بھی انھی کچی دیواروں کا حصہ ہے بھدا، بدرنگ اور کھردرا، اپنی اس بیزاری کی وجہ سمجھنے سے وہ خود بھی قاصر تھا، اسے مسجد اور اس کے خاموش ماحول سے وحشت ہوتی تھی، عجیب مفلوج کر دینے والی یاسیت تھی، بے نام اداسی، اسے لگتا تھا وہ پاگل ہو جائے گا،

اس دن بڑے چوہدری صاحب تشریف لائے۔

میاں جی میں دیکھ رہا ہوں بڑے میاں جی موت کے بعد آپ بہت تنہا ہو گئے ہیں میری مانیں تو شادی کر لیں "انہوں نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"شادی "سعید نے ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

" جی میاں جی "اگر کوئی لڑکی ہو نظر میں تو بتا دیں نہیں تو میں اپنے طور پر بات چلاتا ہوں"

" میں وہ، آپ۔'' سعید گھبرا سا گیا۔

"بھاگ بھری کی بیٹی رانو کے بارے میں کیا خیال ہے؟، بہت سگھڑ لڑکی ہے بہت خوش رہیں گے آپ

اس کے ساتھ "چودھری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

سعید کولگا دل پسلیاں توڑ کر ابھی باہر نکل آئے گا، اسے سینے میں سانسیں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"آپ نے جواب نہیں دیا " چودھری جی نے دوبارہ پوچھا"

" آپ کی مرضی چودھری جی جو چاہیں کریں "سعید نے سارا معاملہ ان پر ڈال دیا۔

" ٹھیک ہے میاں جی میں بات کرتا ہوں انھیں بہت خوشی ہوگی اس رشتے سے "چودھری جی مصافحہ کر کے باہر نکل گئے۔

سعید کے اندر ہلچل مچ گئی تھی، وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے رانو کی مرضی جاننا چاہتا تھا۔

شام کو جب وہ کھانا لے کر آئی تو سعید نے اسے روک لیا۔

"رانو ایک بات پوچھوں؟ "اس نے بہت جھکتے ہوئے کہا۔

"جی میاں جی ضرور "

"مجھ سے شادی کروگی "سعید کی آواز کپکپا رہی تھی۔

رانو ایک دم چپ ھوگئی۔

کیا ہوا؟" تم نے جواب نہیں دیا"

"میاں جی مجھے ہر گھر کا پکا ہوا کھانا اچھا نہیں لگتا "رانو کی آواز بہت دھیمی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Arnegger strasse,10
9204,Andwil SG, Switzerland

کوہ نور فاؤنڈیشن، مونگیر کی فخریہ پیشکش
انگریزی، عربی، اردو اور ہندی چہار لسانی لغت
نظامی لغت
عنقریب منظر عام پر
مرتب
نظام الدین قاسمی
رابطہ: کوہ نور فاؤنڈیشن، توپ خانہ بازار، مونگیر ۸۱۱۲۰۱

● میکسم گورکی

میدانوں میں

ہم نے پیری کوپ کو طبیعت کے انتہائی چڑچڑے پن اور بدترین صورت حال کے تحت یعنی جنگلی بھیڑیوں کی طرح گرسنہ اور تمام دنیا سے متنفر خیر باد کہا تھا مکمل بارہ گھنٹے ہم نے اس کوشش میں صرف کر دیئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح..... جائز یا ناجائز طریقے، چوری کے ذریعے یا خود کما کر پیٹ پوجا کا سامان کریں، مگر جب ہمیں اس امر کا پورا یقین ہوگیا کہ ہم اپنے مقصد میں کسی طرح کامیاب نہیں ہوسکتے، تو ہم نے آگے بڑھنے کا قصد کیا.....کدھر؟.....بس ذرا آگئے!

یہ فیصلہ اتفاق آراء سے منظور ہوگیا۔ اب ہم زندگی کی اس شاہراہ پر جس پر ہم ایک مدت سے گامزن تھے سفر کرنے کو تیار تھے۔ اس امر کا فیصلہ بالکل خاموشی میں ہوا۔ اگر اس فیصلے کو کوئی چیز نمایاں طور پر ظاہر کرنے والی تھی تو ہماری گرسنہ آنکھوں کی خشم ناک چمک تھی۔

ہماری جماعت تین افراد پر مشتمل تھی۔ جن کی شناسائی کو ابھی بہت مدت نہ گذری تھی۔ ہماری دوستی دریائے نیپر کے کنارے خرسون کی ایک سرائے میں واقع ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک ریلوے پولیس میں سپاہی رہا تھا اور اس کے بعد پولیستان میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا یہ شخص بہت تنومند اور جسیم تھا اور بال سرخ..... جرمن زبان بول سکتا تھا اور قید خانے کی اندرونی زندگی سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

ہماری قسم کے لوگ اپنی زندگی کے گذشتہ حالات پر روشنی ڈالنے کے خیال کو بہت برا تصور کرتے ہیں، بعض ناگزیر وجوہ کے باعث ہمیشہ خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں اس کا کامل یقین تھا کہ ہمارے ہر ساتھی کے ساتھ ایک نہ ایک تلخ حکایت ضرور وابستہ ہے مگر ہم نے ان سے اس داستان کے بارے میں کبھی استفسار نہ کیا تھا۔

جب ہمارے ایک ساتھی نے ہمیں بتایا کہ وہ ماسکو یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا ہے تو ہمیں اس کی بات کا یقین ہوگیا۔ دراصل ہمارے لئے یہ چیز کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی کہ وہ گذشتہ ایام میں چور تھا یا سپاہی۔ قابل ذکر بات تو یہ تھی کہ وہ جب ہم سے ملا، بالکل ہم جیسا تھا، اور ہماری طرح پولیس اور دیہات والوں میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور وہ جواب میں ان سب کو ایک تعاقب زدہ بھوکے درندے کی طرح افسردہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا .....قصہ کوتاہ ان خیالات اور موجودہ حالات کی رو سے وہ ہم میں سے ایک تھا۔

مشترکہ مصائب، متضاد طبائع میں اتحاد پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں اور ہمیں اس کا پورا یقین تھا کہ ہم

مصیبت زدہ ہیں۔ تیسرا میں تھا..... اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے جو بچپن سے میری خصوصیت رہی ہے، میں اپنی صفات کا تذکرہ بے سود سمجھتا ہوں۔ میری عادات و خصائل پر روشنی ڈالنے کے لئے بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میں اپنے آپ کو اوروں سے ہمیشہ اچھا اور اعلیٰ سمجھتا رہا ہوں..... اور آج بھی میرا یہی عقیدہ ہے۔

ان حالات کے تحت ہم پیری کوپ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے ہمارا اولین مقصد کسی گڈریئے کا دروازہ کھٹکھٹا کر روٹی مانگنا تھا۔ یہ لوگ عموماً کسی جہاں گرد سائل کو مایوس لوٹنے نہیں دیتے۔

میں اور سپاہی پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ طالب علم ہمارے پیچھے آ رہا تھا جس کے کاندھوں پر کوئی کپڑا سا لٹک رہا تھا، جس نے کبھی جیکٹ کا کام دیا ہوگا۔ ایک بوسیدہ اور چوڑے کنارے والی ٹوپی اس کے بدوضع سر کی زینت ہو رہی تھی، پتلی ٹانگوں کو ایک پرانی پیوند زدہ پتلون چھپا رہی تھی اور پاؤں میں کسی ٹوٹے ہوئے بوٹ کے تلوے، جو غالباً کسی سڑک پر سے اٹھائے تھے، ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے..... اس اختراع کو وہ چپلیوں کے نام سے پکارتا تھا۔ وہ سڑک پر گرد اڑاتا اور اپنی چھوٹی چھوٹی سبزی مائل آنکھیں جھپکاتا، خاموشی کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

سپاہی ایک سرخ قمیص پہنے ہوئے تھا جو بقول اس کے اس نے خود اپنی محنت کے پیسوں سے فرسون میں خریدی تھی۔ اس قمیض پر ایک گرم اور نرم سی واسکٹ نظر آ رہی تھی۔ ٹانگوں پر ایک کھلا پاجامہ لپٹا ہوا تھا سر پر اس نے ایک فوجی ٹوپی ترچھے انداز میں پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بوٹ وغیرہ کچھ بھی نہیں تھے۔

میں نے کپڑے تو پہنے ہوئے تھے مگر ننگے پاؤں تھا۔

ہم چلتے رہے..... ہمارے چاروں طرف میدان تھا جس میں گھاس اگ رہی تھی، وہ موسم گرما کے نیلگوں آسمان کے نیچے بڑھتے گئے..... کہیں کہیں کٹی ہوئی فصل کے نشانات بھی دکھائی دے رہے تھے، جو بعینہ سپاہی کے نہ منڈے ہوئے گالوں کے مانند تھے۔

وہ بھدی اور کن سڑی آواز میں ایک مذہبی گیت گانے میں مصروف تھا۔ دوران ملازمت میں وہ کسی گرجے میں نوکر بھی رہ چکا تھا اس لئے لازمی طور پر اسے بے شمار مذہبی گیت زبانی یاد تھے۔ اور ہم سے دوران گفتگو اکثر اس قسم کی معلومات کا بے جا تذکرہ بھی کیا کرتا تھا۔

اب ہمارے سامنے افق پر دھندلی سی لکیریں نمودار ہو رہی تھیں جن کا رنگ بنفشی سے ہلکا زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''یہ کریمیا کی پہاڑیاں ہیں'' طالب علم نے اپنی پھٹی آواز میں کہا' پہاڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔''

سپاہی نے طنزیہ لہجے میں اس سے کہا'' بہت تیز نظر ہے تمہاری، یہ تو بادل ہیں، محض بادل! اور بادل بھی کیسے، جیسے انناس کا مربہ دودھ میں بھیگ رہا ہے!''

''آہ، کاش یہ واقعی مربہ ہوتے!! اس تشبیہ نے میری بھوک پر تازیانے کا کام کیا۔''

''خدا کی قسم''! سپاہی نے جھلا کر کہا'' کاش ہمیں کوئی انسان مل جائے!..... مگر یہاں تو کسی کا نام و نشان تک بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں بھی موسم سرما کے ریچھ کی طرح اپنے پنجے چوس کر گذارہ کرنا ہوگا!''

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمیں آبادی کا رخ کرنا چاہئے'' طالب علم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''تم نے کہا تھا!..... یہ تمہارا ہی حصہ تھا، تعلیم یافتہ جو ٹھہرے تم!..... مگر کہاں ہیں وہ آباد مقامات جن کا تم ذکر کر رہے ہو'' سپاہی طالب علم پر برس پڑا۔

طالب علم نے جواب میں اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیئے۔ اور خاموش ہو گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ بادل رنگا رنگ کے لباس بدل رہے تھے۔ شورے اور مٹی کی خوشبو نے ہماری بھوک کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اور ایک ناخوشگوار سی لہر بدن میں دوڑ رہی تھی۔ منہ اور حلق خشک ہو گیا تھا دماغ سخت پریشانی میں گرفتار تھا۔ سر چکرانے لگا اور عجیب قسم کے سیاہ دھبے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ یہ دھبے کبھی گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑوں کی اور کبھی روٹیوں کی شکل اختیار کر لیتے..... ذہن نے ان کی یاد تازہ کر دی اور یہ اصل معلوم ہونے لگے، حتیٰ کہ ان کی خوشبو تک بھی آنے لگی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی پیٹ میں نوکیلا خنجر گھونپ رہا ہے۔ لیکن اب اس اذیت کے باوصف ہم بھیڑوں کے نشانات دیکھنے اور کسی پھلوں سے لدے ہوئے چھکڑے کے پہیوں کی آواز سننے کے لئے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے اور کان کھولے چلتے رہے..... مگر میدان خاموش اور سنسان تھا۔

اس پُر تکان سے پیشتر شام کو ہم سب نے صرف دو سیر کچی روٹی اور پانچ تربوز کھائے تھے، ہمیں کوئی چالیس میل کے قریب چلنا پڑا تھا۔ خرچ آمدن کی نسبت زیادہ تھا۔ ہم مارکیٹ میں سو رہے تھے کہ ہمیں بھوک نے آ جگایا۔

طالب علم نے ہم سے کہا تھا کہ رات کو سونے کی بجائے کام کرنا چاہئے اور رہی دوسری بات کہ کسی کی ملکیت پر ڈاکہ ڈالنا، سو وہ معاشرہ کے اصولوں کے خلاف ہے، اس لئے میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میری خواہش انصاف کرنے کی ہے۔ میں یا وہ کوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے اس مہذب زمانے میں لوگ بہت شائستہ اور نرم دل ہوتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اگر کسی پڑوسی کا گلا بھی کاٹنا ہو تو موقع کی مصلحت دیکھ کر یہ کام بھی نہایت سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ میرے اپنے گلے کے تجربے نے اخلاق اور تہذیب کے اس ارتقا کو میرے سامنے واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے۔ اور میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی ہر شے روبہ ترقی ہے..... شراب خانوں، عصمت فروشی کی دوکانوں اور زندانوں کی تعداد میں سالانہ اضافہ اس ترقی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

چنانچہ اس طرح ہم اپنا لعاب دہن نگلتے اور آپس میں دوستانہ گفتگو کرتے ہوئے، تاکہ کسی حیلے ہمارے پیٹ کا درد کم ہو جائے اس سنسان میدان میں بڑھتے گئے۔ دل میں ایک موہوم امید لئے ہوئے سرخ شفق کی طرح چلتے گئے!

ہمارے سامنے سورج ان بادلوں کے پیچھے جن پر اس کی شعاعیں زرنگاری کا کام کر رہی تھیں، غروب ہو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے چاروں طرف رات کی سیاہی افق کی وسعت کو تنگ کرتی ہوئی پھیل رہی تھی۔

''آگ جلانے کے لئے کچھ ایندھن تو اکٹھا کرو'' سپاہی نے دفعتاً زمین پر سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا'' ہمیں آج کی رات میدان ہی میں کاٹنا پڑے گی..... اوس خوب پڑے گی، خشک گوبر اور درختوں کی ٹہنیاں الاؤ کے لئے ٹھیک رہیں گی؟''

ہم سڑک کے دونوں طرف بکھر گئے اور سوکھی گھاس اور ہر چیز جو مل سکتی تھی اکٹھا کرنی شروع کر دی۔ ہر مرتبہ

جب ہمیں زمین پر جھکنا پڑتا۔ ہمارے بدن میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوتی کہ زمین پر گر پڑیں اور مٹی کھانے کے لئے خاموش لیٹ جائیں.....سیاہ اور چکنی مٹی کھاتے رہیں۔ حتیٰ کہ اور کچھ نہ کھا سکیں اور پھر اسی حالت میں سو جائیں خواہ یہ نیند ابدی نیند ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس سے پیشتر کچھ کھائیں ضرور.....کوئی سی غذا کوئی گرم گرم کھانا حلق سے اتر کر تلملاتے ہوئے اور بھوکے پیٹ میں پہنچ جائے.....اس معدے میں جو کسی چیز کو ہضم کرنے کی خواہش میں بیتاب ہوا جا رہا تھا۔

''کاش ہمیں کوئی جڑ ہی مل جاتی'' سپاہی نے آہ بھر کر کہا ''ایسی جڑیں بھی تو ہوتی ہیں جو غذا کا کام دے سکتی ہیں.....جن کو ہم کھا سکتے ہیں!''

مگر اس سیاہ اور ہل کی ہوئی زمین میں جڑوں کا نام ونشان تک نہ تھا.....اب جنوبی ممالک کی رات تیزی سے شفق پر غلبہ حاصل کر رہی تھی۔ سورج کی آخری شعاعیں ابھی غائب ہی ہوئی تھیں کہ تاریک اور نیلگوں آسمان میں تارے چمکنے لگے۔ آہستہ آہستہ رات کی سیاہی میدان کی وسعت کو تنگ بتاتی ہوئی بڑھتی گئی۔

''بھائی، ہمارے بائیں طرف ایک آدمی لیٹا ہوا ہے!'' طالب علم نے سپاہی سے آہستگی کے لہجے میں کہا۔

''آدمی!'' سپاہی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ''آخر وہ یہاں کیوں لیٹ رہا ہے؟

''جاؤ اس سے خود دریافت کر لو.....اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ جبھی تو اس طرح میدان میں پڑا ہے۔'' طالب علم نے جواب دیا۔

سپاہی تھوکنے کے بعد ایک عزم سے بولا ''تو چلو آؤ اس کے پاس چلیں''

صرف طالب علم کی تیز نگاہیں ہی تاریکی میں سڑک کی دوسری طرف کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک آدمی کو جو سیاہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا پہچان سکتی تھیں۔ ہم ہل کی ہوئی زمین میں مٹی کے ڈھیلوں پر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ کھانا حاصل کرنے کی اس نئی امید نے ہماری بھوک کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا تھا۔ ہم اس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ مگر وہ بے حرکت پڑا تھا۔

''شاید یہ انسان نہیں ہے'' سپاہی نے ہم سب کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے مایوسانہ انداز میں کہا۔ مگر فوراً ہمارے اندیشے غلط ثابت ہو گئے کیونکہ اس ڈھیر میں جو زمین پر پڑا تھا ایک جنبش ہوئی اور اس نے اٹھنا چاہا۔ اب ہم نے دیکھا کہ وہ واقعی انسان ہے جو گھٹنوں پر بیٹھا ہے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

''میرے نزدیک نہ آنا ورنہ میں گولی چلا دوں گا'' ہم نے اسے بھدی اور لرزاں آواز میں یہ کہتے سنا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں لبلبی اٹھنے کی تیز آواز گونجی۔

ہم یکا یک ٹھہر گئے جیسے کسی نے حکم دیا ہے۔ کچھ عرصے تک ہم اس ناخوشگوار خیر مقدم سے حیرت زدہ ہو کر خاموش کھڑے رہے۔

''بدمعاش!'' سپاہی نے معنی خیز انداز میں زیر لب کہا۔

''ہوں، پستول لئے سفر کرتا ہے.....یہ تو منہ کا نوالہ معلوم نہیں ہوتا'' طالب علم نے دانشمندانہ لہجے میں کہا۔

''او میاں!''.....ظاہر تھا کہ ہمارے رفیق سپاہی نے ضرور کوئی تدبیر سوچ لی ہے۔ اس شخص نے کروٹ نہ

بدلی اور پہلے کی طرح خاموش رہا۔

''اے میاں، دیکھو ہم تم کو بالکل نقصان نہ پہنچائیں گے۔ بس ہمیں کچھ کھانے کے لئے دے دو۔ تمہارے پاس روٹی وغیرہ ضرور ہوگی، بھائی ہمیں کچھ کھانے کے لئے دے دو۔ تمہیں مسیح کا واسطہ ہے.....لعنت ہو تم پر..... شیطان!'' آخری الفاظ سپاہی نے اپنی ڈاڑھی کے اندر منہ ڈال کر آہستگی سے کہے.....وہ شخص خاموش رہا۔

''کیا سن بھی رہے ہو کہ نہیں؟'' سپاہی نے بیچارگی اور غصے میں کانپتے ہوئے پھر التجا کی ''ہمیں کچھ دو..... پھینک ہی دو، ہم تمہارے نزدیک نہ آئیں گے!''

اگر اس نے ہمیں دلی خلوص سے ''میرے عزیز بھائیو'' کہہ کر پکارا ہوتا۔ اور تین لفظوں میں جذبات کا تمام تقدس بھر دیا ہوتا۔ تو وہ ہم پر اس قدر اثر انداز نہ ہوتے جتنا یہ غیر مہذبانہ، درشت اور خشک ''اچھا' اثر انداز ہوا۔

''نیک آدمی، ہم سے خوف زدہ مت ہو'' سپاہی نے اپنے چہرے کو متبسم کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ شخص تاریکی میں پچاس قدم کے فاصلے پر بیٹھا ہوا اس کے اس تبسم کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ ''ہم امن پسند لوگ ہیں۔ روس سے کیو بن جا رہے ہیں۔ ہمارا سب روپیہ راستے میں خرچ ہو گیا ہے۔ ہم سب کھا پی بیٹھے ہیں۔ اب ہمیں فاقے سے دوسرا دن گذر رہا ہے!''

''لو، پکڑو'' ہمارے محسن نے ہوا میں اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی ایک سیاہ سی چیز ہل کی ہوئی زمین پر ہمارے نزدیک ہی آ گری۔ طالب علم اس کو پکڑنے کے لئے لپکا۔

''لو اور پکڑو.....یہ رہی.....بس اب میرے پاس ختم ہو چکی ہے۔''

جب طالب علم نے ان عجیب وغریب تحائف کو اکٹھا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سیاہ روٹی کے چند خشک ٹکڑے تھے۔ جن کا مجموعی وزن کوئی دو سیر کے قریب ہوگا۔ یہ مٹی سے لت پت ہو رہے تھے۔ مگر یہ بات ہمارے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی.....خشک روٹی عموماً زیادہ تسکین دہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اس میں تازہ روٹی کی نسبت نمی کم ہوتی ہے۔

''یہ لو تم اور یہ لو تم اور یہ میرے لئے'' سپاہی نے بڑی احتیاط سے سب کو روٹی کا حصہ دیتے ہوئے کہا..... مگر ابھی حصے برابر نہیں ہوئے۔ اس لئے ''پروفیسر صاحب'' مجھے آپ کے ٹکڑے سے کچھ حصہ کاٹنا پڑے گا ورنہ یہ دوسرے کے حق میں سراسر ناانصافی ہوگی!''

طالب علم کو مجبوراً اپنے حصے سے ایک ٹکڑا دینا پڑا۔ جو وزن میں ایک اونس کے دسویں حصے کے برابر تھا۔

میں نے اپنا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔ اور آہستہ آہستہ چبانا شروع کیا ساتھ ہی میں اپنے جبڑوں کی قدرتی حرکت روکنے کی بے سود سعی کر رہا تھا جو اس وقت پتھروں کو چبانے کے لئے تیار تھے، مجھے اپنے نرخرے میں ایک تشنجی حرکت کے احساس اور ایسے چھوٹے چھوٹے لقموں سے آہستہ آہستہ رفع کرنے کی کوشش میں ایک عجیب قسم کی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ گرم اور ناقابل بیان طور پر ذائقہ دار اور شیریں، اس روٹی کے ٹکڑے لقمہ بہ لقمہ حلق سے اتر کر جلتے ہوئے پیٹ میں پہونچتے ہی خون اور گوشت میں تبدیل ہوتے معلوم ہوتے تھے۔

میرا دل ایک ایسی ناقابل بیان اور حیات بخش مسرت سے معمور تھا جو اس روٹی کی نسبت کے لحاظ سے کہیں

زیادہ تھی۔ میں فاقہ کشی کے تکلیف دہ ایام کو بالکل بھول گیا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن سے اپنے دوستوں کی یاد بھی محو ہوگئی اس لئے کہ میں ان مسرت افزا خیالات میں غرق تھا جو اس وقت میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔

لیکن جب میں نے اپنی ہتھیلی سے روٹی کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالا تو میں نے محسوس کیا کہ میری بھوک اور بھی تیز ہوگئی ہے۔

''اس آدمی کے پاس اور کچھ بھی ضرور ہوگا.....لعنت ہو اس پر!'' سپاہی نے جو زمین پر بیٹھا اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہا

''ضرور ہوگا.....روٹی میں سے گوشت کی بو آ رہی تھی'' طالب علم نے جواب دیا اور پھر ساتھ ہی دبی زبان میں کہا'' کاش اس کے پاس پستول نہ ہوتی ورنہ.....''

''مگر یہ ہے کون؟''

''ظاہر ہے کہ ہم ایسا کوئی بھلا مانس ہوگا''

''ناپاک کتا!'' سپاہی نے فیصلہ کر دیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے اپنے محسن کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جو پستول ہاتھ میں لئے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی طرف سے کسی قسم کی آواز ہمیں سنائی نہ دے رہی تھی۔

رات کی تاریک قوتیں رہی سہی روشنی پر غالب آ گئیں۔ میدان پر قبر کی خاموشی طاری تھی۔ اس سکوت میں ہم ایک دوسرے کے سانس کی آواز بخوبی سن سکتے تھے۔ کبھی کبھی بجو کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ سنائی دیتی تھی۔ ستارے آسمان کے چمن کے زندہ پھول، ہمارے سروں کے اوپر چمک رہے تھے..... ہماری اس وقت صرف ایک خواہش تھی کہ کچھ کھائیں!

میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس شب میری حالت میرے اتفاقیہ رفیقوں سے نہ تو بری تھی اور نہ اچھی۔ آخر کار میں نے یہ تجویز پیش کی: ہمیں اٹھ کر اس شخص کے پاس جانا چاہئے مگر بغیر کوئی نقصان پہنچائے اس سے کھانے کا سامان لے لینا چاہئے۔ اگر وہ فائر کرتا ہے تو کر لے! وہ زیادہ سے زیادہ ہم میں سے صرف ایک کو نشانہ بنا لے گا، جو چنداں ممکن نہیں اور اگر بفرض محال اس کی گولی کسی ایک کو لگ بھی گئی تو عموماً پستول کا چھرہ مہلک زخم نہیں کرتا۔

''تو چلو پھر'' سپاہی نے کود کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ طالب علم کوشش کے باوجود بڑی آہستگی سے اٹھا۔ ہم دوڑ کر اس شخص کی جانب بڑھے۔ طالب علم ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

''محترم رفیق'' سپاہی نے طنزاً چلا کے پکارا

ہمارا استقبال ایک زیر لب گنگناہٹ سے ہوا۔ پھر ساتھ ہی.....لبلبی دبنے کی آواز گونجی اور شعلہ بلند ہوا۔ اور گولی ہمارے کانوں کے قریب سے سنسناتی ہوئی گذر گئی۔

''نشانہ خطا گیا'' سپاہی فرط مسرت سے چلا اٹھا اور ایک ہی جست میں سے اسے جا لیا۔ ''ٹھیر بے شیطان' اب چکھائے دیتا ہوں تجھے مزا.....''

طالب علم اس کے تھیلے کی طرف لپکا مگر وہ شیطان ایک دم پیٹھ کے بل زمین پر لوٹ گیا۔ اور ہاتھ پھیلا کر ہانپنا شروع کر دیا۔

''ابے کیا ہو گیا تجھے؟ سپاہی نے حیران ہوتے ہوئے کہا'' او.....ابے.....کچھ سن رہا ہے کہ نہیں؟.....کیا تو نے اپنے آپ کو گولی تو نہیں مار لی؟''

''یہ رہا گوشت، ٹکیاں اور روٹی.....کافی مقدار ہے بھائیو' طالب علم نے خوش ہو کر بلند آواز میں کہا۔

''تو جاؤ مرو، جہنم میں جاؤ، آؤ دوستو، ہم کھانا کھائیں'' سپاہی چلایا

میں نے اس شخص کے ہاتھ سے پستول لے لی۔ اب اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ اور خاموش پڑا تھا۔ پستول میں صرف ایک کارتوس اور باقی تھا۔

ہم اب پھر خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے۔ اور وہ شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس وقت ہم اس کی موجودگی سے بالکل غافل تھے۔

''بھائیو، کیا تم نے یہ سب کچھ واقعی اس روٹی کے لئے کیا ہے؟'' ایک لرزاں اور پھٹی ہوئی بھدی آواز نے یک لخت ہم سے کہا۔ ہم چونک پڑے طالب علم کھانستا ہوا زمین کی طرف جھک گیا۔ سپاہی نے اپنے منہ کا لقمہ نگلتے ہوئے اس شخص کو بے طرح سنانی شروع کر دی:

''او کتے کی روح.....خدا کرے تیرا بدن خشک لکڑی کے چھلکے کی طرح پھوٹ پھوٹ پڑے۔ کیا تو یہ خیال کرتا تھا کہ ہم تیری کھال ادھیڑنا چاہتے ہیں؟ تیری چمڑی ہمارے کس کام کی.....ملعون، پاجی، کمینے!.....پستول لئے لوگوں پر گولیاں چلاتا ہے.....شیطان کہیں کا!''

سپاہی اس دوران میں ساتھ ساتھ کھاتا بھی جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی گالیوں کا پورا زور شور بہت حد تک دب گیا تھا،

''ٹھیر جا' ہم کھانا کھانے کے بعد تجھ سے نپٹ لیں گے!'' طالب علم نے اسے دھمکایا۔

اس پر سسکیوں اور آہ و زاری کی آواز رات کے سکوت میں پھیل گئی ہم ڈر گئے۔''

''بھائیو، مجھے معلوم نہ تھا۔ میں ڈر گیا تھا۔ چنانچہ میں نے فائر کر دیا۔ میں نیوایتھوس سے سمانسک جا رہا ہوں.....آہ میرے خدا! جونہی آفتاب غروب ہونے لگتا ہے، مجھے بخار چڑھ جاتا ہے.....میری تیرہ بختی! اس بخار کے علاج کرانے کی خاطر ہی میں نے ایتھوس کو خیر باد کہا تھا..... میں وہاں بڑھئی کا کام کرتا تھا..... میں بڑھئی ہوں.....میری ایک بیوی اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں۔ جن سے جدا ہوئے مجھے.....قریب قریب چار سال گذر چکے ہیں..... بھائیو، تم سب کچھ کھا لو.....''

''کوئی فکر نہ کر، ہم تیرے کہنے کے بغیر ہی سب کچھ کھا لیں گے'' طالب علم نے اس سے کہا۔

''آہ' میرے پروردگار! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ امن پسند اور رحمدل ہو تو میں کبھی گولی نہ چلاتا..... جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار یہ دشت نما میدان ہے اور پھر تاریکی میں سوجھ کیا سکتا ہے..... مجھے معاف کر دو، بھائیو، میری خطا

معاف کردو!'' وہ بول رہا تھا اور ساتھ رو بھی رہا تھا۔ اس کی رونی آواز لرزاں اور دہشت آفریں تھی۔

''بس بس اب چلاؤ نہیں'' سپاہی نے حقارت سے کہا

''اس کے پاس کچھ نقدی بھی ضروری ہوگی!'' طالب علم نے قیافہ لگایا۔

سپاہی نے اپنی آنکھیں نیم بند کرلیں۔ طالب علم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا'' تم تو نجومی ہو..... چلو، اب آگ جلا کر سو رہیں!''

''اور اس کو یہیں پڑا رہنے دیں؟ طالب علم نے سپاہی سے دریافت کیا۔

''جہنم میں جائے..... کیا ہم اسے بھون کھائیں؟''

''ہے تو اسی کا مستحق! طالب علم نے اپنا نوکیلا سر ہلایا

ہم اپنا اکٹھا کیا ہوا ایندھن، جو بڑھئی کی دھمکی سے ہمارے ہاتھوں سے گر پڑا تھا۔ اٹھانے کے لئے روانہ ہوئے۔ منتشر لکڑیوں کو جمع کرنے کے فوراً بعد ہم آگ جلا کر اس کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ آگ خاموش اور پر سکون رات میں ہمارے آس پاس کی کچھ جگہ کو روشن کرتی ہوئی آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ ہم پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہم ایک دفعہ اور کچھ کھانے کے لئے تیار تھے۔

''بھائیو'' بڑھئی نے کہا وہ ہم سے کوئی تین قدم کے فاصلے پر لیٹا تھا کبھی کبھی اس گنگناہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔''

''کیوں' کیا ہے؟'' سپاہی نے درشت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''کیا میں تمہارے پاس آگ تاپنے کے لئے آسکتا ہوں؟..... مجھے اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی تھی..... میرے جوڑ جوڑ میں شدت کا درد ہے..... آہ، خدا! میں کبھی گھر نہ پہنچ سکوں گا!''

''ادھر سرک آؤ۔'' طالب علم نے اسے اجازت دے دی۔

بڑھئی آہستہ آہستہ رینگتا ہوا آگ کے پاس آ گیا وہ اس انداز سے اپنے بدن کو حرکت دے رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا: اسے اپنے اعضا کے ٹوٹنے کا خدشہ ہے وہ دراز قد مگر بہت نحیف تھا۔ اس کا ہر عضو ارتعاش پذیر تھا۔ اور اس کی دھندلی آنکھوں سے درد و کرب کے آثار مترشح تھے۔ جو اسے اندر ہی اندر ہلکان کر رہا تھا اس کا افلاس زدہ چہرہ ہمارے الاؤ کی روشنی میں لاش کا سا یہ زرد، مٹیالا اور ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ یہ ارتعاش ہمارے دل میں نفرت آمیز ہمدردی کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ استخوانی ہاتھوں کو آگ کی جانب بڑھا کر ان کو آپس میں رگڑتے وقت اس کی انگلیوں کے جوڑ چٹخ رہے تھے۔ قصہ مختصر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا جا سکتا تھا۔

''تم نے ایسی حالت میں پیدل سفر کیوں اختیار کیا..... ہائے، کنجوسی!'' سپاہی نے اس سے دریافت کیا۔

''انہوں نے مجھے منع کیا تھا..... کہ سمندر کے راستے نہ جاؤ، صلاح دی تھی، کے خشکی کے راستے کریمیا ہوتا ہوا جاؤں..... مگر بھائیو، میں اپنا سفر اب جاری نہیں رکھ سکتا..... میں مر رہا ہوں..... میں اس میدان میں تن تنہا مر جاؤں گا پرندے میری نعش کو نوچ لیں گے..... کسی کو خبر تک نہ ہوگی..... میری بیوی اور میری لڑکیاں میری منتظر ہوں گی.....

میں انہیں خط لکھ چکا ہوں..... اس میدان میں بارش میری ہڈیاں بہا کر لے جائے گی..... آہ میرے پروردگار!..... میرے پروردگار!!''

اس کی آواز کسی زخمی بھیڑیئے کی دردناک چیخ یا پکار کے مانند تھی۔

''آہ، شیطان!'' سپاہی نے جست کر کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔'' یہ بک بک کس لئے لگا رکھی ہے تم نے۔ کیا تم ہمیں ایک لمحہ چین بھی لینے دو گے یا نہیں..... مرنا چاہتے ہو تو مر جاؤ مگر خدا کے لئے ذرا خاموش رہو..... تمہاری ضرورت بھی کس کو ہے؟..... اب خاموش ہی رہنا۔''

''سر پر ایک دھول نہیں جما دیتے!'' طالب علم نے سپاہی کو صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''چلو اب سو جائیں'' میں نے کہا'' اور رہے تم! اگر آگ تاپنا چاہتے ہو تو خدا کے لئے زبان منہ میں ہی رکھنا۔''

''سن رہے ہو؟'' سپاہی نے بڑھئی سے غصے میں دریافت کیا'' یہ خیال دماغ سے نکال دو کہ ہم تم پر ترس کھا کر تمہاری تیمارداری کریں گے۔ اس لئے کہ تم نے ہمیں روٹی کا ٹکڑا دیا تھا اور ہم پر فائر کیا تھا۔ تم مکمل شیطان ہو..... یہ کام کوئی اور ہی کرے گا۔''

سپاہی نے اور کچھ نہ کہا اور اپنے آپ کو زمین پر دراز کر دیا۔ طالب علم پہلے ہی سے لیٹا ہوا تھا۔ میں بھی لیٹ گیا۔ خوفزدہ بڑھئی جسم کو سکیڑتے ہوئے الاؤ کی طرف بڑھا۔ اور آگ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ میں اس کے داہنے پہلو میں لیٹا اس کے دانتوں کی رگڑ کی آواز کو سن رہا تھا۔ طالب علم اس کے بائیں طرف سکڑا ہوا تھا اور غالباً لیٹتے ہی سو گیا تھا، ۔ سپاہی اپنے سر کو ہاتھوں کا سہارا دیئے آسمان کو تک رہا تھا۔

''کیسی سہانی رات ہے، کس قدر ستارے چمک رہے ہیں'' تھوڑے عرصے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا'' دیکھو ایک لحاف کی طرح معلوم ہوتا ہے..... جہاں نوردی کی اس زندگی کو میں واقعی پسند کرتا ہوں..... گو ایسی زندگی میں سردی کی شدت اور فاقہ کشی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ مگر آزادی تو ہے..... تمہارا کوئی آقا نہیں اپنے کا روکردار کے تم خود مالک ہو..... اگر اپنا سر بھی چاٹنا چاہو تو تمہیں کوئی روکنے والا نہیں..... یہ زندگی خوشگوار ہے!..... ایام فاقہ کشی نے میری طبیعت کو بگاڑ دیا تھا..... مگر اب میں یہاں لیٹا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ستارے جھلملا رہے ہیں۔ جیسا کہ وہ مجھ سے کہنا چاہتے ہیں، لیکوتن، کچھ پروانہ کرو، جاؤ، سیاحت کرتے رہو مگر خیال رہے کسی کی غلامی قبول نہ کرنا..... دل کس قدر مسرور ہے!''..... میاں بڑھئی کہو، تمہارا کیا حال ہے..... بھئی خفا مت ہونا ہم سے۔ اگر ہم نے تمہاری روٹی کھالی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟ تمہارے پاس کچھ کھانے کو تھا اور ہم بھوکے تھے، چنانچہ ہم نے اسے کھا لیا..... مگر تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ تم نے ہم پر گولی چلائی تھی..... تمہاری اس حرکت نے مجھے سخت برانگیختہ کر دیا تھا اور اگر تم خود بخود زمین پر نہ گر پڑتے تو میں تمہیں اس گستاخی کا مزا چکھا دیتا..... روٹی کا افسوس نہ کرو۔ پیری کوپ پہونچ کر تم کھانا خرید سکتے ہو..... مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس نقدی ضرور موجود ہے..... کب سے بخار آرہا ہے تمہیں؟''

ایک عرصے تک سپاہی کی بھدی اور کرخت آواز اور بڑھئی کی لرزاں گنگناہٹ میرے کانوں میں گونجتی

رہی۔ رات..... جواب کاجل کی طرح سیاہ تھی، زمین پر اپنی پوری تاریکیوں کے ساتھ نیچے اتر رہی تھی۔ میرے سینے کو فضا کی بھینی بھینی خوشبو فرحت بخش رہی تھی۔ آگ کی ہلکی روشنی اور اس کی گرمی جان بخش تھی..... میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

''اٹھو، جلدی کر..... چلو چلیں!''

میں گھبرا کر اٹھا اور سپاہی کی مدد سے جو مجھے آستین پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا فوراً کھڑا ہوا۔

''چلو، اب تیزی سے قدم بڑھاؤ!''

اس کے چہرے سے گھبراہٹ ہویدا تھی۔ میں نے اپنے گردوپیش نگاہ دوڑائی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی ایک گلابی کرن بڑھئی کے ساکت اور مردہ چہرے پر پڑ رہی تھی..... اس کا منہ کھلا تھا، اس کی آنکھیں جو باہر کو ابھری ہوئی تھیں ایک بے نور اور دہشت زدہ صورت میں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اس کا کرتہ چھاتی کے مقام سے پھٹا ہوا تھا۔ اور وہ ایک غیر فطری انداز میں زمین پر اینٹھا پڑا تھا۔

''بہت دیکھ چکے، چلو اب، میں کہتا ہوں اب چلو!'' سپاہی نے میرا بازو کھینچ کر چلنے کو کہا۔

''کیا یہ مر چکا ہے؟'' میں نے صبح کی ناخوشگوار تازگی اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں، مر چکا ہے، اگر تمہارا گلا گھونٹ دیا جاتا تو یقیناً تم بھی مر جاتے۔''

''تو کیا، یہ..... یہ طالب علم نے تو نہیں کیا؟'' میں چلا اٹھا۔

''اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ کیا تم نے یا میں نے اس کو مارا ہے پھر؟..... یہ ہے پڑھے لکھوں کا حال..... اس نے اس کو بڑی چالاکی سے ہلاک کر دیا ہے اور اپنے دوستوں کو آفت میں پھنسا کر چلتا بنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ایسا غدار ثابت ہوگا۔ تو کل ہی میں نے ایک ہی ضرب سے اس کا کام تمام کر دیا ہوتا..... کنپٹی پر ایک گھونسہ جماتا اور دنیا سے ایک رذیل اور بدکردار شخص ہمیشہ کے لئے کم ہو جاتا..... کیوں اب سمجھے کچھ کہ اس نے کیا کر دیا ہے؟ اب بہتر یہی ہے کہ یہاں سے بھاگ چلیں، پیشتر اس کے کہ ہمیں کوئی اس میدان میں دیکھ لے..... سمجھے کچھ؟ بہت جلد انہیں بڑھئی کی لاش مل جائے گی، اور وہ قاتل کے سراغ میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور ہم ایسے آوارہ گردوں کو پکڑ کر طرح طرح کے سوالات پوچھیں گے، گو میں اور تم بالکل بے گناہ ہی ہیں..... یہ اور مصیبت ہے کہ اس کی پستول میری جیب میں پڑی ہے۔''

''پھینک دو اسے، پھینک دو!'' میں نے اسے صلاح دی۔

''پھینک دوں؟'' سپاہی نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا'' وہ کیوں؟ یہ تو قیمتی چیز ہے۔ شاید ہم بچ نکلیں! نہیں میں تو اسے ہرگز نہ پھینکوں گا..... اس کی قیمت تین روبل کے قریب ہوگی..... یہ کون معلوم کر سکتا ہے کہ اس بے چارہ کے پاس کوئی ہتھیار بھی تھا یا نہیں..... اس میں ایک گولی بھی ہے..... آہ! میں گولی اپنے اس دغا باز دوست کے دماغ میں اتارنے کے لئے کس قدر بے قرار ہوں!..... خدا معلوم وہ اس بے چارے کا کتنا روپیہ لے بھاگا ہے؟..... لعنت ہو اس پر!!''

اور بیچارے بڑھئی کی لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا؟'' میں نے سپاہی سے کہا۔

''لڑکیاں؟..... کس کی لڑکیاں؟ ہاں، بڑھئی کی..... کیوں، وہ جوان ہو جائیں گی۔ اور ہم سے تو وہ شادی کرنے سے رہیں..... ہم ان کے متعلق کیوں فکر کریں چلو، بھائی، اب چلیں..... مگر جائیں کس طرف!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بہت دور ایک سیاہ پہاڑی کے اوپر سورج چمک رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو کہ وہ زندہ تو نہیں ہو گیا۔؟ بے خوف رہو، اب وہ اٹھ کر ہمارا پیچھا نہ کرے..... یہ اپنے کام کا پورا ماہر معلوم ہوتا ہے، دیکھو تو اس نے اس غریب کو کس طرح سرد کیا ہے..... کیسا شاندار رفیق تھا! اس نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا ہے..... آہ! اب اخلاق روز بروز روبہ تنزل ہے لوگ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔'' سپاہی نے غمگین لہجے میں کہا۔

خاموش اور سنسان میدان سورج کی روشنی سے معمور تھا جو ہمارے گردوپیش، افق پر آسمان کی نیلاہٹ کے ساتھ اس دلنواز انداز میں تحلیل ہو رہی تھی کہ اس وقت تمام سیاہ کاریاں اور غیر منصفانہ کام میدان کی اس عظیم الشان سادگی اور وسعت میں آسمان کے نیلے گنبد کے نیچے بالکل ناممکن معلوم ہوتے تھے۔

''بھائی، مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے!'' میرے ساتھی نے ہاتھ سے سگریٹ بناتے ہوئے کہا۔

''مگر سوال ہے کہ ہم کھائیں گے کیا اور کہاں اور کب کھائیں گے!''

یہی حل طلب چیز تھی..... ایک معما!

یہاں تک پہنچ کر ہسپتال میں اس شخص نے میرے ساتھ والے جو بستر پر لیٹا ہوا تھا اپنا قصہ یوں ختم کر دیا۔

یہ داستان کا خاتمہ ہے..... میں اور سپاہی گہرے دوست بن گئے۔ ہم دونوں نے کارس کے علاقے تک ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ وہ ایک رحمدل اور تجربہ کار آدمی تھا۔ میری نظروں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ ایشیائے کوچک پہنچ کر ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''کیا تمہیں وہ بڑھئی اب بھی یاد آتا ہے؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آپ نے دیکھا ہے بلکہ جیسا آپ نے سنا ہے!''

''اور کچھ نہیں۔ کسی قسم کا احساس بھی نہیں؟''

اس پر وہ ہنسنے لگا۔

''مجھے اس واقعے کے متعلق کس طرح احساس ہو؟ بڑھئی پر جو کچھ گذرا، اس کا میں ذمہ دار نہیں اور مجھ پر جو کچھ گذرا اس کے آپ ذمہ دار نہیں اور سچ تو یہ ہے کسی چیز کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں..... اس لئے کہ ہم سب یکساں ہیں، یعنی درندے۔''

◀◀ ● ▶▶

● مشرف عالم ذوقی

اُڑنے دوذرا

(ناول کا ایک باب)

اپنے بیٹے عکاشہ
کے لئے

جس نے
کسی انجان لمحے
مجھے اس ناول کا موضوع دے دیا

اڑنا ہے تو اڑو..... کس نے روکا ہے.....
مگر.....
رچرڈ باکے ناول..... جو ناتھن سی گل کو بھول گئے.....
جو ناتھن.....؟
ہاں..... بیچارا، ننھا سی گل.....
اس نے بھی تو اڑان بھری تھی.....
ایک ننھی اڑان.....
لیکن اسے آؤٹ کاسٹ کردیا گیا.....
مجھے نہیں آؤٹ کاسٹ کیا جائے گا.....
اور نہ ہی کوئی میری اڑان کے پر، کترسکے گا.....
میں اپنی اڑان کے لئے کوئی دائرہ متعین نہیں کروں گا/
میں تمہارے سماج کی پرواہ بھی نہیں کروں گا.....
بس اڑنا ہے مجھے.....
اڑنا ہے..... تو اڑنا ہے.....
اور اس اڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے.....
اور ہاں .....
کس نے کہہ دیا.....
کہ آدمی 50کا ہوجائے..... تو اسے اڑنا نہیں چاہئے.....
مجھے تو بس اڑنا ہے.....
آگے پیچھے کے تمام دائروں کو توڑتے ہوئے.....
میرا بیٹا اڑسکتا ہے.....
تو میں کیوں نہیں۔؟
صرف اس لئے کہ اس کا باپ ہوں۔؟

باپ : ایک مونتاژ

نئی صدی کی کہانی بھی نئی ہوگی — یہاں پرانے اور بوڑھے لفظ نہیں ہوں گے۔
نئی صدی میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ آزادی کی تعریف بھی —
یہاں آزادی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ یہاں بے قابو ہو جانا ہی زندگی کی علامت ہے —

●

یہاں کرداروں کے نام گم ہیں/
صرف رشتے رہ گئے ہیں/

●

"کتنی آزمائشیں.....
هر بار ایک پرانی جنگ کو ٹالتے ہوئے ایک نئی جنگ
دھیمی رفتار سے بڑھتی بیماریوں کی سرگوشیاں /
هر سال ایک نئے سال کے انتظار میں /
وهی ایک باسی اور پرانا سال
جهاں کچھ بھی بدلتا نهیں هے /
هر نیا دن /
پرانے دنوں کی طرح گرد و غبار میں ڈوبا / اُداس سا /
کیا یه جینے کی سزا هے /
یا هم کهیں نه کهیں اصل زندگی کو تلاش کرنے میں بھی /
ابھی بھی غلطی کر رهے هیں /
شاید....."

●

بیٹے کی دنیا پزا اور برگر کی دنیا تھی جبکہ باپ کو اب تک چاول اور روٹی ہی پسند تھے۔ لیکن باپ اب چور دروازے سے پزا اور برگر کی دنیا کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اور اس کے بعد ہی باپ کی زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہوا تھا —

●

''اچھا بولو، کیا بدلا ہے —؟'' باپ ہمیشہ کی طرح مطمئن تھا۔
''بہت کچھ —'' یہ اس کا دوست تھا — ''یا شاید کچھ بھی نہیں بدلا —''
''بدلا ہے۔''
''جیسے —؟''

''یہ دنیا..... یہ زمانہ..... اور میرا شیونگ کٹس..... بچپن میں میرے باپ پتہ نہیں داڑھیاں بناتے ہوئے کتنی دقتوں کا سامنا کرتے تھے..... پانی گرم کراؤ..... ایک بڑا سا بلیڈ..... جس سے داڑھی بناتے ہوئے ہر بار چہرے پر خراش پڑ جاتی تھی یا جلد چھل جاتی تھی۔ پھر شیونگ کریم کی جگہ شیونگ صابن ہوا کرتا تھا۔ گول سے نیلے ڈبّے میں..... اور شیو کرنے کے بعد ایک برف کے شکل والی واہیات سی پھٹکری.....''

تب دنیا اتنی کھلی نہیں تھی.....
تب دنیا نے اتنی تیز رفتاری سے اڑنا نہیں سیکھا تھا.....
مگر آہستہ آہستہ دنیا اڑنے لگی تھی.....
اور باپ شاید دوسروں سے کہیں زیادہ اپنے مشاہدے سے اڑنے کے تماشے دیکھ رہا تھا.....
اس لئے وہ مطمئن تھا.....
کیوں کہ اسے بھی دنیا کے ساتھ ساتھ ہی اڑنا تھا۔ دوسروں سے یا وقت سے بہت پیچھے رہ جانے کا احساس بھی کہیں نہ کہیں اسے ڈستا ہے..... لیکن باپ جانتا تھا۔ ہر بار ایک دنیا کو ہم بہت پیچھے چھوڑ کر آتے ہیں.....
یا..... آگے بڑھتے ہوئے ہر بار ایک دنیا کو بہت پیچھے چھوڑنا ہوتا ہے.....
یا..... جو وقت کے ساتھ نہیں ہوتے۔ وہ زندگی بھر اپنی دنیاؤں سے چپکے ہوئے روتے رہتے ہیں.....
اس لئے باپ اڑنا چاہتا تھا..... ٹھیک ویسے ہی جیسے اس کا بیٹا اڑ سکتا تھا..... یا اڑ رہا تھا.....
باپ الٹی بیس بال ٹوپی پہن کر بیٹے کی نقل کرنا چاہتا تھا۔
یا جیسے باپ بھی کندھے، پیٹھ یا بانہوں کی پھڑکتی مچھلیوں میں بیٹے کی طرح گودنے گدوا کر اس تکلیف یا خوشی کا احساس کرنا چاہتا تھا، جس سے نئی عمر کا بیٹا دوچار تھا۔
اور شاید باپ کو اپنے ہی کمپیٹیشن میں دیکھ کر بیٹا ہنس دیتا تھا۔
''تم میری نقل کر رہے ہو.....؟''
''نہیں —''
''کر رہے ہو ڈیڈ.....''
''اور تم کس کی نقل کر رہے ہو.....؟''
بیٹا گڑبڑا جاتا —
باپ مسکرا دیتا۔ ''ان لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کی، جنہوں نے تم سے پہلے الٹی ٹوپی پہنی یا گودنے گدوائے.....''
''ہاں.....''
''یا مہنگی برانڈیڈ جینس کے ساتھ ایک دو روپئے کا بلیڈ بھی خرید کر لائے۔ جینس کے دھاگے ادھیڑنے کے لئے.....''
''ہاں.....''

باپ مسکرا رہا تھا..... ''مجھے اچھا لگتا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ نہیں..... تم نہیں جانتے ہو گے۔ بس تم ہزاروں لاکھوں لوگوں کے ذریعہ چلائے گئے فیشن کا ایک حصہ بن جاتے ہو..... سنو..... جب تم الٹی بیس بال ٹوپی پہنے ہو تو زمانے کو بھی الٹ دیتے ہو..... جیسے یہ خیال کہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو اور بس مجھے تمہاری نسل کی، یہی ادا پسند ہے..... اور میں اس ادا پر قربان جاتا ہوں.....''

''اور بلیڈ اور برانڈیڈ جینس والی بات.....؟'' بیٹا، باپ کو غور سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

باپ مسکراتا ہے..... ''جانتے ہو۔ پرب تیوہار کے موقع پر ہمارے نئے کپڑے بنتے تھے۔ تمہاری طرح نہیں کہ ہر مہینے ہی نئے ٹی شرٹ اور جینس چلے آ رہے ہیں۔ پہلے ہم ہفتوں اس نئے کپڑے کو دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ پہننا تو دور کی چیز تھی۔ ہم بس نئے کپڑے کو دیکھ کر ہی نہال ہو جاتے تھے اور تم.....''

باپ ہنس رہا تھا۔ ''مائی گاڈ۔ پندرہ ہزار کی جینس اور ایک بلیڈ..... تم میں ہمت ہے۔ تمہاری نسل میں..... تم ہمیں سکھاتے ہو کہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو..... اپنے پسندیدہ برانڈیڈ لباس کی دھجیاں بکھیر سکتے ہو۔ بلیڈ سے کاٹ کر اس کے دھاگے نکال سکتے ہو۔ تم بتاتے ہو کہ کسی بھی شے میں تمہارے جذبات، تمہارے ایموشنس ایسے ہی ہیں — اور مجھے یہی بات تمہاری پسند ہے۔ ہم جذباتی ہوتے تھے۔ مورکھ..... اور ایک دن یہی مورکھتا ہمیں پریشان کرنے لگتی تھی.....''

''بیٹا غور سے باپ کی بات سن رہا تھا —''

''تو اسی لئے آپ ہماری نقل کرنے لگے.....؟''

''نہیں.....'' باپ کو زور سے ہنسی آئی تھی..... ''بالکل بھی نہیں بس تمہاری عمر میں داخل ہونے کی کوشش ہے.....''

''لیکن آپ ہماری عمر سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔''

''بالکل بھی نہیں.....'' باپ اس بار زور سے ہنسا..... سامنے ہی آئینہ تھا۔ باپ آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بالوں کو کل رات ہی اس نے ڈائی کیا تھا۔ سر پر بیس بال ٹوپی تھی۔ بلیو جینس، ٹی شرٹ اور کنواس کے شو میں وہ بیٹے کا بڑا بھائی لگ رہا تھا۔

باپ ہنس رہا تھا..... ''کہاں ہے عمر..... دیکھو.....''

''تو اپنے بال ڈائی کئے.....؟''

''تو..... نہیں کرنا چاہئے؟''

بیٹا پھر گڑبڑا گیا..... ''نہیں میرا مطلب ہے، آپ میری عمر میں آنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔''

''کر رہا ہوں..... تو اس میں برا کیا ہے..... اور نتیجہ سامنے ہے۔ کوشش کرتے ہوئے میں تقریباً تمہاری عمر میں سمٹ آیا ہوں.....''

بیٹا اس بار باپ کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''ہماری عمر میں سمٹ کر کیا کرو گے؟'' بیٹے نے اس بار باپ کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں مرکوز کر دی ہیں۔

''تم اپنی عمر کا کیا کرو گے.....؟ باپ مطمئن ہے۔ جیسے باپ سوالوں کے پل صراط سے گزرتے گزرتے اپنے لئے اچھے برے کے تمام نتائج سے گزر چکا ہے۔

''میں؟'' بیٹا ہنس رہا تھا۔ ''ہماری تو ابھی زندگی شروع ہوئی ہے.....''

''کیسے کہہ سکتے ہو کہ ہماری زندگی ختم ہو گئی.....؟'' باپ نے الٹا سوال داغ دیا۔ میں ۴۵ کا ہوں..... ہو سکتا ہے ۴۵ سال اور زندہ رہوں۔ ۹۰ سال کے کتنے ہی لوگ آسانی سے آس پاس مل جائیں گے۔ میں یوگ کرتا ہوں..... مارننگ واک کرتا ہوں۔ ممکن ہے.....'' باپ ہنس رہا تھا..... ''۹۰ سال تک میری جوانی اسی طرح قائم رہے..... اور میں اسی طرح اس عمر میں بھی اڑتا رہوں.....''

بیٹا مطمئن نہیں تھا۔ وہ وہی بات دہرانے پر مجبور تھا جو اس کے عمر کے بچے دہراتے ہیں..... مثلاً..... میرے پاس کیریر ہے، رومانس ہے..... نیا آسمان ہے.....''

''اور میرے لئے بھی.....''

باپ کو مزہ آ رہا تھا۔ ''میں ہر بار اپنے لئے نیا کیریر، نئی منزل تلاش کر سکتا ہوں۔ میں آج بھی لڑکیوں پر جادو کر سکتا ہوں۔''

''آنٹیوں پر.....'' بیٹے نے باپ کو روکا.....

''کہہ سکتے ہو..... میں ان کے ساتھ بھی تم سے زیادہ اچھے رومانی مکالمے بول سکتا ہوں اور یہاں پر میرا تجربہ بھی میرے ساتھ ہوگا..... جبکہ کہیں بھی ڈیٹنگ کے لئے پارک یا ہوٹل میں یا موبائیل پر تمہیں مکالمے سوچنے ہوں گے.....'' باپ قہقہہ لگا رہا تھا۔ ''تم ابھی بہت پیچھے ہو..... تمہاری اڑان ابھی شروع ہوئی ہے۔ اور میں..... مجھے دیکھو..... میں تو بس اڑتا جا رہا ہوں.....''

اس بار بیٹے نے سر جھکا لیا تھا۔

(۲)

باپ کی اپنی رومانی دنیا تھی۔ وہ اکثر اس رومانی دنیا کے دروازے اپنے لئے کھول لیا کرتا تھا۔ اور وہ اپنے ہم عمر دوسرے دوستوں کو بھی اسی رومانی دنیا کے دروازے کھول لینے کی صلاح دیا کرتا تھا —

جیسے اس کے دوست ہنستے تھے..... ''اب اس عمر میں کیا رومانی ہونا۔''

باپ کو یہ منطق ناپسند تھی..... ''رومانی ہونے کے لئے بس اندر کے احساس کو جگانا ہوتا ہے، یوں.....'' وہ ہنس کر چٹکیاں بجاتا..... اور اس کے لئے عمر کوئی چیز نہیں ہے.....''

''بڑھتی عمر کا احساس پاگل کرتا ہے۔''

''تمہیں کرتا ہوگا.....'' باپ کو اپنے دوستوں پر ہنسی آتی تھی.....

''تم بھی اب پہلے کی طرح جوان نہیں رہے.....'' اس کے دوست باپ کو اس کے بوڑھے ہونے کا احساس دلایا کرتے۔

باپ دل کھول کر ہنستا..... ''جیسے آج ابھی اس وقت تمہیں میری کنپٹیوں کے بال سفید دکھ رہے ہیں۔؟''

''ہاں۔''

''میرے بیٹے نے بھی یہی کہا تھا.....'' باپ کو ہنسی آتی ہے۔

''پھر.....؟''

''یہ سفیدی نہیں تجربہ ہے۔اور تجربے میں عمر نہیں آتی.....''

''پاگل ہو.....''

باپ مسکراتا ہے..... ''اسے ڈائی کروں نہ کروں.....تمہاری طرح عمر اوڑھ نہیں سکتا.....اور جانتے ہو..... مجھے کبھی احساس نہیں نہیں ہوا کہ.....میں ایک جوان ہو رہے بچے کا باپ ہوں.....''

''اسکیپ؟''

''بالکل بھی نہیں.....'' باپ کی آنکھیں کہیں دور دیکھنے لگتی ہیں۔ ''لیکن ٹھہرو، اس عمر میں جیسا کہ اس وقت میں ہوں.....میرا باپ اس عمر میں ایک بوڑھا آدمی تھا.....اور جانتے ہو وہ بوڑھا آدمی کیوں تھا.....؟''

دوست ابھی بھی اسے نہیں سمجھ میں آنے والے انداز میں دیکھ رہے تھے۔

''اس لئے کہ اس کے ماحول نے.....اس کے معاشرے نے اسے ایک بوڑھے آدمی میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ذمہ دار شخص، ایک بزرگ.....گھر پر نگاہیں رکھنے والا، زمانے کے سرد و گرم کا احساس کرنے والا..... یہاں تک کہ باپ نے اس عمر میں اپنے پہناوے تک بدل لئے تھے۔اور میں.....''

باپ ہنس رہا تھا..... ''میں نے اس بزرگی کو دور کہیں روک دیا ہے۔ بالکل پاس مت آنا۔ابھی بیسیوں سال نہیں، کیونکہ ابھی آگے کے بھی کئی سال میں بزرگی بھرے احساس کے ساتھ نہیں کاٹ سکتا—باپ ہنس رہا تھا—

''تم بزرگ ہونے سے ڈرتے ہو۔جبکہ سچائی یہ ہے کہ بڑھاپا تمہاری عمر میں دستک دینے لگا ہے۔''

دوست مسکراتے تب بھی باپ اپنی تمام اداؤں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ اپنی دنیا میں گم رہتا.....

اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دنیا ہمیشہ باپ کے آس پاس منڈرایا کرتی ہے.....وہ دنیا جسے باپ دلّی جیسے مہانگر کی بھیڑ میں گم ہو کر کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ایک بڑا سا گھر.....گھر کے باہر جھولتا ایک پردہ، ٹوٹی دیواریں۔ان دروازے اور دیواروں کے درمیان ایک بند بندسی دنیا آباد تھی.....باپ کو اپنے باپ کی مکمل دنیا اسی چہار دیواری میں نظر آتی تھی۔سر جھکائے آنا اور جانا۔

اور ظاہر ہے باپ کے پاس ان باتوں کا رٹا رٹایا جواب تھا۔

''یہی سب ہمیں سکھایا گیا۔''

''مطلب مجھے بھی سیکھنا ہے۔''

''ہاں، کیونکہ یہی ہماری تہذیبی وراثت ہے۔''

''جبکہ باہر ایک دنیا بدلنے پر آمادہ ہے.....''

''دنیا کے بدلنے سے ہم نہیں بدل جاتے۔''

باپ کو رنج ہو جاتا..... ''آپ نے بھی سب کچھ بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔پھر بھی آپ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے.....''

باپ کے باپ ذرا بھی برا نہیں مانتے..... ''اب تم ہو.....تمہاری باری ہے۔ہم اپنی زندگی جی چکے.....تمہیں اپنی جینی ہے.....''

اور تبھی باپ نے فیصلہ کیا تھا.....اپنے باپ کی طرح وہ کمزوریوں کی فصیل پر کھڑے نہیں ہوں گے..... کیونکہ ان کے نصیب میں اڑنا لکھا ہے.....

اور یہی وہ وقت تھا جب ساری دنیا تیزی سے بدل رہی تھی۔اور باپ بھی اسی دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتا تھا.....چھوٹا شہر.....ٹوٹی دیواریں..... بے رونق دروازوں کو چھوڑ کر اس نے ایک لمبی اڑان بھری۔اور شہر آ گیا.....

لیکن شہر میں اڑنے تک کا راستہ بہت آسان نہیں تھا۔

ہاں یہ الگ بات تھی کہ باپ نے اپنی محنت سے اس راستے کو آسان بنایا تھا۔

لیکن اس آسان راستے میں باپ سے اچانک چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہونے لگی تھیں.....اور جیسے باپ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کا بیٹا اس کے بارے میں ایسا بہت کچھ جان گیا ہے، جو اسے نہیں جاننا چاہیے تھا۔

(۳)

''تو کیا سوچا ہے تم نے؟''

''ابھی تک میں نے کچھ نہیں سوچا.....''

باپ نے بیٹے کی طرف غور سے دیکھا.....بیٹا بغور اسکی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لیکن کچھ تو سوچا ہوگا؟''

''ہاں۔'' بیٹے نے گہری سانس لی۔

''مجھے بتاؤ گے؟''

''میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا.....''

بیٹا اب بھی باپ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔باپ کو اس طرح دیکھنے سے الجھن ہو رہی تھی۔شاید اسی لئے باپ نے نظریں جھکا لیں۔ایسا کرتے ہوئے بیٹے سے مکالمہ کرنا باپ کے لئے آسان ہو گیا تھا۔

''تو تم مانتے ہو کہ میں ایک اچھا باپ نہیں ہوں۔''

''ہاں۔'' بیٹے کے اندر کوئی جھجک نہیں تھی۔ ''ایسے باپ میرے دوستوں کے بھی ہیں۔اور دوست اپنے باپ کی کہانیاں سناتے ہوئے ذرا بھی پریشان نہیں ہوتے۔''

''تو تم بھی پریشان نہیں ہو۔''

بیٹے نے ایک لمحے کے لئے باپ کو دیکھا۔ اس کا لہجہ سخت تھا.....''لیکن میں پریشان ہوں کیونکہ میں اپنے دوستوں کی طرح نہیں ہوں اور میں نے کبھی آپ کو اس طرح نہیں سوچا، جیسے آپ نظر آتے ہیں۔''

''تو یہ تمہاری غلطی تھی نا، کہ تم نے باپ کو فرشتہ سمجھا.....جبکہ باپ بھی انسان ہوتے ہیں۔ باپ سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ باپ سے بھی گناہ اور جرم سرزد ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود باپ اپنے بیٹوں کو پیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی اپنی ذات، اور بیوی بیٹے کے لئے اس کی موجودگی ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ تو تمہارے خیال سے.....؟''

باپ نے اس بار نظر اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا.....

بیٹا اب بھی اسکے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا.....

''تو تمہارے خیال سے ایک باپ کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہئے.....''

''کیوں نہیں چاہئے۔''

''باپ کو فیشن نہیں کرنا چاہئے۔ باپ کو اڑنا نہیں چاہئے..... باپ کو ایک بزرگ کی طرح رہنا چاہئے۔ باپ کو عشق نہیں کرنا چاہئے۔''

بیٹے کی آنکھوں میں اچانک چمک پیدا ہوئی تھی۔ اس بار باپ کا چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے عاری تھا۔

''تم کیوں سمجھتے ہو کہ تم میرے بیٹے ہو تو میری اپنی ذات کی چمک ختم ہوگئی؟ ایک انسانی جسم تمہارے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی۔ اور اس انسانی جسم کا فاصلہ ۲۵ سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔ تم مجھ سے پچیس سال چھوٹے ہو بس.....''

''پچیس سال کم نہیں ہوتے۔''

''زیادہ بھی نہیں ہوتے.....'' باپ نے مسکرانے کی کوشش کی.....''اس عمر میں تمہارے سلمان، عامر اور شہہ رخ فلموں میں کمر مٹکاتے اور رومانس کرتے نظر آتے ہیں۔''

بیٹے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی.....''آپ نہ شہہ رخ ہیں نہ سلمان۔''

''جانتا ہوں، عامر خان بھی نہیں ہوں۔''

''اور آپ ان کی طرح فٹ بھی نہیں ہیں۔''

''یہ بھی جانتا ہوں.....کیونکہ ان کی زندگی فٹنیس کے آگے پیچھے ہی گھومتی ہے۔''

''آپ ان سے جلتے ہیں؟''

''یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، نہیں.....کیونکہ میری زندگی میری اپنی ہے۔ جیسی تمہاری زندگی تمہاری۔ لیکن ابھی جن ہیروز کے نام تم نے لئے، ان کی بھی بیوی بچے ہیں، گھر ہے، خاندان ہے اور ذاتی زندگی سے الگ ان کے رومانس کی کہانیاں بھی ہیں۔''

''گاسپس!''

''ممکن ہے۔ لیکن تم بھی ان لڑکوں میں سے ایک ہو جو اس طرح کے گاسپس کے مزے لیتے ہیں۔''

''شاید!''

''ایسا کوئی قصہ باپ کی زندگی میں پیدا ہوتو؟''

اس بار بیٹے کا لہجہ کڑوا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑائی۔ وہ صرف اتنا ہی بول سکا۔

''میں آپ کو بھی جانتا ہوں۔''

اس بار باپ کے چونکنے کی باری تھی.....''کیا؟''

''کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ میں آپ کو بھی جانتا ہوں.....'' بیٹا اس بار غصے سے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا۔ جب باپ کی آنکھوں میں دھواں سا لہرایا تھا.....

''تم کیا جانتے ہو۔ یا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' باپ کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

بیٹا اس درمیان سنبھل چکا تھا۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں مجبوری کی تڑپ تھی۔

''آپ باپ ہیں۔ اس لئے آپ کو قبول کرنا ہی ہے۔ آپ کے جرم اور گناہوں کے ساتھ.....''

اور اسی کے ساتھ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

باپ سناٹے میں تھا۔ بیٹے کے لفظ دھماکے کر گئے تھے.....یادوں کی ریل چھک چھک کرتی ہوئی آنکھوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ باپ کو اس رشتے میں محبت اور توازن بحال کرنا تھا۔ باپ مطمئن تھے۔ اور طمانیت کے لئے یہ سوچنا کافی تھا کہ وہ فرشتہ نہیں انسان ہیں۔ اس لئے ان سے بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بیٹا کیا جانتا ہے؟ یا بیٹے نے کیا دیکھا ہے؟ وہ ایسا کیا ہے جس نے بیٹے کو باپ کے لئے ایک باغی بیٹے میں تبدیل کر دیا ہے۔

باپ کی آنکھوں کے آگے کتنی ہی پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں۔

باپ کے لئے اس اچانک کے مکالمے سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ لیکن باپ ان باپوں کی طرح نہیں تھے جو ایسی باتوں پر جذباتی بن کر بیٹھ جاتے ہوں، اور پھر دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیتے ہوں کہ وہ بیٹے کے لئے ایک ایماندار باپ میں خود کو تبدیل کر کے دکھائیں گے۔ باپ ایسی ایمانداریوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور باپ کے پاس ان باتوں کے لئے مناسب جواب بھی تھا کہ وہ انسان ہیں اور بار بار غلطی کرنے کے لئے مجبور بھی — بیوی اور بیٹے سے بے پناہ پیار کے باوجود بھی باپ کو محبت کا نشہ تھا۔ اور باپ ایسی کسی بھی محبت کو اپنے لئے جائز بھی سمجھتے تھے۔ باپ بیٹے کی طرح نہ سہی، لیکن خود کو ایک بھرپور جوان مرد کے طور پر ہی دیکھتے تھے۔ جو جھل مل کرتی آنکھوں میں خواب سجا سکتا ہے — اڑ سکتا ہے — کسی کافی ہاؤس میں اپنی کسی نئی محبوبہ کے ساتھ کافی کی چسکیاں لے سکتا ہے۔ اور باپ کو اس میں کوئی برائی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

مگر اس وقت باپ کے لئے مشکل یہ تھی کہ اس کے بیٹے نے کچھ نہ کچھ دیکھا ضرور تھا۔ مگر.....بیٹے نے کیا دیکھا تھا۔ الجھنوں سے بھرے چہرے کے ساتھ وہ آئینہ کے سامنے تھا۔

''تم پریشان ہو.....؟''

''نہیں تو.....''

''پریشان ہو.....''عکس مسکرا رہا تھا۔

باپ نے حامی بھری—''ہاں پریشان ہوں۔''

''اس لئے کہ بیٹے نے بغاوت کر دی ہے؟''

''نہیں،اس لئے کہ اس نے کچھ دیکھا ہے۔''

''اچھا مان لو اس نے کچھ دیکھا ہے۔اور اس کا لہجہ بتاتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا.....''

''ہاں۔''

''اچھا۔تمہارے بھی باپ تھے۔مان لو،تم نے ابھی اپنے باپ کو ایسے ویسے کسی رنگ میں دیکھا ہوتا تو.....؟''

''نہیں جانتا۔لیکن باپ کے سامنے میری زبان نہیں کھلتی۔''

''اس لئے کہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم بیٹے کی طرح مکالمہ ادا نہیں کر سکتے تھے.....؟''

''ہاں۔''

''تو بیٹے کی تعریف کرتے ہو یا اس کے انداز سے غصہ ہو.....؟''

''غصہ نہیں۔اس عمر کے نوجوانوں کی خود اعتمادی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنے کی ادا سے متاثر ہوں۔وہ خیال ہی نہیں کرتے کہ سامنے کون ہے۔دوست یا ڈیڈی۔وہ بیباک ہیں۔جیسا سوچتے ہیں،منہ پر کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن تم.....یہ بیبا کی تمہارے اندر نہیں ہے؟''

''ہاں۔''

''مان لو۔بیٹے نے اگر ایسا کچھ دیکھا ہے تو.....؟ کیا تمہیں شرمندگی ہوگی؟''

''نہیں.....''باپ کے پاس اس کا جواب تیار تھا.....''جسم ہے تو مانگ بھی ہوگی۔بیٹا نئے زمانے میں جیتا ہوا بھی ماڈرن نہیں ہے۔ماڈرن ہونے کا مطلب صرف آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا نہیں ہے۔یہ سمجھنا بھی ہے کہ جیسا جسم بیٹے کے پاس ہے،ویسا ہی جسم اس کے ماں،باپ کے پاس بھی ہے۔اور اس کے ماں باپ اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ ان کے جسم کے پاس مانگیں نہ ہوں.....''

باپ نے عکس کو اس بار لرزتے ہوئے محسوس کیا۔

''تمہاری مانگ تمہاری بیوی سے الگ بھی ہے؟''

''ممکن ہے۔''

''تو ایک مانگ تمہاری بیوی کے اندر بھی ہو سکتی ہے؟''

''ہونی چاہئے۔''

''اگر وہ اپنی مانگ کو لے کر باہر جاتی ہے تو.....؟''

''یہ اس کی اپنی اخلاقیات ہوگی۔''

عکس ٹھہا کا مار کر ہنسا—''اور تمہاری اخلاقیات.....؟''

''میں خوبصورت تسلیوں سے اس اخلاقیات کو مطمئن کر دیتا ہوں۔مثال کے لئے صرف مذہب ہے جو جسم کے تقاضوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے۔''

''تو مذہب کو مانتے ہو نا.....''

باپ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی—''ہاں بھی اور نہیں بھی۔''

''ایسا کیوں؟''عکس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''مذہب مانتا ہوں۔پیروی نہیں کرتا۔جسم کی مانگوں کو مذہب سے الگ مانتا ہوں۔''

''مذہب میں جسم نہیں آتا.....؟''

''مذہب جسم میں کچھ زیادہ ہی دخل دیتا ہے—اور جسم کی اڑان ساری حدوں کو توڑتی ہوئی ہوتی ہے۔''

''اسی لئے یہ اڑان تمہیں کمزور کر دیتی ہے۔''

''ہاں۔''

''اور اسی لئے مانتے ہو کہ بیٹے نے کچھ دیکھا ہے.....''

''ہاں.....''

''اور.....مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم کچھ باتیں چھپانے کوشش کر رہے ہو.....''

''شاید.....''باپ کا لہجہ اس بار سہما ہوا تھا—''بہت کچھ بدل چکا ہے۔اس عمر میں میرے باپ ایک بوڑھے آدمی تھی۔سماج سے خوفزدہ،جیسا کہ اس وقت کے سارے باپ ہوتے تھے۔جن کے پاس غلط اور ناجائز کی کوئی تعریف ہوتی ہی نہیں تھی۔یا دوسرے لفظوں میں کہیں تو اس عمر میں وہ ایک بے حد شریف اور بزرگ مرد میں تبدیل ہو چکے ہوتے تھے،جن سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا—لیکن اب ایسا نہیں ہے۔اور کم از کم میں ایسا نہیں ہوں۔میں ابھی آگے کے دس پندرہ برسوں تک خود کو بزرگ سمجھنے کی بھول نہیں کر سکتا.....''باپ نے کندھے اچکائے—''ایک ماڈرن ماں اس عمر میں جینس اور ٹی شرٹ پہن کر اپنی بیٹی کے ساتھ چلتی ہے تو وہ اس کی بڑی بہن لگتی ہے۔کل اس عمر میں ماؤں کے چہروں پر بزرگ جھریوں کے نقش ونگار پیدا ہو چکے ہوتے تھے.....''

''ہاں!''عکس غور سے سن رہا تھا.....''آج مرد عورتیں دونوں ہی ہیلتھ کانشس ہیں۔پھر جم ہے،یوگا ہے اور باہر کی دنیا ہے.....''

''اور اسی لئے اڑان ہے.....''باپ اب مطمئن تھا.....''لیکن اس اڑان کو میں سمجھتا ہوں۔بیٹا نہیں۔بیٹا ماڈرن ہوتے ہوئے بھی اپنی ماں اور باپ کے لئے ماڈرن نہیں ہے.....''

''مثال کے لئے.....''

''مثال کے لئے.....'' باپ کہتے کہتے ہنسا..... ''زمانہ الٹا ہوگیا ہے۔کل تک ہم بیٹے پر نگاہیں رکھتے تھے کہ وہ کیا کررہا ہے۔کہاں جارہا ہے۔لیکن آج بیٹا باپ پر نگاہیں رکھتا ہے۔مثال کے لئے کہ اس کا باپ کس سے باتیں کررہا ہے۔کہاں جارہا ہے..... کس سے چیٹ کررہا ہے۔فیس بک پر کس سے باتیں ہورہی ہیں۔جبکہ ایک باپ مطمئن ہے کہ اس کا بیٹا اگر جوان ہے تو وہ کسی سے بھی اپنی رومانٹک باتیں شیئر کرسکتا ہے۔یہاں تک کہ پارن سائٹ بھی دیکھ سکتا ہے۔آپ اس پر بندش لگائیں گے تو یہ کام وہ باہر جا کر یا چھپ کر کرے گا.....''

''ہونہہ۔'' عکس نے گہرا سانس لیا..... ''تو تم بیٹے سے ڈر رہے ہو.....؟''

''ہاں۔''

''کیونکہ بیٹا تم پر نظر رکھتا ہے۔''

''شاید.....''

''اور اس کے باوجود تم اڑنا چاہتے ہو۔''

''ہاں، کیونکہ یہ زندگی میری اور اڑان میری ہے۔اور میرے لئے یہ فلسفہ بہت ہے کہ خاندان کے علاوہ میری اپنی ایک نجی زندگی بھی ہے۔اور اس زندگی میں مجھے ہنسنے مسکرانے اور رومانس کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا بیٹے یا دوسروں کو حاصل ہے۔''

باپ مطمئن ہے۔وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگیا ہے۔یہاں دیوار پر دو تین خوبصورت پینٹنگس کے درمیان ایک اس کی بھی تصویر ہے۔بلیک اینڈ وہائٹ۔کوئی پچیس سال پرانی۔اس تصویر میں باپ کے چہرے پر پورے پورے بال ہیں۔سفید شیشے کے فریم سے جھانکتی آنکھیں ہیں۔مسکراتی ہوئی.....اب ان آنکھوں کی مسکراہٹ کہیں کھوگئی لگتی ہے۔مسکراتے ہوئے اس کے سفید چہرے جیسے دانت بھی جھانک رہے ہیں۔باپ کو احساس ہے، اس کے آگے کے دانت بہت جلد ٹوٹ گئے۔اب نقلی دانتوں کے سہارے باتیں کرتے ہوئے اسے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے..... پچیس برسوں میں زندگی کی موسیقی کہیں کھوگئی۔اب یہ فیوزن کا وقت ہے۔پچیس برس پہلے کا باپ ایک خوبصورت جوان مرد تھا۔آج اس کا بیٹا جوان ہوچکا ہے.....

باپ غور سے تصویر کو دیکھتا ہے۔مسکرانے، چہکنے کی کوشش میں بیٹے کے مکالمے راستہ روک کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

''اب بھی مان لو، تم بوڑھے ہوگئے ہو ڈیڈ۔''

باپ ہنسنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن اس بار اس کی ہنسی کہیں کھوگئی لگتی ہے۔

(۴)

باپ اور نقلی دانتوں کا قصہ

ایک بیحد ناخوشگوار شام۔اور جیسا کہ باپ کو پچھلے کچھ دنوں سے احساس تھا کہ کبھی کسی وقت بھی یہ حادثہ ہوسکتا ہے۔مگر محتاط رہنے کے باوجود یہ حادثہ ہوگیا تھا۔کیفے ہاؤس میں مسز تارا دیش پانڈے سے باتیں کرتے ہوئے باپ کے نقلی دانت میز پر آگئے تھے۔سکنڈ کی تاخیر کے بغیر باپ نے دوبارہ ان دانتوں کو اپنے اصل دانتوں کے درمیان

جوڑ لیا تھا۔مگر تارا دیش پانڈے کے لئے اتنا کافی تھا۔اس کی تیز نگاہیں بغور باپ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''دانت دھوتو لیا ہوتا.....''

''ہو.....ہو.....'' باپ نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کے آگے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں، تارا کی گدھ جیسی آنکھیں باپ کو چبھ رہی تھیں..... ''دو ہی ٹوٹے ہیں نا..... یا اور بھی؟ جب آپ باتیں کرتے ہیں تو آپ کے پیلے دانتوں کے درمیان یہ دو دانت سفید ہیرے کی طرح چمک اٹھتے تھے۔میں نے پچھلی بار بھی سوچا تھا کہ آپ سے پوچھوں گی.....''

''ہو.....ہو.....''

''واش روم کیوں نہیں چلے جاتے۔دانت اور ہاتھ دونوں صاف کرلیجئے۔''

باپ نے محسوس کیا، تارا دیش پانڈے کے چہرے کی ساری رومانیت اس کے چہرے سے گم ہوگئی تھی۔واش روم سے واپس آنے تک تارا میں ایک نئی عورت پیدا ہوچکی تھی۔

''مجھے گھر جانا ہے۔''

بیگ ہلاتی ہوئی کچھ ہی سکنڈ میں وہ سامنے کے دروازہ سے باہر نکل چکی تھی۔باپ کے لئے یہ کشمکش سے بھرے لمحے تھے۔چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ آئے اور غائب ہوگئے۔باپ کو احساس تھا، یہ حادثہ محتاط نہ رہنے کی وجہ سے ہوا ہے۔دانت کے ڈاکٹر نے مشورہ بھی دیا تھا کہ ان دانتوں کی جگہ مضبوط اور پرمانٹ دانت لگا لیجئے۔یہ نقلی دانت کئی دنوں سے ہل رہے تھے بلکہ گھر میں گفتگو کے دوران کتنی ہی بار نکل کر اس کے ہاتھوں میں آگئے تھے۔لیکن باپ باہر کی دنیا میں باتیں کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی احتیاط کا مظاہرہ کرتا تھا۔اس لئے مطمئن بھی تھا کہ باہر کی میز پر خوبصورتی سے وہ ایسے حادثوں کو ٹال سکتا ہے۔

مگر اب یہ حادثہ ہوچکا تھا۔باپ اس بیہودہ لمحے سے باہر نکلنے کے لئے کوئی اچھا سا گیت گنگنانے کا خواہشمند تھا۔مگر گیت بھی جیسے اس لمحے اس کے ہونٹوں تک آنے کا راستہ بھول گئے تھے.....

میز سے اٹھنے تک باپ کی رومانی دنیا ایک مضحکہ خیز دنیا میں تبدیل ہوچکی تھی۔

باپ کو اپنے دوست کی بات یاد آرہی تھی۔

''بزرگ ہوتا آدمی ایک جوکر ہوتا ہے۔بلکہ جوکر سے زیادہ۔اپنی بزرگی چھپانے کے لئے چور دروازے سے جوان بننے کی کوشش میں اس کا وجود کسی مسخرے سے زیادہ نہیں ہوتا۔بزرگی چھپانے کی چیز نہیں ہوتی۔اب آئی ہے تو قبول بھی کرو۔''

لیکن باپ کا مسئلہ اور تھا۔اس کے اندر کی کائنات میں ایک ایسی رومانی سلطنت موجود تھی، جس سے الگ کی زندگی کا تصور کرپانا بھی اس کے لئے مشکل تھا۔اس لئے وہ مطمئن تھے کہ آگے کے ۲۰۔۱۵ برسوں تک وہ اس بزرگی بھرے احساس کو بڑی خوبصورتی سے ٹال سکتے ہیں۔اور یہ ۲۰۔۱۵ برس کم نہیں ہوتے۔

اور اسی لئے ۴۵ سال کے اس باپ کی اپنی دنیا میں وہ سب کچھ تھا جو ان کے بیٹے یا کسی بیس پچیس سال کے جوان کے پاس ہوتا ہے۔باپ اس زندگی سے خوش تھے۔انٹرنیٹ، فون اور سوشل میڈیا کی اس زندگی میں خود کو جوان

بنائے رکھنے کا ہنر باپ کے پاس تھا۔اسی لئے تارا دیش پانڈے کے جانے یا ناراض ہونے سے باپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔اور باپ کے لفظوں میں، ایک تارا دیش پانڈے جائیں گی تو دوسری آ جائیں گی۔ باپ نے دل کے دروازے کھلے رکھے تھے.....

لیکن تارا دیش پانڈے کے جانے سے فرق تو پڑا تھا۔اور یہ اصلیت باپ کے علم میں تھی کہ دو ایک برس میں یہ رشتے محبت کی حدود سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔لیکن مکالمے کی حد تک۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مکالمے اب اخلاقیات کی دیوار کو توڑتے ہوئے جسم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔اور تارا دیش پانڈے کی فون پر الجھی ہوئی سانسیں ان حدود کے ٹوٹنے کا برا بھی نہیں مانتی تھیں اور باپ کو یقین تھا، ایک دن مکالموں کے اسی چور دروازے سے تارا دیش پانڈے کے جسم تک پہنچا جا سکتا ہے۔لیکن محبت کے احساس کو خوشگوار بنانے والی رسم ہونٹوں کے سہارے بوسے تک پہنچتی ہے۔اور بوسے کی رسم میں اکثر ہیرے موتی کی طرح جھانکتے شفاف دانتوں کی قطار بھی آتی ہے.....

تارا دیش پانڈے کی نظروں میں صرف یہ نقلی دانت نہیں تھے بلکہ رومانی احساس کے گلشن میں اچانک ہونے والا دھماکہ بھی تھا جس نے ایک ساتھ کئی حملے کیے تھے۔ایک تو اندر کے خوشنما رومانی احساس پر خزاں حاوی ہوگئی۔ بلکہ نقلی دانتوں کے تصور سے ہی اچانک وہ شخص برسوں کا بیمار اور بزرگ نظر آنے لگا، کچھ دیر پہلے تک جس کے ساتھ وہ حسین رومانی وادیوں کی سیر میں گم تھی۔ باپ اس سے زیادہ اس حادثے کا تجزیہ نہیں کر سکتے تھے۔اور باپ نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ وہ تارا دیش پانڈے سے بات نہیں کریں گے۔

کبھی کبھی ہم جو سوچتے ہیں، ہوتا اس کے برعکس ہے۔دوسرے دن صبح ہی صبح اچانک تارا دیش پانڈے کا فون آ گیا۔

''ابھی ملو.....''

''لیکن کہاں—اور کیوں.....؟''

''مجھے نہیں معلوم۔بس آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے.....''

بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ایک نارمل، پرسکون صبح۔لیکن یہ سکون تارا دیش پانڈے کے چہرے سے غائب تھا۔ آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اس کے چہرے کی کشمکش کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔جسم میں تھرتھراہٹ تھی۔وہ اچانک باپ کی طرف گھومی۔

''اچھا بتاؤ۔میری عمر کیا ہوگی؟''

''اب یہ عمر کہاں سے آ گئی.....؟''

''آئی ہے.....'' تارا دیش زور سے چلائی۔آئی ہے عمر، ور یونو، میں کل رات.....سو نہیں پائی۔ساری رات جاگتی رہی.....''

''مگر کیوں.....؟''

''وہ تمہارے دانت.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔''کیا میرے چہرے پر جھرّیاں ہیں؟''

''نہیں تو.....''

''یہ دانت دیکھو میرے.....اس نے دہانہ کھول دیا.....کیا میرے دانت پیلے ہیں؟ ٹوٹے ہوئے.....یا چمکتے ہیرے کی طرح آب دار.....؟''

''یہ سب کیا ہے تارا.....؟''

''نہیں جواب دو مجھے۔'' تارا نے سن گلاس آنکھوں سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔''اب میری آنکھیں دیکھو۔خدا کے لئے دیکھو۔مذاق مت بناؤ میرا۔اور بتاؤ۔کیا یہ آنکھیں خوبصورت اور گہری نہیں۔؟''

''ہیں، بہت گہری ہیں۔اور دانت بھی۔جیسے سفید موتیوں کی قطار ہوتی ہے۔''

''اور میرا جسم.....؟''

تارا دیش پانڈے کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔''مجھے غور سے دیکھو.....میرا جسم بولتا ہے نا؟ چیختا ہے نا.....؟ کسی بوڑھی عورت کا جسم تو نہیں لگتا یہ.....؟''

''بالکل بھی نہیں.....''

''ہونہہ.....'' تارا نے گہرا سانس لیا۔دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔اس کی کشمکش اب بھی جاری تھی.....''میں ساری رات سو نہیں پائی۔جانتے ہو کیوں.....تمہاری وجہ سے.....چشمہ اتارو۔''

''کیا؟'' باپ کے لئے یہ چونکنے کا لمحہ تھا۔چشمے کے اندر اس کی آنکھیں بے حد کمزور لگتی تھیں.....اسے اپنا فیصلہ معلوم تھا۔باپ نے ٹکا سا جواب سنایا۔

''نہیں اتار سکتا۔''

''جانتی تھی۔'' تارا دیش پانڈے نے ہنسنے کی کوشش کی۔''دانت ٹوٹے ہوئے، آنکھیں کمزور، سر پر کم سے کم ہوتے ہوئے بال.....رات بھر تمہاری موجودگی ایک بوڑھے ویمپائر کی موجودگی تھی، جو مجھ پر جھکا ہوا میرا خون چوس رہا تھا اور مجھے ابکائی آ رہی تھی۔''

باپ نے ایک زور کی ہلچل جسم میں محسوس کی.....

''ایک وقت آتا ہے جب ہم اور یجنل ہوتے ہیں۔سمجھ رہے ہو نا۔اور یجنل.....پھر جسم کی مشین میں کمزوری آ جاتی ہے۔اور جسم کو بحال رکھنے کے لئے ہم مصنوعی چیزیں لے آتے ہیں۔جیسے نقلی بال.....نقلی دانت.....'' تارا دیش پانڈے کا لہجہ کڑوا تھا—''پھر نقلی ہو جاتے ہیں ہم.....پوری طرح سے نقلی.....''

باپ کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔''تو تمہارے اس پورے مکالمے کا مقصد تھا کہ تم اور یجنل ہو۔اور میں نقلی۔ ٹھہرو۔تمہارے پہلے سوال کا جواب دے دوں۔جسم اور مشین میں فرق ہوتا ہے تارا دیش پانڈے۔۱۵ ہزار کا ٹی وی بھی خراب ہو جائے تو پھینک نہیں دیتے۔ بلکہ ٹھیک کراتے ہیں۔اور ٹی وی پھر سے کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔رہی جسم کی بات۔تو ہر انسان بیمار ہوتا ہے۔علاج کراتا ہے اور اچھا ہوتا ہے نا.....''

تارا دیش پانڈے کی آنکھوں کا خوف برقرار تھا۔

''اور کتنی عمر ہوگی تمہاری تارا! ۳۵ سال؟ تو مجھ سے زیادہ نہیں صرف دس سال چھوٹی ہو۔ اور میرے جسم کے مقابلے تمہارے جسم نے تیزی کے ساتھ ڈھلنا شروع کیا ہے.....'' باپ کا لہجہ سخت تھا..... ''نہیں۔ غصہ مت ہو۔ عمر کے اس احساس کو سمجھو جس میں ہم تم دونوں داخل ہیں۔ یا جو بات مجھ پر صادق آتی ہے، وہ تم پر بھی آتی ہے تارا۔ بال کم ہونے، چشمہ پہننے یا آگے کے دو دانت کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے میں نقلی نہیں ہو گیا۔ میں اور یجنل ہوں۔''

باپ نے بادبان کی طرح دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ ایک جواں مرد۔ جواں جسم۔

''جسکا ایک جوان بیٹا ہو وہ جواں مرد نہیں ہوتا۔''

''یہ کس نے کہہ دیا کہ بیٹا جوان ہو جائے تو باپ بوڑھا ہو جاتا ہے.....'' باپ کے چہرے پر اب شرارت کے سرخ رنگ نمودار ہوئے۔ آگے بڑھ کر اس نے تارا کی معصوم ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا.....

''میری انگلیوں کی تپش سارے جسم میں محسوس کر سکتی ہو تم..... اور دیکھو..... دو ہی سکنڈ میں تمہارے ہاتھ بھی جلنے لگے.....''

تارا نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا.....

''اگر کچھ اور یجنل ہے تو وہ میرا اور تمہارا احساس ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ذہن میں اٹھنے والے بیمار سوالوں سے تم اپنے احساس کو بوڑھا کر رہی ہو.....''

باپ نے آگے بڑھ کر تارا دیش پانڈے کے ہاتھوں کو تھام لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو چلتے ہیں۔ اور ہاں سنو..... جیسے میرے بیٹے کے پاس اڑان کے لئے یہ پورا آسمان موجود ہے، ویسے ہی یہ آسمان میرے لئے بھی ہے.....''

سڑک پر ٹریفک کے شور تھے۔ باپ نے اب بھی تارا کے ہاتھوں کو تھاما ہوا تھا۔ تارا نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ باپ مطمئن تھا۔ اور طمانیت کے اس احساس کو اب اس کے چہرے پر بہ آسانی پڑھا جا سکتا تھا—

تارا کے نازک ہاتھوں کو تھامے ہوئے باپ کے احساس میں ایک نوجوان، رومانی احساسوں والے آدمی کی آمد ہو چکی تھی۔ باپ ان بہت ساری آنکھوں سے بے نیاز تھا، جو شاید اس کی طرف دیکھ رہے تھے.....

چلتے چلتے تارا ایک لمحے کے لئے رکی.....

''اگر مان لو، اس وقت تمہارا بیٹا یہاں آ جائے تو.....؟''

''کوئی بات نہیں۔''

''مان لو۔ وہ کہیں ہو..... اور وہ ہمیں دیکھ بھی رہا ہو.....''

باپ نے سر کو جھٹکا دیا۔ ''کوئی بات نہیں۔''

اس بار باپ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی..... ''اور مان لو..... اس وقت تمہارا شوہر یہاں آ جائے تو.....''

تارا دیش پانڈے..... ''کوئی بات نہیں.....'' کہتے کہتے ٹھہر گئی۔ اس کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھا.....

''ناٹی بوائے.....''

''اڑتے ہوئے ہم اتنا زیادہ کیوں سوچتے ہیں۔؟''

''پتہ نہیں۔''

تارا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''میرے ہسبنڈ دس دنوں بعد واپس آئیں گے۔ چلو میرے گھر.....''

اس بار باپ مسکرایا تھا۔ ''ناٹی گرل.....''

دھوپ روشن تھی۔ عام طور پر روشن دھوپ میں کناٹ پلیس کے اس علاقے میں کسی گداز ہاتھ کو تھامے ہوئے چلنا اچھا لگتا ہے۔ باپ کو احساس تھا، وہ بیحد چھوٹی ہتھیلیاں تھیں، جو اس کی ہتھیلیوں میں اس وقت پیوست ہو گئی تھیں۔ باپ نے کانپتی انگلیوں کے لمس میں تارا کے اندرونی جذبات کی شدت کو پڑھ لیا تھا۔ اور یہی لمحہ تھا جب پارکنگ میں گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے، مونگ پھلیاں بیچتی ایک چھوٹی سی بچی باپ کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ باپ مسکرایا۔ دس کا نوٹ بڑھایا۔ لڑکی کی پیٹھ تھپتھپائی اور اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی مونگ پھلی کو جیب کے حوالے کر دیا—

گاڑی چلاتے ہوئے باپ نے تارا کی طرف دیکھا۔

''عورت میں ہر بار ایک نئی عورت آ جاتی ہے۔'' باپ کے ہونٹوں پر شرارت تھی..... ایک ساتھ اتنی عورتوں کو ایک بے حد معصوم وجود میں تم لوگ کیسے جمع کر لیتی ہو.....''

تارا دیش پانڈے کا گھر آ گیا تھا۔ اور آگے جو کچھ ہوا یا ہونے والا تھا باپ کے لئے اس کا تجزیہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہ ایک بے حد خوشنما لمحہ کو اذیت پہنچا کر اپنے لئے سکون کا سامان بہم کرنا چاہتا تھا.....

اور یہ وہی لمحہ تھا، جب تارا ڈر گئی تھی.....

(۵)

جسم کے کانٹے، ڈن لپ کا بستر

شاید باپ کو بھی ان بے چین کرنے والے لمحوں کا انتظار تھا۔ اور انتظار ہی نہیں تھا بلکہ اکثر خوابیدہ شب کے پراسرار سناٹے میں اس نے تارا دیش پانڈے کے جسم سے گونجتے گھنگھروؤں کی موسیقی سنی تھی۔ تب ایک برہنہ ساحرہ ڈھلتے ہوئے شب کے آخری پہر اپنی زلفیں کھولتی اور ناگن کی طرح لہراتی ہوئی اس کے جسم کا حصہ بن جاتی..... اور باپ کا خیال تھا، ندی کی طرح بہتے ہوئے محبت کا احساس ضروری ہے۔ یا اسے یوں کہہ لیں کہ محبت کے احساس کے بغیر جسم کے آبشار کی لذت ادھوری ہے.....

اور اس وقت باپ کمرے میں اکیلا تھا۔ تارا دیش پانڈے کا بیڈ روم۔ دیوار پر آویزاں شادی کے وقت کی ایک دھندلی سی تصویر..... ڈن لپ کا بستر..... باپ کو یاد تھا، اس کے ایک دوست نے کبھی کسی زمانے میں عورت کے بدن کا موازنہ ڈن لپ کے اسی بستر سے کیا تھا۔ اور عورت اگر تارا دیش پانڈے ہو تو..... ڈن لپ کے بے جان بستر سے بھی آگ کی شعائیں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں.....

ایش ٹرے میں بجھی ہوئی سگریٹ کے ساتھ مونگ پھلیوں کے چھلکے بھر گئے تھے..... باپ آنکھوں کے پردے پر انہی مونگ پھلیوں کی طرح تارا دیش پانڈے کے جسم کے چھلکے اتار رہا تھا..... جسم میں آگ بھر گئی تھی..... بیڈ پر تارا کا

لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ باپ کے ہاتھوں کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر ناچنے لگیں.....ٹوئٹر پر اس نے اپنے نام آئے ہوئے کچھ میسیج پڑھے۔ پھر ٹوئٹ کیا.....

''ایک بے رحم دوپہر، میرے لئے جلنے کا انتظا کر گئی ہے۔''

''کیا لکھ رہے ہو.....؟''

بڑی اداؤں کے ساتھ تارا دیش پانڈے نے اپنی بانہیں باپ کے گلے میں حمائل کر دیں.....

''ایک بے رحم دوپہر..... پڑھتے ہوئے تارا کے ہونٹوں پر سبک سی مسکراہٹ لہرائی..... ناٹی بوائے.....اور یہ وہی لمحہ تھا جب ایک گداز جسم ڈن لپ کے حسین گدے میں تبدیل ہو گیا تھا.....

ایک سنامی لہر تھی..... جہاں لفظ گونگے تھے..... جہاں سسکیوں میں سانپ کی پھپھکار شامل تھی۔ باپ اس لمحے انسان کی ردعمل کی نفسیات سے گزر رہا تھا۔ سنامی خاموش تھی۔ ہونٹوں پر ایک دلآویز بوسہ دے کر تارا بستر پر لیٹ گئی .....چت۔ سانسیں اب بھی کچھ دیر قبل آئی آندھی کی کہانی سناتی ہوئی۔

باپ نے تارا کے برہنہ جسم کو غور سے دیکھا۔ اور پھر وہ ہوا، جس کے بارے میں شاید تارا دیش پانڈے نے بھی نہیں سوچا تھا۔

باپ نے چشمہ اتارا اور میز پر رکھ دیا— چشمہ کے بغیر اس کی آنکھیں بیحد ڈراؤنی دکھتی تھیں۔ اس نے سنگار میز سے کنگھی اٹھائی اور سر کے آگے کے بالوں کو پیچھے کر دیا۔ اب آگے کا سر پوری طرح گنجا نظر آ رہا تھا۔ باپ یہیں نہیں رکا، اب ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ باپ نے آگے کے دو نقلی دانت نکالے اور اسے بھی میز پر رکھ دیا.....پھر وہ سرعت سے تارا دیش پانڈے کی طرف گھوما۔ دہانہ کھولا اور بندر کی طرح منہ سے عجیب سی آواز نکالی.....

تارا دیش پانڈے کی کھکھی بندھ گئی۔ وہ زور سے چیخی۔ ''اسٹاپ..... بند کرو..... بند کرو.....''

باپ اپنے برہنہ جسم کے ساتھ آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ بجھی ہوئی آنکھیں.....دو ٹوٹے دانت.....گنجا سر..... رومانٹک باپ کہیں کھو گیا تھا۔ ایک ہونق بوڑھا سامنے تھا..... باپ نے پلٹ کر دیکھا، تارا دیش پانڈے نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا جسم اب بھی کانپ رہا تھا.....

''دیکھو مجھے.....'' باپ زور سے چیخا۔

''میں نہیں دیکھ سکتی۔''

''کیوں.....؟''

''تم ایک Beast لگ رہے ہو.....''

باپ زور سے ہنسا۔ آگے بڑھ کر اس نے نقلی دانت اپنے دانتوں کے درمیان پھنسا لیا۔ چشمہ پہن لیا۔ کنگھی سے دوبارہ بال کے آگے کی جانب سوار دیئے۔ باپ نے مسکرانے کی کوشش کی.....تارا دیش پانڈے نے اپنی آنکھیں کھول دیں.....

''مائی گاڈ.....تم اس حال میں میرے پاس آتے تو.....''

''آبشار کا بہنا تھم جاتا.....؟''

''پرفیکٹ۔''

''لیکن کیوں.....؟'' اس بار باپ کے چہرے پر شکن تھی.....

''نہیں جانتی.....''

''ہم کسی بدنما چہرے کو گوارہ نہیں کرتے.....'' باپ کا لہجہ نپا تلا تھا.....

''وہ انسان ہی کیوں نہ ہو.....ایک بدنما انسان..... مجھے یہ بدنمائی گوارہ نہیں— میں اکثر اپنے بیڈروم میں جب کوئی نہیں ہوتا، دروازہ بند کر کے خود کا جائزہ لیتا ہوں.....چشمے کے اندر سے جھانکتی میری آنکھیں جتنی جاندار لگتی ہیں، چشمے کے بغیر اتنی ہی بجھی ہوئی یا مردہ.....چھپکلی کی طرح.....پھر میں خود سے لڑتا ہوں۔ اور ردعمل کے طور پر اندر سے اس باغی کو دریافت کر لیتا ہوں جو بے حد خوبصورت اور پرکشش ہے۔ ساتھ ہی رومانی بھی.....''

تارا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بغور باپ کا جائزہ لے رہی تھی.....

''تم اذیت پسند ہو.....''

''کیوں.....؟''

''کیونکہ تم ہو.....ابھی جو تم نے کیا۔ کیا اس کی ضرورت تھی.....؟ میں نے تمہارے اس روپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ دیکھنا چاہتی تھی۔''

''اور اسی لئے میں نے دکھایا.....'' باپ نے اپنی ہتھیلیوں کو جنبش دی.....جیسے تمہارا..... یہاں..... یہاں..... اور یہاں کا حصہ میں نہیں دیکھ سکتا.....'' باپ کے ہاتھ تارا کے جسم پر رینگ رہے تھے۔

''کیوں.....؟''

''کیونکہ یہ بدنما ہیں۔ جیسے میرے دو نقلی دانت، چشمہ کے بغیر میری آنکھیں۔ رومانی ہوتے ہوئے ہم صرف ایک فنٹاسی کی دنیا میں رہتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت ظالم اور کریہہ ہے.....''

تارا نے نائیٹی دوبارہ پہن لی تھی۔ اس کی پیشانی شکن آلود تھی.....

''پھر بھی— تم میں وائلڈ نیس ہے۔''

''حقیقت ہمیشہ وائلڈ ہوتی ہے۔ اور شاید اسی لئے حقیقت کو ہم جلد قبول نہیں کر پاتے۔''

باپ نے کپڑے پہن لئے تھے۔ کپڑے پہن کر پرانے باپ کو اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ تارا دیش پانڈے کے کمرے میں۔ تارا کے رخسار کو Kiss کرنے کے بعد وہ باہر نکل آیا تھا۔ اب وہ ایک پرفیکٹ، اور ذمہ دار باپ تھا۔ باہر آنے تک اس کا لہجہ انداز سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے وہ اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہا تھا، جوان دنوں اس کے پاس ہی آئے ہوئے تھے اور اس نے بیوی کو تاکید کی تھی کہ وہ انہیں یہاں کے مذہبی مقامات کی سیر کرا دے جیسا کہ وہ چاہتے ہیں۔ مثال کے لئے اس وقت باپ، اپنے بیٹے کی باغیانہ فطرت اور کیریر کو لے کر سوچ رہے تھے۔ مونگ پھلی کے کچھ دانے جیب میں اب بھی رہ گئے تھے۔ منڈلاتے کبوتروں کے آگے مونگ پھلی کے دانے اچھال کر باپ آگے بڑھ گئے۔

●

گھر میں واپس لوٹنے تک باپ کی دنیا بدل چکی تھی۔ یہاں بیڈروم کے علاوہ اسکا اپنا ایک کمرہ تھا جہاں میز کرسی کے علاوہ ایک بیڈ بھی تھا۔ میز پر پرانے زمانے کا ایک کمپیوٹر تھا، باپ جسے بہت دنوں سے بدلنے کے لئے سوچ رہا تھا۔ یہ کمرہ اس کی اپنی دنیا تھی۔ جہاں اسے بیڈروم سے زیادہ سکون ملتا تھا۔ باپ اسی کمرے میں اپنی تنہائیاں شیئر کرتے تھے۔ باپ نے تنہائی کی اس دنیا کو حسین تنہائیوں کا نام دیا تھا، جہاں لیپ ٹاپ پر ایک نئی دنیا کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے۔ پھر چیٹ فرینڈس تھیں، جس سے کافی کافی دیر تک وہ چیٹ کیا کرتا۔ اور ایسے وقت وہ محتاط رہتا کہ کہیں بیٹا کسی چور دروازے سے اس پر نظر تو نہیں رکھ رہا ہے۔

''ہو.....ہو.....'' جب یہ بات باپ نے اپنے دوست کو بتائی تھی تو اس کا دوست قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔

''تم ہنسے کیوں؟'' باپ نے پوچھا۔

دوست سنجیدہ تھا۔ بچوں سے ڈرنا پڑتا ہے۔ وقت کتنا بدل گیا۔ ہم چھوٹے تھے تو ماں باپ سے ڈرتے تھے اور ماں باپ ہم پر نظریں رکھتے تھے کہ کہیں ہم کچھ غلط تو نہیں کرنے جا رہے.....''

''ہاں۔ وقت وقت کی بات.....'' باپ بھی سنجیدہ تھا۔ آج بچوں کو ہماری طرف سے کھلی چھوٹ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں، بچے جوان ہو رہے ہیں تو وہ اڑیں گے ہی مگر یہی بات بچے ہمارے لئے بھول جاتے ہیں۔ بچے نظر رکھتے ہیں کہ باپ کہاں جا رہا ہے؟ کس سے چیٹ کر رہا ہے۔ سیکس یا ہاٹ چیٹ تو نہیں کر رہا۔ فیس بک میں باپ کی کتنی فرینڈس ہیں۔ فون پر باتیں کر وتب بھی بچے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں۔''

''تو تم اسے کان کہتے ہو.....'' دوست نے ہنسنے کی کوشش کی مگر گہری سنجیدگی نے یہ موقع اس سے چھین لیا تھا۔ ہم شاید ایک بیوی سے کچھ زیادہ چاہتے ہیں۔ یا ایک بیوی سے ہمارا دل نہیں بھرتا۔ ہماری عمر میں ہمارے ماں باپ ایسی خواہشوں کو دفن کر چکے ہوتے تھے۔ ہم نہیں کر سکتے..... ہمارے لئے جسم کے اندر موجود، دہکتی آگ کی بھٹی کو سلا دینا آسان نہیں ہے۔ اور اسی لئے شاید ہم کچھ زیادہ ہی چاہتے ہیں۔ یا ہماری مانگ جسم سے کہیں زیادہ آگ کی ہوتی ہے۔''

باپ گنگناتے ہوئے باہر نکلے۔ بیٹا کسی سے موبائل پر گفتگو میں مصروف تھا۔ باپ نے اس کے کندھے تھپتھپائے۔ یہ اس کے پیار کا انداز تھا۔ باپ نے کچن سے آتی ہوئی اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جو باہر نکلتے ہوئے اسے دیکھ کر شاید تھوڑا سا مسکرائی تھی..... باپ آگے بڑھے تو دیکھا، ان کے باپ بالکنی میں کرسی پر بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے..... سب اپنی زندگی میں مصروف ہیں اور اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے..... اپنے کمرے میں دوبارہ واپس آنے تک اندھیری پرچھائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ باپ کی آنکھوں میں اتر چکا تھا.....

کیا یہ لوگ اپنی دنیا میں واقعی مصروف تھے.....؟ باپ کو شک ہو رہا تھا۔ کہیں بیوی اس لئے تو نہیں مسکرائی کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ اور بیٹے نے موبائل پر گفتگو کرتے ہوئے اسے نظر انداز کیا ہو..... اور اس کے باپ.....؟ دراصل وہ بھی کتاب نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ اسے نظر انداز کر رہے تھے.....

باپ ایک سہمی ہوئی دنیا میں تھے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اب اکثر اس دنیا کے دروازے ان کے لئے کھل جاتے تھے — اور جب جب ایسا ہوتا وہ خود کو اس دنیا سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے۔ مثال کے لئے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ لے

کر بیوی کے پاس جاتے۔ دراصل ایسا کرتے ہوئے وہ بیوی کے موڈ کو سمجھنا چاہتے تھے..... بیوی کے اندر غصے کا ابال ہوتا تو باپ سمجھ جاتے کہ بیوی کو ان کی کسی نہ کسی غلط حرکت کا علم ہو گیا ہے..... بیوی کے پاس اس کی حرکتوں کے لئے ایک ہی جواب ہوتا.....

''اب بدل ڈالو اپنے آپ کو.....سنا تم نے.....اب تم بوڑھے ہو رہے ہو.....''

کہانی کی واپسی

کہانی کو یہ انداز پسند نہیں آیا تھا.....

''یہ باپ، بیٹا کیا ہے.....؟''

''دو کردار ہیں.....''

''کرداروں کے نام نہیں ہوتے.....؟''

''ہوتے کیوں نہیں ہیں۔ ہر کہانی میں ہوتے ہیں۔''

''پھر.....؟''

''اسی لئے یہاں کرداروں کے نام رکھے ہی نہیں۔'' مصنف مطمئن تھا۔

''نہیں نام کی ضرورت ہے'.....کہانی بضد تھی۔ کل سے کہیں زیادہ آج نام کی ضرورت آن پڑی ہے.....

کہانی ہنس رہی تھی.....شیکسپیئر سے یہ دنیا کافی آگے نکل آئی ہے..... سمجھے۔ ایک نئے ینکستان نے خاموشی سے تمہاری مہذب دنیا کے دروازے پر دستک دی ہے۔

''ہاں، میں اسی نیکستان کی کہانی لکھنے جا رہا ہوں.....'' مصنف ابھی بھی مطمئن تھا۔ ''اس لئے میں نام کی ضرورت قطعی طور پر محسوس نہیں کرتا۔ یہاں، اس ینکستان میں تمام اڑانیں ایک جیسی ہیں..... مقاصد ایک جیسے اور.....فیس بک سے لنک دین اور ٹوئیٹر تک.....گاؤں کا ینکستان بھی ۴۰ فیصد تک تمہارے چمکدار مال اور ملٹی پلیکسیز کا حصہ بن رہا ہے.....تمہارے جی میٹ اور مینجمنٹ کے اسکولوں میں داخل ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ تمہاری پارٹیوں کی نئی نئی ینکستان لہر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کھادی کے کرتے، پائجامے اور ٹوپیوں میں تمہاری سیاست کی ٹوٹی بیساکھیاں بھی سنبھال رہا ہے.....فیشن سے عام زندگی تک یہاں سب کچھ بدل رہا ہے.....سب کی اڑانیں الگ اور مقصد بھی الگ ہیں.....''

کہانی کو ناراضگی تھی — ''ایسے نہیں چلے گا۔ نام رکھو.....''

مصنف ابھی بھی بحث کے موڈ میں تھا.....''نام سے مذہب کا راستہ بھی کھلے گا.....''

''تو.....؟''

''میں یہاں مذہب نہیں چاہتا تھا.....''

''تمہارا یہ ینکستان اڑتے ہوئے پہلے سے کہیں زیادہ مذہب سے وابستہ ہو چکا ہے۔ اس لئے مذہب تو آئے گا.....''

''بس یہی تو میں نہیں چاہتا تھا.....''

''تمہارے چاہنے سے یہاں کچھ نہیں ہوتا.....''

''پھر.....؟''

''کچھ نہیں.....کرداروں کے نام رکھ لو.....نام ہی بکتے ہیں۔'' کہانی اس بار ناراض ہوکر غائب ہوگئی تھی.....

''معاف کیجئے گا شاید اب کرداروں کے نام رکھنا ضروری ہوگیا ہے.....''

ہم ایک برانڈ بنتی تہذیب یا دنیا کے دروازے پر ہیں۔ جہاں نئی پرانی، انٹرنیشنل ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سکے چل رہے ہیں۔ یہاں نوجوانوں کے لئے الگ سے مال، بنائے جارہے ہیں۔ یہاں بچے بھی ایک پروڈکٹ ہیں۔اور ۴۰پلس کی ضروریات کا خیال بھی رکھا جارہا ہے.....

شاید اسی لئے سارہ جہانگیر کی ناک پر ہمیشہ غصہ رہتا تھا۔

''میں کہتی ہوں۔اس کے پنکھ کاٹ دو.....''

''نہیں.....''

''ایک دن پچھتاؤ گے.....''

جہانگیر ذرا اپنی سوئفٹ ٹائی کے کناروں سے کھیلتا ہوا مسکرا دیتا تھا....''کیوں پچھتاؤں گا؟.....سارہ تم بدلتی ہوئی دنیا کو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔''

اور بس اسی کوشش میں ایک دن چپکے سے یہ کہانی شروع ہوگئی۔

جہانگیر مرزا اور سارہ جہانگیر کی کہانی.....

اور نئی صدی میں آنکھیں کھولنے والے ان کے بیٹے کی کہانی.....

اور اس پرندہ کی کہانی بھی جو آسمان پر پرواز کرتے ہوئے 'جوناتھن سوئفٹ' کی طرح اپنی اڑان کو روکنا نہیں چاہتا تھا.....

◀◀ ● ▶▶

▶ D-304 Taj Enclavie Gita Colony
Delhi-110031

'ثالث' میں اپنے کاروبار، ادبی، سماجی اور دیگر سرگرمیوں/کتابوں/اداروں کا اشتہار دے کر بین الاقوامی شہرت اور ہمہ جہت رابطے کو یقینی بنائیں۔

پورا صفحہ:	دو ہزار روپئے	آدھا صفحہ:	ایک ہزار روپئے
کور (اندرونی)	تین ہزار روپئے	بیک کور:	پانچ ہزار روپئے

● صفدر امام قادری

ظفر کمالی کی رباعیاں

فن کاروں کی صف میں تو شامل ہی نہیں؟ یا فن کی عدالت میں عادل ہی نہیں؟
کیوں تجھ سے گریزاں ہیں نقّاد ظفر تو کچھ بھی نہیں؟ ذکر کے قابل ہی نہیں؟

سُن! سُرمۂ اربابِ بصیرت ہوں میں قسمت سے جو ہاتھ آئے، وہ دولت ہوں میں
اے دورِ رواں مجھ سے کترا کے نہ چل پہچان مجھے، تیری ضرورت ہوں میں

ظفر کمالی کی رباعی گوئی پر گفتگو کی حدود مذکورہ دونوں رباعیوں سے متعیّن ہوتی ہیں۔ایک طرف ناقدریِ زمانہ کی شکایت ہے تو دوسری طرف اپنے کارناموں پر مکمّل اعتماد بھی ہے۔ یہ دونوں اگر ''شاعرانہ صداقت'' کے بجائے حقیقی صورتِ حال کے ترجمان بن جائیں تو نقادوں کی گریزپائی کا تدارک اور شاعر کے اپنے بارے میں دعوے کی جانچ پرکھ اور ثبوت کے لئے ایک نثری تحریر کا جواز قائم ہوتا ہے۔''سمٹے تو دلِ عاشق'' کے انداز میں کہہ دیں کہ ظفر کمالی کا دعوا صحیح ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک تنقیدی خدمت گار کے لئے اس دعوے کی تہہ میں اُتر کر شاعر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔اس تحریر کو شاعر کے دعوے کی تصدیق و توثیق یا نادرستی کے عالَم میں انکار کی مدلّل تصویر سمجھنا چاہیے۔

ظفر کمالی پچھلے بیس پچیس برسوں سے گوشہ نشینی کے عالَم میں رہتے ہوئے دھیرے دھیرے تنقید، تحقیق، ظرافت، شخصی مرثیہ گوئی، ادبِ اطفال، ترجمہ نگاری، مقدّمہ نویسی، ادبی صحافت، اردو اور فارسی میں کتبِ نصاب کی معیاری تدوین وغیرہ شعبوں کے تحت پختہ روشنائی میں ہزاروں صفحے شائع کر چکے ہیں۔ایک درجن کے آس پاس مطبوعہ جلدوں کے ساتھ رسائل کے اوراق میں بکھری تحریریں بھی کئی کتابوں میں سمائیں گی۔ تصنیفی وفور کا یہ فضلِ خدا یہ عالَم ہے کہ ان کے پاس ہر وقت کئی کتابوں کے مسوّدات غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہوتے ہیں۔اس مقدار، معیار اور جاں فشانی کے باوجود نہ قدر و منزلت کی طلب اور نہ شہرت پسندی کا رتّی بھر ہَوکا۔کتاب آئی، احباب اور عمائدین کے حلقے میں پہنچا دی گئی اور اگلے دن سے دوسری کتاب کی تیّاری شروع ہوگئی۔کسی سے تبصرہ لکھوالیں، کسی سے تقاضہ کریں کہ ہماری کتاب پر بھی دو صفحے لکھ

دو؛ ایسی کوئی خو نہیں اپنائی۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی متعدّد کتابوں پر کسی نے نہ تبصرہ کیا اور نہ ان کے کسی کارنامے کا احتساب۔ کسی اکادمی نے مالی اعانت دی اور نہ انعام کے لائق سمجھا۔ دل میں بہت ملال ہوا تو قدردانوں کو کبھی ظریفانہ لہجے میں اور کبھی رباعی کی نزاکتوں کے پردے میں حرفِ شکایت پیش کر کے پھر واپس گوشۂ گم نامی میں سمٹ جانا ظفر کمالی کو اگلے وقتوں کے لوگوں میں پہنچا دیتا ہے۔ شعر و ادب کی یہ فقیرانہ لَے ہوس پسند زمانے میں شاید ہی کسی دوسرے کے حصے میں آئی ہو۔ خوبی یہ کہ سُر تال اتنے سَدھے ہوئے ہیں کہ متعدّد طرح کے ہنگاموں کے بیچ اس ادبی صوفی کا آہنگ ایک لمحے کے لئے بھی بگڑتا نہیں۔ اصول بہ قولِ شاعر پہلے سے موجود ہے: گوشے میں ادب کے مجھے آرام بہت ہے۔

ظفر کمالی کی شخصیت اور کارناموں پر جب نگاہ پڑتی ہے تو نہ جانے کیوں الطاف حسین حالی کی شبیہہ آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔ وہ جن لوگوں کے بیچ رہے، اپنے عہد میں ان سے کم شہرت پائی۔ جہاں جہاں گئے، کبھی بھی کوئی بڑا منصب انھیں پیش نہیں ہوا۔ 'انجمنِ پنجاب' میں محمد حسین آزاد کے سامنے حالی معمولی حیثیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ علی گڑھ کی کانفرنسوں میں حالی سے زیادہ شبلی کی نظموں کا انتظار کیا جاتا تھا۔ غالب کے حلقۂ ارادت کے صفِ اوّلین میں حالی کی گنتی کہاں ہوتی ہے؟ حالی نے کبھی اپنی ادبی اہمیت کے لئے کوئی بلند بانگ دعوا کیا اور نہ کوئی منضبط انداز میں اپنی پہچان کے لئے وہ مُصر رہے۔ ادارہ سازی جس سے شناخت کا اضافی سلسلہ قائم ہوتا ہے، اس سے بھی وہ غافل رہے۔ حالی کی وفات کے اب سَو برس پورے ہونے کو آئے، کتنے مسلّمات از خود وقت کی گرد میں ہَوا ہو گئے لیکن ایک الطاف حسین حالی ہیں جنھیں ہم اردو زبان کا عظیم غزل گو، نظم نگار، نقّاد، سوانح نگار، معاشرتی ناول نگار نہ صرف یہ کہ مانتے ہیں بلکہ گذشتہ سَو برسوں میں ان کے مقام و مرتبے میں دوسرے ہم عصروں کے مقابلے اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ اپنی علمی صلاحیت کا ایک ایک رَس نچوڑ کر بے مثال ادبی صحیفوں کا روپ دے دیا۔ سرسید، نذیر احمد، شبلی اور محمد حسین آزاد کے طلسماتِ ہنر کے فیضان میں ایک ٹھہراو دکھائی دیتا ہے لیکن حالی جیسا گوشہ نشیں اور خاموش طبع شخص اپنے سَو برس سے زیادہ پُرانے کارناموں کی نئی نئی تعبیرات کی بہ دولت اپنے زمانے کے مقابلے میں آج زیادہ مقبول و محترم ہوتا جا رہا ہے۔ آنے والے وقت میں یہ سلسلہ یقینی طور پر قائم رہے گا۔ ظفر کمالی کی شخصیت اور کارناموں کو حالی کے تناظر میں دیکھنے سے اپنے آپ بہت ساری چیزیں روشن ہو جائیں گی۔

ظفر کمالی کے کارناموں کا ایک بنیادی محور تحقیق ہے۔ قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی روایت میں ظفر کمالی کو نہیں شامل کرنا ان کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ متعدد رسائل و جرائد میں اُن کے جو تحقیقی تبصرے سامنے آئے، وہ اہلِ علم کے لئے چشم کُشا ہیں۔ آج سے تقریباً دو دہائی قبل ماہنامہ ''شاعر'' میں عطا کاکوی کی کتاب 'غلطی ہائے مضامین' اور ''زبان و ادب'' میں 'قاضی عبدالودود اور گیان چند جین' عنوانات سے جو اُن کے تحقیقی تبصرے شائع ہوئے، وہ اس بات کا ثبوت تھے کہ ادبی تحقیق کی آئندہ فصلِ بہار میں ایک شاخ ظفر کمالی بھی ہوں گے۔ بعد میں رشید حسن خاں، گیان چند جین، حنیف نقوی، ابوالبرکات وغیرہ کی کتابوں اور سیّد محمد محسن کے مضمون پر اُن کے شائع شدہ تحقیقی نوعیت کے تبصرے ظفر کمالی کے عمقِ علمی کا واضح ثبوت ہیں۔ ڈراموں کی تحقیق و تنقید ظفر کمالی کے یہاں بنیادی اہمیت رکھتی ہے جسے انہوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ 'روحِ ادب'، 'معلّمِ اردو'، 'زبان و ادب' اور 'عہد نامہ' وغیرہ رسائل میں اُن کے شائع شدہ ڈرامے

سے متعلق بنیادی نوعیت کے مضامین ایک مدّت پہلے شائع ہو چکے ہیں جن کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔

گذشتہ برسوں میں ظفر کمالی نے نہایت سنجیدگی سے مقدّمہ نویسی کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ظفر کمالی جیسے گوشہ نشیں صاحبِ نظر سے کوئی مقدّمہ یا تقریظ کیوں لکھوائے؟ عام طور سے یہ کام چمکتے ہوئے ستاروں اور پورے طور پر بزرگ نقادوں کے سپرد ہوتا ہے جن کی تحریروں کے بارے میں صاحبانِ کتب کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ اُن کے ادبی قد و قامت میں اضافہ کا باعث بنیں گی۔ چاہے وہ بڑی شخصیت اُن کے مسوّدے کو سونگھ کر یا اِدھر اُدھر سے تاک جھانک کر ہی دس بیس جملے عمومی انداز کے گھسیٹ مارے۔ ظفر کمالی کے مقدّمے ماسوائے غضنفر، اکثر ان ہی لوگوں پر ہیں جو عرفِ عام میں ''مقامی'' قرار دیے جاتے ہیں۔ غضنفر کا وطن بھی 'سارن' ہی ہے، اس اعتبار سے انھیں غیر مقامی کیوں سمجھا جائے — 'نوید سحر' (فہیم جوگاپوری)، 'شرابِ نظمیں' (طلحہ رضوی برق مرتبہ التفات امجدی)، 'رباعیاتِ قمر' (قمر سیوانی)، 'میرا فرمایا ہوا' (مظاہر الحق)، 'دریا ٹوٹ جاتا ہے' (فاروق سیوانی)، 'خاکسارانِ جہاں' (خورشید احمد خاں)، 'جنوں کی آگہی' (کوثر سیوانی) کے سلسلے سے ظفر کمالی کے جو تفصیلی مقدّمے شائع ہوئے ہیں، انھیں اگر وسیع پیمانے پر توجّہ سے پڑھ لیا جائے تو اُن سے مقدّمہ لکھوانے کے لئے اہلِ قلم کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے جس مصنّف کی کتاب کا بھی مقدّمہ لکھا، اس مصنف اور وہ کتاب پڑھنے والوں کو اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہے۔ وہ مدلّل مداحی کے مقابلے تحقیقی اور علمی مواد جمع کر کے اس مصنّف کا ایسا بھرپور تعارف پیش کر دیتے ہیں جس سے لکھنے والے کا ادبی مقام، جس قدر بھی وہ ہے، اسے متعیّن کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان مقدّموں کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اُن سے کتاب کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ غضنفر کے خاکوں کے مجموعے 'سرخ رو' میں ظفر کمالی نے جو مقدّمہ لکھا، اُس سے زیادہ بھرپور کوئی دوسرا مضمون ابھی تک غضنفر کی خاکہ نگاری کے بارے میں سامنے نہیں آ سکا۔ ایک مقدّمہ نویس کے حیثیت سے ظفر کمالی کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ کتاب کی طرفیں اور تہیں اتنا دل لگا کر کھولتے ہیں جس سے زیادہ کی عام صورتوں میں گنجائش ہی کم ہوتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ مقدّمہ نویس کے طور پر وہ کتاب اور صاحبِ کتاب کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

ظفر کمالی کی تحقیق کا ایک مرکز اُن کے استاد احمد جمال پاشا کے سلسلے سے تحقیق و تنقید سے قائم ہوتا ہے۔ ''متعلقاتِ احمد جمال پاشا'' عنوان کی تحقیقی کتاب ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس سلسلے سے رسائل و جرائد میں ان کے دیگر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ احمد جمال پاشا سے متعلق یہ تمام متفرّقات کم از کم چار پانچ کتابوں کا حصہ بنیں گے۔ ظفر کمالی کی تحقیق کا اساسی موضوع ظرافت اور تذکرہ نویسی بھی ہے۔ شاید یہ احمد جمال پاشا کی تربیتِ خاص سے صیقل ہوا۔ انہوں نے 'بہار میں اردو ظرافت'، 'سارن میں اردو ظرافت' اور سارن کے شعرا اور نثر نگاروں کے حوالے سے متعدّد تحقیقی مضامین رسائل میں شائع کیے ہیں۔ ان کی کتاب 'نمک دان' کے فلیپ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ درج بالا موضوعات پر اُن کی مختلف جلدیں شائع ہوں گی۔

ان تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ گذشتہ بیس برسوں میں ظفر کمالی نے شعر گوئی پر خاص توجّہ دی۔ ظریفانہ شاعری کے تین مجموعے — 'ظرافت نامہ' (۲۰۰۵ء)، 'ڈنک' (۲۰۰۹ء)، 'نمک دان' (۲۰۱۱ء) کے علاوہ بچّوں کے

سلسلے سے منظومات کا مجموعہ 'بچّوں کا باغ' (۲۰۰۶ء)۔ اس کے علاوہ 'متعلّقاتِ احمد جمال پاشا' میں ان کی بارہ غزلیں اور سَو اشعار پر مشتمل ایک شخصی مرثیہ احمد جمال پاشا کی یادوں کے نام اس کتاب میں موجود ہے۔ شاعری کا مطبوعہ متن پانچ سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ رسائل میں بکھری ہوئی تخلیقات اس پر اضافہ ہیں۔ ظریفانہ اور بچّوں کی شاعری سے الگ انہوں نے رباعی گوئی پر توجّہ کی تو ۲۰۱۰ء میں ۳۸۵ رباعیات کا مجموعہ 'رباعیاں' عنوان سے سامنے آیا۔ رباعی کو سب نے مشکل فن مانا ہے اور استادانہ رکھ رکھاو کے بغیر یہاں لوگوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ دو ڈھائی برس کی مدّت میں اب یہ تازہ 'رباعیاتِ ظفر' ہمارے مطالعے میں شامل ہے جہاں پانچ سو سے زیادہ رباعیاں موجود ہیں۔ تین ظریفانہ مجموعے، دو مجموعۂ رباعیات اور ایک بچّوں کی شاعری کے مجموعے کے باوجود ظفر کمالی اپنی شاعرانہ شناخت اور عظمت کا اعلان کرنے کی طرف بڑھنے کے بجائے خاموشی سے اگلی کتابوں کا خام مواد تیار کرنے میں منہمک ہیں۔ ایسی بھرپور اور تصنیف و تالیف کی کثیر الجہتی کو دیکھتے ہوئے آخر ہمیں حالی کیوں نہ یاد آئیں۔ آخر کوئی تو بات ہوگی کہ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کا مرثیہ لکھنا طے کیا تو انھیں حالی کے 'مرثیۂ غالب' کی بحر اور ایک بند میں اشعار کی تعداد، سب نے اس طرح مبہوت کر دیا کہ انہوں نے بھی اسی رنگ اور روپ کو اپنے مرثیے کے لئے رہنما مانا۔

ظفر کمالی صنفِ رباعی کی طرف سرِ راہے نہیں چلے آئے۔ پُرانے زمانے میں قصائد اور موجودہ زمانے میں رباعیات ہر شاعر اپنے دیوان یا مجموعۂ کلام میں دو چار دس کی تعداد میں اس لئے شامل رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کے استادانہ رُخ کا اقرار ہو سکے۔ لیکن یہ اکثر و بیش تر منہ کا مزا بدلنے کے لئے ہوتا ہے۔ یاد آتا ہے کہ آج سے پچیس برس قبل ظفر کمالی نے 'زبان و ادب' میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں رباعی کے اوزان کے سلسلے سے اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن بہت عالمانہ گفتگو کی تھی۔ یہ ذوق اور علم تہہ نشیں موج کی طرح دو دہائیوں میں تپ کر ایک مستقل تخلیقی شوق میں اب سامنے آیا ہے۔ رباعیوں کے دونوں مجموعوں پر غور کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظفر کمالی شاید رباعی گوئی کے لئے ہی بَنے تھے۔ ایک خاص بات ان رباعیوں میں یہ پیدا ہوگئی ہے کہ ظفر کمالی کی ادبی شخصیت کے تینوں اساسی پہلو تحقیق، ظرافت اور شاعری یہاں باہم شیر و شکر ہو کر رباعی کے فن میں اس طرح ڈھل گئے ہیں جیسے یہیں مکمّل ظفر کمالی ہمیں ملیں گے۔ میرؔ کی غزل میں میر کی پوری شخصیت ایک مرکز پر سمٹ آتی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح ظفر کمالی کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی شخصیت، ان کے فلسفیانہ اور فکری زاویے، زندگی اور کائنات کے بارے میں مخصوص تصوّرات سب کے سب ان رباعیوں میں یوں روشن ہوئے ہیں جیسے یہ تمام کام رباعیات کے لئے ہی مخصوص تھے۔ شاید قدرتِ کلام کا اس سے بہتر کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

رباعیات کو بالعموم تفکّر اور تبلیغ و اصلاح کا محور مانا جاتا ہے۔ تھوڑے سے نمونے ان سے الگ موضوعات کے بھی ہیں لیکن رباعیوں کے مجموعی سرمایے میں اس موضوعاتی گریز کی حیثیت آٹے میں نمک سے بھی کم ہے۔ ہیئت اور اوزان میں تو یوں بھی پہلے سے ہی سب کچھ طے شدہ ہے۔ اس لئے رباعیوں میں اکثر ایسے شعر از یادہ کامران اور مقبول ہوتے ہیں جن کے خمیر میں فکر و فلسفہ کی مٹّی ذرا زرخیز ثابت ہو۔ اسی لئے رباعی گوئی شاعری کی دوسری صنفوں کے مقابلے زیادہ سنجیدہ، علمی اعتبار سے باوقار اور باعثِ توجّہ تسلیم کی جاتی ہے۔ جن شعرا نے باضابطہ طور پر رباعیاں کہی

ہیں، اکثر نقّاد اُن کے فکری دریچوں کو کھولنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ لازمی فائدہ غزل گو کے حصے میں اکثر و بیش تر نہیں آتا۔

ظفر کمالی نے اپنی تحقیق میں بار بار باطل ادبی قوّتوں کا بڑی کامیابی کے ساتھ دلائل و شواہد کے ساتھ بطلان کیا ہے۔ ظریفانہ شاعری میں تو ایسے ہر چہرے کو نشانۂ طنز بنایا ہے جو حقیقت میں کھرا تو نہیں ہے لیکن خود کو کھرا ظاہر کرنے کا فریب کر رہا ہے۔ اپنی رباعی گوئی میں بھی ظفر کمالی بنیادی طور پر وہی بات کہہ رہے ہیں کہ سچ حقیقی ہے اور جھوٹ باطل ہے۔ یہ ایک پُر لطف جستجوئے علمی ہے اور تفتیش و تحقیق کا امتحان کہ ایسے فکری حصار میں رہتے ہوئے ظفر کمالی رباعیوں کی تخلیق کے دوران کیا ظرافت نگار یا محقّق کے طور پر موجود ہوتے ہیں یا رباعیات کے کاغذی پیرہن کی نرمی اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے نئے سِرے سے رباعی گو کی اپنی ایک علاحدہ شخصیت خلق کرتے ہیں؟ اپنے افکار و نظریات کی پیش کش میں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رباعی گو کی جگہ پر کبھی محقّق اور کبھی نرے ظریف بن کر اُبھرتے ہیں؟ کیا انہوں نے صنفِ رباعی کے اصول و ضوابط کو اِس قدر جی جان سے لگایا کہ وہ سارے تجربے اور صنفی توسیعات کے کام دھرے رہ گئے جس کے بغیر کوئی بڑا شاعر وجود میں نہیں آ سکتا؟

دنیا کا ہر مذہب اور ادب، صالح اقدار کی تبلیغ اور تشہیر اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے۔ رباعی کی روایت کہیں نہ کہیں مشاہدۂ کائنات کے مرحلے میں پند و موعظت کی پیش کش سے بندھ گئی۔ چار مصرعوں کی ذرّہ برابر دنیا ہے مگر اصول اور روایت کی ایک مستحکم شاہ راہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس پُل صراط کے ایک طرف آگ ہے تو دوسری طرف گہری کھائی۔ کب اچھّا بھلا شاعر بزمِ رباعی میں راندۂ درگاہ قرار دیا جائے گا، یہ کسی کو پتا نہیں۔ اچھی اور بڑی باتیں کرنے والے بہت سارے افراد پہلے بھی آ چکے ہیں اور تمام مذاہب کے مبلّغین انھی کاموں پر مامور ہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا آج کی دنیا میں اخلاق اور پند کی باتیں سُنی جا سکتی ہیں؟ کیا ادبی معاشرہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی صنفِ ادب کے گھر آنگن میں بیٹھ کر تبلیغ و اصلاح کے لازمی بندھن میں پڑھنے یا لکھنے والا بندھا رہے؟

ان سوالوں کے بیچ ظفر کمالی کی رباعیات کا مطالعہ کئی جہات سے تازہ اور خوش گوار ہَوا کے جھونکے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ ظفر کمالی کی ظرافت نگار کی حیثیت بنیادی ہے، اس لئے ان سے بہتر کون یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ظرافت ہو یا تبلیغ و اصلاح، ادب میں انھیں تہہ نشیں موجوں کی طرح ہی رہنے دینا ہے۔ اس سے جہاں بھی بات آگے بڑھی، ادب عریاں ڈھنڈورا بن جائے گا؛ اور تب اسے ادب کون مانے گا؟ 'رباعیاتِ ظفر' میں خیر و شر کا کوئی اعلان تو نہیں کیا گیا لیکن ان تمام باتوں کو پیش کرنے کا ایک علاحدہ ڈھب شاعر نے اختیار کیا۔ وہ سچ اور جھوٹ یا اچھّے بُرے کی مبارزت میں انسانوں کو نفسیاتی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مرحلے میں وہ کئی بار دونوں طرف سے خود ساختہ کردار قائم کرتے ہیں اور ان کی گفتگو یا مباحث میں کب خیر کی تبلیغ یا شر کی مخالفت شروع ہوگئی، یہ پتا ہی نہیں چلتا۔ کبھی کبھی رباعی کے ظاہری الفاظ تو کچھ کہتے ہیں لیکن وہاں بین السطور میں کچھ دوسرے ہی بڑے گہرے معنی پیوست رہتے ہیں۔ صنفِ رباعی کی مزاج شناسی کا ظفر کمالی کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے:

جو جُھکنے کی منزل پہ اَکڑ جاتی ہیں　　قومیں وہ نہیں بنتیں، بگڑ جاتی ہیں

اخلاق کی میراث اگر لُٹ جائے　　تہذیب کی سانسیں بھی اُکھڑ جاتی ہیں

مت رکھ تو کبھی بغض کے زینے پر پانو　　رکھنا ہے تو رکھ، دل کے کینے پر پانو
تو راہِ صداقت سے نہ کھینچ اپنے قدم　　رہنے دے شیطان کے سینے پر پانو

کہتے ہیں جنھیں لوگ قرینے والے　　ہیں تلخیِ ایّام کے پینے والے
طوفان میں کھیتے ہیں وہ اپنی کشتی　　مرنے سے کہاں ڈرتے ہیں جینے والے

دشمن سے ضروری تو نہیں جنگ وجدال　　حکمت کے تمانچوں سے کروں چہرا لال
معلوم نہیں ظفؔر حریفوں کو مِرے　　پھولوں کی چھڑی سے بھی کھنچتی ہے کھال
کمزوروں کو طاقت سے جو تولتے ہو　　اپنا ہی بھَرم خود سے تم کھولتے ہو
اللہ کہیں بھیج نہ دے موسیٰ کو　　فرعون ہو کیا؟ بول بڑے بولتے ہو

محبوب سبھوں کو ہے انا کا جامہ　　مطلوب کسے نہیں ریا کا جامہ
لوگوں نے اسے اُتار پھینکا ہے ظفؔر　　جسموں پہ کہاں رہا حیا کا جامہ

ظالم کی تدابیر سے کیا ہوتا ہے　　زندان کی زنجیر سے کیا ہوتا ہے
جب سر کو ہتھیلی پہ لئے باغی آئیں　　جلّاد کی شمشیر سے کیا ہوتا ہے

ظفؔر کمالی صورت سے مذہبی رنگ میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ظاہراً مذہبی افراد اکثر ہمارے غزل گوشعرا کا نشانہ بنتے رہے ہیں لیکن ظفر کمالی نے مذہب سے زندگی کا وہ آفاقی راگ اپنے لئے منتخب کیا جس کی ضرورت اس کائنات کو ہمیشہ رہے گی۔ یہاں نفرت کے بجائے محبّت، باطل کے مقابلے حق، بُرے کے مقابلے اچھّے کے لئے انتہائی درجے کی جوجستجو ہے، وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر مذہبی فکر کی سماجی بنیادوں کو روشن تر کرنے کی شاعر کی مہم کا ایک حصّہ ہے۔ یہ کام عام طور پر مذہبی مبلّغین کو زیادہ سوجھتا ہی نہیں۔کبھی بھولے بھٹکے سے اس موضوع کے اِردگرد یہ لوگ پہنچ بھی جاتے ہیں تو اکثر اُن کے اعمال سے اس کی مطابقت قائم نہیں ہوتی اور بات بے اثر ہوجاتی ہے۔'رباعیاتِ ظفر' کے آغاز میں ۳۹ حمدیہ اور نعتیہ رباعیات ہیں۔انھیں روایت کا حصّہ سمجھ کر یہاں سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں۔ یہ بھی موزوں نہیں کہ ان رباعیات کو شاعر کی مذہب پسندی کا ایک ثبوت تسلیم کر کے چھوڑ دیا جائے۔ میرے لئے یہ رباعیاں عصرِ حاضر کے ایک دیانت دار اور مضطرب دل کی ایسی تڑپ ہیں جہاں ذات اور کائنات کے اوبڑ کھابڑ راستوں پر مذہبی فکر کی نرمی سے یہ صورت پیدا کی جارہی ہے کہ راستوں کے کچھ

کانٹے کم ہوسکیں اور لوگوں کے پانو میں چھالے نہ پڑیں۔خدا، رسول اور مذہبی امور کی گفتگو ظفر کمالی کے یہاں زندگی کی نرمی، محبّت اور سچّائی میں گھُل مل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔اقبال کی دائمی حیثیت اس وجہ سے بھی قائم ہوئی تھی کیوں کہ ان کے یہاں مذہب انسانوں کے سماجی اور قومی مسائل میں ایک قطب نما کا کام کرتا ہے۔ظفر کمالی اپنی رباعیات سے ایسے نازک اور لازم کام کو سرانجام دے رہے ہیں۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

دُکھ کے مارے، گِرے پڑے، سب بیمار　　تیرے در پر آئیں ہو کر لا چار
سننے والا یہاں کہاں اور کوئی　　مظلوموں، بے کسوں، گداؤں کی پُکار
تھک جائیں قدم، ذوقِ یقیں تھک جائے　　کمزور نہ منزل کے قریں تھک جائے
اللہ! مرے سجدوں کی سُن لے پکار　　ڈر ہے نہ کہیں میری جبیں تھک جائے
جاہل ہوں، مجھے علم کی تنویر بھی دے　　آئینے کو میرے نئی تصویر بھی دے
احساس کی جاگیر بھی کر مجھ کو عطا　　خوابوں کو مِرے خیر کی تعبیر بھی دے
تاریک نگاہوں میں چمک دے یارب　　چہرہ ہے مرا زرد، دَمک دے یارب
قاروں کے خزانے کی طلب مجھ کو نہیں　　کھانے کے لئے نان ونمک دے یارب
ذرّہ ہوں، ستاروں کی چمک دے یارب　　کردار میں پھولوں کی مہک دے یارب
بے چین جو دکھیاروں کے دکھ سے ہوجائے　　سینے میں وہی دردوکسک دے یارب
پردیس کے باسی کو وطن مِل جائے　　جو روح بھٹکتی ہو، اُسے تن مل جائے
اک اور دعا ہے تو اِسے بھی سُن لے　　ہم گھر پہ مریں اور کفن مل جائے

ظفر کمالی نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ''مکاتیبِ ریاضیہ'' سے کیا تھا۔مولانا ریاض احمد کے اپنے مریدوں کے نام لکھے گئے یہ خطوط ہیں۔مولانا ریاض احمد ایک صاحبِ طریقت صوفی تھے۔ظفر کمالی کے خانوادے میں مولانا ریاض کے متعدّد مریدین موجود ہیں۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ ظفر کمالی کس صوفیانہ سلسلے یا کس صوفی سے براہِ راست وابستہ ہیں لیکن مولانا روم کے اصول کے مطابق:

''شعر می گویم بہہ از قند و نبات　　من نہ دانم فاعلاتن فاعلات''

ایک نئی حقیقت سامنے آتی ہے۔مولانا روم سیکڑوں شعرا سے اعلا شاعر اور ہزاروں صوفیوں سے بڑے صوفی ہیں۔ظفر کمالی کی ظریفانہ تخلیقات، متعدّد تحقیقی مضامین اور خزائنِ رباعیات میں ایک بھرپور صوفیانہ آہنگ اُبھرتا ہے۔آخر یہ سوچنے کی بات ہے کہ تمام ظریفانہ نظموں کا انجام یا بین السطور میں پیوست مفاہیم میں دردمندانہ رقّت پسندی کیوں عُود کر آتی ہے۔گیان چند جین اور سیّد محمد محسن کے سلسلے سے ان کے سخت ترین تحقیقی مضامین کی پُشت پر کون سا جذبہ کارفرما رہا؟ وہاں اصل معاملہ تحقیقی اخلاقیات اور اسلاف کے کارناموں کے احتساب کے اصول وضوابط سے متعلّق ہے۔''رباعیاتِ ظفر'' میں بار بار انا پسندی، شہرت پسندی، بے عملی، تصنّع، لالچ اور ہَوس پرستی کو آخر کیوں نشانۂ طنز بنایا جارہا ہے؟ ظفر کمالی کو معلوم ہے کہ وہ کوئی پند نامہ نہیں تیار کر رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی پتا ہے کہ وہ کوئی تبلیغی یا اصلاحی مہم نہیں چلا رہے ہیں۔لیکن کوئی دردمند دل رکھنے والا انسان جب ننگی آنکھوں سے زندگی

اور کائنات کی سچّائیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے تو وہ کب تک خاموش بیٹھ سکتا ہے؟ یوں بھی روایتی طور پر فکری موشگافیوں کے لئے رباعیات کی زمین بہت ہموار مانی گئی ہے لیکن ظفر کمالی نے یہ موضوعات علم بگھارنے کے لئے رباعیات میں شامل نہیں کیے۔ یہ باتیں جان اور روح سے نکلی ہوئی ہیں۔ میر کی شاعری کو دل اور دلّی کا مرثیہ کہتے ہیں۔ سب مانتے ہیں کہ زندگی اور کائنات سب ایک مرکز پر سمٹ آئیں تو ایسے مصرعے برآمد ہوتے ہیں:

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں

ظفر کمالی نے زندگی کے اس سوچ کو متصوّفانہ نسخۂ کیمیا سے غور و فکر کا حصّہ بنایا ہے۔ یہ صبر، ضبط اور انہماک کا امتحان بھی ہے۔ زندگی اور کائنات کی خوں آشامی، جھوٹ، مفاد، کینہ اور فریب کی حکمرانی کے بیچ دیکھیے، ظفر کمالی کس صوفیانہ راگ سے اپنے لئے ایک معقول گھنی چھانو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں:

ہو تم میں جو ادراک کے جوہر کی آگ — محسوس کرو، کیا ہے اندر کی آگ
دیکھو تو سہی چیر کے سینہ اُس کا — پانی کی تہوں میں ہے سمندر کی آگ
دریا سے نہیں ریگِ رواں کا رشتہ — کیسے ہو بہاروں سے خزاں کا رشتہ
دشوار بہت ہے اجتماعِ ضدّین — کب سود سے ہوتا ہے زیاں کا رشتہ
دیکھی ہے کبھی تم نے قلندر کی آنکھ — دریا کی نظر گہرے سمندر کی آنکھ
موجود ہیں تم میں بھی یہ آنکھیں ناداں — کھولو تو ذرا اپنے اندر کی آنکھ
قسمت میں تری دیدۂ گریاں کیوں ہے — دشوار بہت زیست کا ساماں کیوں ہے
سوچا ہے کبھی تو نے اے میری قوم — دنیا میں لہو ترا ہی ارزاں کیوں ہے
آندھی کی طرح تیز ہَوا ہے بابا — لگتا ہے کہ چنگیز ہَوا ہے بابا
سینے میں سماتی ہی نہیں ہیں سانسیں — کیوں زہر سے لبریز ہَوا ہے بابا
اس صبر کی قندیل کو جلنے تو دے — امّید کی شاخوں کو پھلنے تو دے
مجھ کو ہے یقیں ہارے گی بازی دنیا — وہ چال اگر چلتی ہے، چلنے تو دے
اچھّا تو نہیں غیر کے بس میں رہنا — چاہے گا بھلا کون قفس میں رہنا
یاری ہے مری گہری استغنا سے — ممکن ہی نہیں دستِ ہوس میں رہنا

رباعیات کے اختصار اور اپنے آپ میں مکمل ہونے سے تحریک پا کر متعدّد شعرا نے افراد کے نام منسوب رباعیات لکھنے کا سلسلہ قائم کیا۔ معتبر شاعر سلطان اختر نے گذشتہ چار دہائیوں میں ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت اور فن کو دھیان میں رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں رباعیات کہیں۔ بدقسمتی سے کتاب کی شکل میں وہ چیزیں اب تک سامنے نہیں آسکیں لیکن وہ رسائل کے دفینوں میں موجود ہیں۔ دس پندرہ برسوں سے عبدالمنان طرزی نے منظوم مقالات اور اشخاص پر تعارفی منظومات کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ ایسی شاعری کے متعدّد انتخابات وہ منظرِ عام پر لا چکے ہیں۔

معروف شاعر راشد طراز نے اشخاص کو سامنے رکھ کر اور ان کے کارناموں کو ردیف کی شکل میں ڈھال کر غزلیں کہیں۔ اس طرح کی تحریروں کا ایک اصولی مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں مضمون کے خانے میں رکھا جائے یا شعری نمونے کے بہ طور سمجھا جائے۔ وہ تخلیقات جو دو اصنافِ سخن کی حد بندیوں کو توڑ کر سامنے آتی ہیں، اُن کی قدر و قیمت کے تعیّن میں بہر طور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بعض افراد نے تاریخِ پیدائش سے لے کر کتابوں کے نام اور اقوال تک اپنی نظموں میں شامل کر دیے۔ اطّلاع بہم پہنچانے کی حد تک تو وہ منظومات کارآمد ہو سکتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی معلومات کے لئے شعر کا تکلّف کیوں؟ یہ کام مضمون نویسی سے ہی بہ طریقِ احسن لیا جا سکتا ہے۔ ہماری تحریر تاریخ اور تہذیب کا مرقّع بن جائے؛ کائنات کے مظاہر کی دستاویزی پیش کش ہو جائے لیکن کیا یہ شرطِ اوّلیں نہیں کہ پہلے وہ شعر تو ہو۔ میر انیس اس لئے محترم ہیں کیوں کہ کربلا کی تاریخیت کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے بنیادی تقاضوں سے ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے غفلت شعاری روا نہیں رکھی۔ حالی کا 'مرثیۂ غالب' اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک ساتھ مرثیہ گوئی، خاکہ نویسی، سوانح نگاری، روزنامچہ نگاری اور رپورتاژ کی جلوہ سامانیاں تو ہیں لیکن سب باتیں شاعری کے بہترین نمونوں کے حوالے سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ظفر کمالی شاعر سے پہلے محقّق اور تاریخِ ادبِ اردو کے بہترین طالب علم ہیں۔ اس لئے انھیں صنفی حد بندیاں توڑنے اور نتیجے میں شاعر کی حیثیت سے نامراد ہونے کے بہت سارے واقعات لازمی طور پر معلوم ہوں گے۔ ان کے پہلے مجموعۂ رباعیات میں احمد جمال پاشا، حنیف نقوی، ناوک حمزہ پوری، طلحہ رضوی برق، اعجاز علی ارشد، کوثر سیوانی، قمر سیوانی اور التفات امجدی کے سلسلے سے پچاس سے زیادہ رباعیات موجود ہیں لیکن 'رباعیاتِ ظفر' میں یہ سلسلہ باضابطہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، شہاب الدین ثاقب، سید حسن عباس، عامر سبحانی، بسمل رانی پوری، اظہار احمد ندیم اور خاکسار کے سلسلے سے کم از کم چھے رباعیات ضرور شامل ہیں۔ احمد جمال پاشا اور کوثر سیوانی کو پھر سے یاد کرتے ہوئے چھے چھے نئی رباعیات اس کتاب میں درج ہیں۔ افرادِ خاندان میں اپنی شریکِ حیات کے بارے میں بارہ رباعیات موجود ہیں۔ اپنے دو بہنوئیوں کے انتقال پر نو۔ نو رباعیات اور محمد وجیہہ الحق کی شادی کے موقعے سے تہنیتی رباعیاں اس کتاب کا حصہ ہیں۔ دو کتابوں —— 'خاکسارانِ جہاں' اور 'تذکرہ شعرائے سارن' اور اپنے وطن رانی پور اور شہرِ بنارس پر بھی رباعیات شامل ہیں۔ ناوک حمزہ پوری اور زاہد سیوانی کے بارے میں ظریفانہ رباعیات شاملِ کتاب ہیں۔ رباعیاتِ ظفر میں اشخاص اور مقامات و کتب کے بارے میں جو رباعیات شامل ہیں، ان کی مجموعی مقدار تیس فی صد کے قریب ہے۔

ظفر کمالی کی رباعی گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے اس حصّے سے بے التفاتی مناسب نہیں۔ اس میں یہ جانچ پرکھ بھی شامل رہے کہ انہوں نے اس انداز کی شاعری پیش کرنے والوں کی ناکامیوں سے آخر کیا سیکھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ظفر کمالی یہ کام رسمِ دنیا نبھانے کے لئے کر رہے ہیں؟ کیا یہ غور کرنے کا موقع نہیں کہ جس شاعر کے پاس یہ حوصلہ ہے کہ ایسی رباعیات کے لئے اپنے مجموعے کا ایک تہائی وقف کر رہا ہو، وہ اگر اس حصّے میں ناکام ہُوا تو پورے مجموعے کا توازن اور معیار متزلزل ہو جائے گا۔ انھی اسباب سے اس حصّے کا آزادانہ طور پر جائزہ لینا ضروری سمجھ میں آتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشیں تھی کہ ایسی

تحریریں اکثر وبیش تر رسومیات کے ذیل میں ڈال دی جاتی ہیں اور پڑھنے والے اُن سے سرسری گزر جاتے ہیں جو بعض اوقات شاعر کے ساتھ بے انصافی کی بات ہوجاتی ہے۔

ظفر کمالی نے ان رباعیات میں شخصیت شناسی کا فریضہ ادا کیا ہے۔ جن اشخاص کے بارے میں یہ رباعیات ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جن سے ظفر کمالی کے ذاتی روابط نہ رہے ہوں۔ اکثر سے کئی کئی دہائیوں کا اور شب وروز کا رشتہ رہا ہے۔ اس لئے یہ رباعیاں رسمی دائرے میں قید ہوکر بے رَس اطّلاعات کا خزینہ بننے کا ذریعہ نہیں بنتیں۔ ایک فن کار کی حیثیت سے ظفر کمالی کی یہ حیرت انگیز ہوش مندی ہے کہ انہوں نے اطّلاعات اور رسومیات کے بجائے شخصیت شناسی پر اِن رباعیات کا مدار رکھا۔ اگر وہ ادیب اور شاعر ہیں تو اُن کے ادبی مقام پر بھی نظر ہے لیکن وہاں بھی مضمون نویسی کے لوازمات سے بہرطور پرہیز کیا گیا ہے۔ ایسی شاعری میں مصنّف یا کتاب کی رعایت سے کچھ نہ کچھ ادبی مشغلہ قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن ظفر کمالی نے سمجھ بوجھ کر، ایسی کسی ادبی کرتب بازی میں خود کو اُلجھا کر اپنے شعر کو بگاڑنے یا بے مزہ کرنے کا خطرہ نہیں اٹھایا۔ انہوں نے اشخاص کی زندگی کے صرف انھی پہلوؤں پر توجّہ کی، جن کو اطّلاعات سے بوجھل بنانے کی لازمی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات انھیں یہ بھی معلوم تھی کہ ممدوحین کے اوصافِ عمومی پر اُن کا قاری کیوں کر متوجّہ ہوگا؟ اگر معلوم حقائق پر ہی زور ہو تو پڑھنے والے کے لئے اِن رباعیات میں کشش کیوں ہوگی؟

انھی اسباب سے ظفر کمالی نے شخصیت شناسی کے مراحل میں ایسے اجزا پر زیادہ توجّہ دی جو دوسروں کی نگاہ سے عموماً اوجھل ہوتے ہیں۔ ہر زندگی میں نہ جانے کتنے اَنجانے پہلو اور گم شدہ زندگیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں طے کرنا ہے کہ سرسری گزر جائیں یا جہانِ دیگر کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ اشخاص پر توجّہ کرتے ہوئے ظفر کمالی نے بالعموم اُن زندگیوں سے ایسے 'جہانِ دیگر' ڈھونڈ نکالے ہیں جن پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رباعیات جن کے بارے میں لکھی گئی ہیں، وہ یا انھیں نہایت قریب سے جاننے والے اس کے مطالعے کے دوران نہ صرف شاعر کو داد وتحسین سے نوازیں گے بلکہ انہیں اس بات پر استعجاب بھی ہوگا کہ زندگی کی اس بھولی بسری گلی میں آخر وہ (ظفر کمالی) کس طرح پہنچ گئے؟

شخصیت شناسی میں ظفر کمالی کی کامیابی کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ انہوں نے ایسے اشخاص کو اپنا موضوع بنایا جنھیں وہ بہت گہرائی سے جانتے تھے اور جن کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور دنیا جہان کے معمولات سے واقف تھے۔ دوسرا پہلو اَقدار کے تعلّق سے اشخاص کو سمجھنے کا ہے۔ وہ ظرافت نگار بھی ہیں، حسبِ ضرورت افراد اور اقوام کا مذاق بھی اڑاتے ہیں لیکن نہ جانے ان میں کون سا صوفیانہ راگ ہے جس میں افراد اقوام کے صالح کردار کا ترجمان بن کر اُبھرتے ہیں۔ پیغمبروں، صوفیوں اور پیروں فقیروں کا ایسا مزاج دیکھا گیا ہے۔ دوسروں کے اندھیروں میں بھی انہیں اجالا لگنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روشنی اُن کے اندر سے پھوٹتی ہوئی سامنے آتی ہے۔ شخصیت کے تعلّق سے ظفر کمالی کی رباعیوں میں پہلی قرات کے نتیجے میں وہ مخصوص شخصیت اُبھرتی ہے جس کے نام رباعیاں کہی گئی ہیں لیکن جیسے ہی ہم وردِ دوم کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں، وہاں سے قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد یا صفدر امام قادری کی شبیہیں مدّھم ہوجاتی ہیں اور ہمارے

معاشرے کی ایک خوب صورت، معنیٰ آفریں، علم پرور، کاروبارِ دنیا سے گریزاں، اونچے خواب دیکھنے والی اور حق کے لئے آخری بازی کھیل جانے والی قوم کی مجموعی تصویر اُبھرتی ہے۔ ان افراد کے شعری تذکرے سے ظفر کمالی نے جو کولاژ تیار کیا ہے، وہ خوبصورت، حوصلہ افزا، زندگی بہ داماں اور روشن تر ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ کیجیے، یہ ثبوت اپنے آپ مل جائے گا کہ شاعر نے افراد کے ساتھ ساتھ اُن سے تشکیل پانے والے معاشرے اور اس کے آئندہ کو بھی کس طرح نگاہ میں رکھا ہے:

سچّے ہیں، یہ سچ بولیں گے؛ وہ بھانپتے تھے — جھوٹے تو انہیں دیکھ کے منہ ڈھانپتے تھے
تھی سہل پسندوں میں دہشت پھیلی — یہ نام ہی سنتے تھے تو وہ کانپتے تھے
(قاضی عبدالودود)

عالَم تھا عجب اُس کی بے باکی کا — شکوہ تھا بہت اُس کی سفّاکی کا
وہ وقت بھی آیا کہ سبھی مان گئے — کچھ توڑ نہ تھا اُس کی درّاکی کا
(کلیم الدین احمد)

نام اپنا کبھی کہیں اُچھالا ہی نہیں — ڈَول اپنا کسی حال میں ڈالا ہی نہیں
ہم کیوں نہ کہیں اُن کو ادب کا صوفی — شہرت کے جھمیلے کو پالا ہی نہیں
(شہاب الدین ثاقب)

حافظؔ کے خیاباں میں چلے آئے ہیں — سعدیؔ کے گلستاں میں چلے آئے ہیں
عبّاس کے گھر جاؤ تو لگتا ہے یہی — ہم ہند سے ایراں میں چلے آئے ہیں
(سید حسن عبّاس)

ہے فہم فدا اس پہ، فراست صدقے — ایسا ہے متیں جس پہ متانت صدقے
قدرت نے اسے بخشا وہ ذہن رسا — ہر گام پہ ہوتی ہے ذہانت صدقے
(عامر سبحانی)

رعنائی کو اللہ سلامت رکھّے — دانائی کو اللہ سلامت رکھّے
ایسا ہے وہ رسوا؟ تو دعا کرتا ہوں — رسوائی کو اللہ سلامت رکھّے
(صفدر امام قادری)

بھٹکا ہے کبھی کرب کے صحرا میں ندیم — کودا ہے کبھی آگ کے دریا میں ندیم
مجنوں کی طرح عشق میں دیوانہ بنا — تڑپا ہے بہت فرقتِ لیلیٰ میں ندیم
(اظہار احمد ندیم)

ظفر کمالی کے اس مجموعۂ رباعیات میں ان کے دو برادرانِ نسبتی کی وفات کے سلسلے سے ۱۸ رباعیات شامل ہیں۔ ان رباعیوں کو شخصی مرثیہ گوئی کے خانے میں رکھنا چاہیے۔ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کی وفات پر پورے سو اشعار کا مرثیہ کہا تھا۔ موت ایک حقیقت ہے لیکن ہر آدمی کا تاثّر ذاتی ہوتا ہے۔ ہر بڑا لکھنے والا ذاتی احساسِ غم میں کچھ

ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ غم دوسروں کو بھی اپنا لگنے لگتا ہے۔ جاں نثار اختر نے جب اپنی بیوی کی موت پر ''خاکِ دل'' اور ''خاموش آواز'' جیسی نظمیں کہیں تو یہ محسوس ہوا کہ نئے عہد میں بھی مرثیہ گوئی ممکن ہے اور اس کی کوئی بھی ہئیت ہوسکتی ہے۔ ظفر کمالی نے تو واقعی یہ کارنامہ انجام دیا کہ مرثیہ گوئی کے لئے رباعی جیسی صنف کا انتخاب کیا۔ دونوں اشخاص کے لئے الگ الگ رباعیاں ہیں۔ ایک ایک رباعی پڑھتے ہوئے زینہ بہ زینہ زندگی کی اصل حقیقت کا ذاتی عرفان ہوتا جاتا ہے۔ مرثیہ گوئی کے لئے رقّت آمیزی اور فنا پذیری کا جو عرفان چاہیے، وہ ظفر کمالی کے یہاں بھرپور طریقے سے موجود ہے ورنہ اُن سے ایسی رباعیات کہی ہی نہیں جاسکتی تھیں:

اب کس کو کہیں زیست کا حاصل مت پوچھ — بے سمت مسافر کی منزل مت پوچھ
کیا تجھ کو بتائیں وہ ہمارا کیا تھا — دفنا کے کسے آئے ہیں، اے دل مت پوچھ
ہر دکھ سے مصیبت سے بچا کر رکھنا — اے قبر کلیجے سے لگا کر رکھنا
ہم اپنے چہیتے کو تجھے سونپتے ہیں — بانہوں میں اسے اپنی چھپا کر رکھنا
ملنے کو ہم آئے ہیں، نہ جاؤ ایسے — کیا بات ہے، منہ کو نہ پھراؤ ایسے
ناراض اگر ہو تو ہمیں کردو معاف — چہرے کو کفن میں نہ چھپاؤ ایسے
اپنے تو سبھی موتی ہیرے ڈوبے — اس دل کے تھے جتنے بھی ذخیرے ڈوبے
طوفان سمندر میں اٹھا ایسا — اشکوں میں ان آنکھوں کے جزیرے ڈوبے

ظفر کمالی اچھّے خاصے ظرافت نگار ہیں اور ظریفانہ شاعری کے تین مکمّل مجموعے اب تک منظرِ عام پر لا چکے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے مجموعۂ رباعیات میں ظریفانہ رباعیوں کی خاصی تعداد شامل کی۔ پورے مجموعے میں ظریفانہ رباعیوں کا تناسب پندرہ فی صد سے زیادہ ہے۔ کہاں رباعیات پند و نصیحت اور رُشد و ہدایت کے پَے تُلے کاموں کے لئے مستعمل تھیں اور کہاں انہیں ظرافت کے گھر آنگن میں ظفر کمالی نے بٹھا دیا۔ پہلی نظر میں ہر پڑھنے والا متعجب ہوگا کہ آخر یہ اَن مِل بے جوڑ کا تردّد کس لئے؟ لیکن 'رباعیاتِ ظفر' میں اس حصّے کے مطالعے کے بعد ایسے سوالوں کے جوابات از خود حاصل ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اِن رباعیوں کو اگر اس مجموعے میں شامل نہ کیا گیا ہوتا تب شاعر اور پڑھنے والے دونوں کا نقصان ہوتا۔ یہ رباعیات کہنے کو ظریفانہ ہیں لیکن شاعر نے محض تکلّفاً انہیں ظرافت کے نمونے کے طور پر علاحدہ کر کے پیش کیا۔ مجھے یقین ہے کہ بعض قارئین جن کے ذہن میں ظریفانہ ادب کے بارے میں ذرا بھی تحفّظ ہے؛ وہ ظفر کمالی کے ظریفانہ جال میں پھنس کر اِن بیش قیمت رباعیوں کے مطالعے سے محروم ہوسکتے ہیں۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ یہ پورا حصّہ اُسی طرح سنجیدہ، متین، کارگر اور اثر انگیزی کے اعتبار سے زور آور ہے۔ شاعر نے پڑھنے والوں کا شاید امتحان لینا مقصود کیا کہ اس الگ حصّے کی فراواں سنجیدگی اور نکتہ رسی کو کوئی مجموعے کے باقی ماندہ علمی فضا سے متصّل کر کے دیکھ پاتا ہے یا نہیں۔ ایک ظرافت نگار کی طرف سے واقعتاً نقادوں اور ادب پڑھنے والوں کے ساتھ یہ ایک بھرپور عملی ظرافت ہے۔

یہ ظریفانہ رباعیاں حقیقتاً شہر آشوب ہیں۔ ہم کس اندھے کنویں تک پہنچ چکے ہیں اور پوری قوم ابتلا کے پاتال تک پہنچ کر کس آرام سے جی رہی ہے، اس کا مدلّل تجزیہ ظفر کمالی کی ان رباعیوں میں موجود ہے۔ یہ شاعر کے خون کے آنسو

ہیں۔ اسی لئے کہیں قہقہہ سنائی دیتا ہے اور نہ زیرِ لب تبسّم کی صورت اُبھرتی ہے۔ یہ ایسی ظرافت ہے جہاں باہر اور اندر آہیں اور آنسو ہیں۔ اٹھارویں صدی کے شہر آشوب میں جس معاشرتی ابتری کا اظہار سودا نے کیا تھا، ظفر کمالی نے اس سے آگے بڑھ کر اپنے عہد کے ننگے تن بدن کو، اس کے زخموں کو بہت سنجیدگی سے اجاگر کیا۔ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر ہمارا سماج زخمی پرندے کی طرح جس طرح پھڑ پھڑا رہا ہے، ظفر کمالی نے وقت کی اُن کراہوں کو اِن رباعیات میں سمیٹ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ معاشرتی زوال کا جو عمومی منظر نامہ ہمارے سامنے ہے، اگر ہم ادب کو سماج کا آئینہ کہتے ہیں تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شہر آشوب اور عصری مراثی کی طرف شعرا کا رجحان بڑھتا لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ غزل گویوں کے متفرّق اشعار چھوڑ دیے جائیں تو معاشرتی زوال اور ابتلا کی روزانہ کی آزمائشوں سے نبرد آزمائی کے لئے شعرا کی طرف سے کون حوصلہ کر رہا ہے؟ ظفر کمالی نے ان رباعیوں سے صدائے احتجاج بلند کی ہے کہ آخر ہم کہاں تک پہنچ کر رہیں گے؟ زوال اور گراوٹ کی آخری منزل کون سی ہے؟ چار رباعیات بہ طورِ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

رشتوں کی پذیرائی میں کیا رکھّا ہے — ماں باپ بہن بھائی میں کیا رکھّا ہے
مانا کہ بُرائی تو بُرائی ہے، مگر — اس دَور کی اچھّائی میں کیا رکھّا ہے

دریاؤں کی پہنائی میں کیا رکھّا ہے — افلاک کی اونچائی میں کیا رکھّا ہے
جب کام نکل جائے پھچھلے پن سے — گہرائی میں، گیرائی میں کیا رکھّا ہے

کمزور کو باتوں سے ڈرا کر ماریں — مضبوط کو داؤ پہ چڑھا کر ماریں
احسان اگر کردیں شریفوں پہ کبھی — ان کو بھی یہ احسان جتا کر ماریں

دیوار تو موجود ہے، دَر ہے غائب — جب دَر ہی نہیں گھر کا تو گھر ہے غائب
دستارِ فضیلت تو ملی تم کو ضرور — باندھو گے کہاں، جسم سے سر ہے غائب

ظفر کمالی کی ان ظریفانہ رباعیوں کا ایک مرکز شعر و ادب کی عمومی صورتِ حال بھی ہے۔ علمی کام کرنے والوں کا کردار اور معیار کیسا ہونا چاہیے، اس کے بارے میں ظفر کمالی کے ذہن میں کچھ واضح تصوّرات ہیں۔ اپنے ظریفانہ مجموعوں — 'ظرافت نامہ' اور 'ڈنک' کی متعدّد نظموں میں بار بار ادب میں پنپ رہی اجارہ داریوں کے خلاف وہ آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ ادبی معاشرے میں بھی طرح طرح کی جاگیرداریاں قائم و دائم ہیں۔ ظفر کمالی کی تمام منظومات مع رباعیات کے دونوں مجموعے پیشِ نظر ہوں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کے بیچ کے بڑے چھوٹے اجارہ دار انہیں سب سے زیادہ ناپسند ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنا ایک ادبی مقصد بنالیا ہے کہ علم کے نام پہ جہل پھیلانے والے اور دوسروں کے کلام کے بَل بوتے پر شاعر کی طرح سرِ بزم اِترانے والے متشاعروں کی خوب خوب خبر لی جائے۔ نقّادوں اور بڑے بڑے لکھنے والوں کے ادبی گھوٹالوں پر بھی ظفر کمالی بپھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اُن کی ایسی رباعیوں میں ادب کے صالح اور سنجیدہ کام کو کھیل تماشا بنا دینے والوں پر بار بار ضرب پڑتی ہے۔

ظفر کمالی احمد جمال پاشا کے شاگردِ رشید ہیں۔ ایک زمانے میں احمد جمال پاشا کے دو مضامین بڑے مشہور ہوئے تھے: ''ادب میں مارشل لا'' اور ''ادب میں بانس کی اہمیت''۔ یہ مضامین ادبی معاشرے کا مرثیہ ہیں لیکن لکھنے والے نے ظریفانہ پردے میں کھڑے ہو کر ہمیں ایک سوچی سمجھی گمراہی میں مبتلا کر دیا۔ ظفر کمالی نے صدفی صدحقِ شاگردی ادا کر دیا۔ آج سے چالیس برس پہلے پاشا نے جب یہ مضامین لکھے تھے، اس وقت ادیبوں اور شاعروں میں باضمیر اور علم پرور افراد کی ایک صف بہر طور بچی ہوئی تھی۔ کچھ نقاد بھی تھے جو اَبتری پھیلانے والوں کو روکتے اور ٹوکتے تھے۔ آج ابتری پھیلانے والی طاقتیں ادبی معاشرے کے میمنہ اور میسرہ دونوں کو توڑ چکی ہیں اور ادب کی اصل بنیادوں پر بالکل صدر سے حملہ کر رہی ہیں۔ ہلاکو اور چنگیز خاں یا پھر نادر شاہ نے جس طرح آبادیوں کو نیست و نابود کرنے کا کام کیا تھا؛ آج پورے ملک میں ادبی اجارہ دار معصوم تخلیق کاروں کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں۔ حضورِ اقدس صلعم نے آنے والے وقت کے بُرے ماحول کے بارے میں ایک بار گفتگو کرتے ہوئے قیامت سے پہلے کی ابتری کا نقشہ کھینچا تھا۔ ایک صحابیِ محترم نے حضور صلعم سے یہ سوال کیا کہ اگر ہم میں سے کوئی اس عہد تک باقی رہ جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ حضورؐ نے یہ جواب دیا تھا کہ گوشہ نشینی ہی سب سے مناسب طریقہ ہوگا۔ آج اردو معاشرے میں سچّے لکھنے والے اپنی عزّت و آبرو اور اپنے ادب کی حفاظت میں گوشہ نشینی کے عالم میں حاشیے تک پہنچ گئے ہیں۔ نمایاں مقامات پر وہ چہرے ہیں جو واقعتاً گھٹنوں کے بَل بھی چلنے لائق نہیں۔ ظفر کمالی نے چار درجن سے زیادہ رباعیوں میں ادب کی جمہوریت اور ادب کی آزادی پر خطرے کو محسوس کرتے ہوئے واقعتاً خدا لگتی کہی۔ چند رباعیات ثبوت کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

عظمت کی وہ نخوت ہے، تنے بیٹھے ہیں — لگتا ہے کہ غالب کے جَنے بیٹھے ہیں
معلوم نہیں ربع کے معنی جن کو — شاعر وہ رباعی کے بنے بیٹھے ہیں

بھاری ہے بھرم، خالی پٹارا ہے تو کیا — گردش میں مقدّر کا ستارا ہے تو کیا
سَر میں ہے یہ سودا کہ بڑا شاعر ہے — استاد کے شعروں پہ گزارا ہے تو کیا
تنقیدی دربار سجائے رکھنا — مغرب کے افکار سجائے رکھنا
بندھ جائے گی نقّادی کی پگڑی — لفظوں کا بازار سجائے رکھنا

اس جہل سے کہرام بہت مچتا ہے — جاہل سے تو عالم بھی نہیں بچتا ہے
وہ پڑھ لے جو دو حرف تو اِترانے لگے — کتّے کو کہیں خالص گھی پچتا ہے

پتّھر کی اگر سِل ہو تو سِل پھٹ جائے — محفل ہو فرشتوں کی تو محفل پھٹ جائے
عالم بھی کریں جہل کی ایسی باتیں — اہلِ دل سُن لیں تو دل پھٹ جائے

ظفر کمالی کا مزاج احتجاجی ہے۔ لیکن یہ عجب المیہ ہے کہ انہوں نے اظہار کے لئے رباعی اور ظرافت کے شعبوں کا انتخاب کیا۔ یہ دونوں ایسے نازک تن اور چھوئی موئی ذرائع ہیں جن کا زور آوری اور loudness سے کہیں دور کا بھی رشتہ نہیں۔ اعلار باعی گوئی پند و نصیحت کا پشتارا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بہترین ظرافت فن کے عروج پر پہنچ کر نرم اور ملائم ہو جاتی ہے۔ ظفر کمالی نے اپنی ادبی زندگی میں یہ سب سے بڑا جوکھم اٹھایا کہ اپنے مزاج کی سخت گیری اور انقلابیت سے سرِ مُو گریز نہ کرتے ہوئے رباعی اور ظرافت دونوں کی حدوں کو توڑ کر ایک نئی صنفی کیفیت پیدا کی ہے جسے ممکن ہے، آنے والا وقت ظفر کمالی کے نام سے یاد رکھے۔ چند نمونے ملاحظہ کریں:

تہذیب کے مٹتے ہوئے آثار نہ پوچھ — قدروں کے بدلنے کی رفتار نہ پوچھ
ایسا بھی کوئی دل ہے کہ مجروح نہیں — اس عہدِ تغیّر کی یلغار نہ پوچھ
دل دوز ہی تحریر لکھی جائے گی — جب خواب کی تعبیر لکھی جائے گی
اب میری تمنّاؤں کے خوں سے شاید — اس ملک کی تقدیر لکھی جائے گی
موسم کا تقاضا تھا چلے نرم ہوا — کیوں چاروں طرف چلتی ہے گرم ہوا
ذہنوں کو جھلس دینے پہ آمادہ ہے — پہلے تو نہ تھی اتنی بے شرم ہوا
نایاب ہے اب ایسی دانائی کی بزم — افکار کی، گہرائی کی، گیرائی کی بزم
دیکھو گے تو حیرت میں پڑ جاؤ گے — میں کیسے سجاتا ہوں تنہائی کی بزم
خاموشی کی موسیقی سنتا ہوں — سن کر پہروں اپنا سَر دُھنتا ہوں
تنہائی کی محفل جب سجتی ہے — کانٹوں میں جیسے کلیاں چنتا ہوں
تو دیکھ چکا آگ اُگلتا سورج — اب دیکھ ذرا ظلم کا ڈھلتا سورج
مایوس نہ ہو، جلد دکھائی دے گا — خوشیوں کی تمنّا کا نکلتا سورج

رباعی گوئی کو تاریخی طور پر فنّی اور علمی نزاکتوں کا حامل مانا جاتا ہے۔ ایک بڑا طبقہ تو صرف روایتِ فن اور عروضی موشگافیوں کے امتحان گاہ کے بہ طور رباعی کو دیکھتا ہے۔ ظفر کمالی کی رباعیات پر گفتگو کرتے ہوئے ان روایتی اور تکنیکی لوازم سے اجتناب کیوں کیا جائے؟ شاعر جس صنف کو اپنی تحویل میں لیتا ہے تو اسی وقت اس صنف کے سابقین کی پابندیاں اور آزادیاں اپنے آپ اس پر فرض ہو جاتی ہیں۔ ظفر کمالی کے اب تک جتنے شعری نمونے اشاعت پذیر ہوئے، وہ سب پابند شاعری کے نمونے ہیں۔ اوزان و بحور سے ظفر کمالی نہ خائف ہیں اور نہ ہی آزاد اور نثری نظم کے دائروں میں پہنچنے کے امیدوار معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں شاعر روایت کے حصاروں میں رہتے ہوئے اپنے خیال کی علاحدہ اور انفرادی دنیا بسا لینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

عروضی اعتبار سے غور کریں تو ظفر کمالی کی قدرتِ کلام کا بہ آسانی اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رباعی کے تمام ۲۴ اوزان اپنی کتاب میں استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ رباعی کا کلاسیکی شعور ان کے یہاں ہے اور عروضیوں کے امتحان میں وہ بہ صد خوشی اُترنے اور کامیابی کا سودا پالنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ کسی

رباعی گو کے لئے یہ تو لازم نہیں کہ وہ تمام اوزان استعمال میں لائے۔ اکثر مجموعۂ رباعیات میں یہ التزام بھی نہیں رہتا۔ لیکن ظفر کمالی نے اگر تمام اوزان کا استعمال کیا ہے تو یہ بے ارادہ ممکن نہیں۔ شاید یہ وہی تازیانہ ہے جو کبھی میر انیس نے اس شعر کی معرفت اہلِ فن کے روبہ رو پیش کیا تھا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

جو شاعر مستقل مزاجی کے ساتھ رباعیات پیش کر رہا ہو اور جس کی مطبوعہ رباعیوں کی تعداد ہزار کو پہنچتی ہو؛ اس کے لئے یہ بات بالکل مناسب ہے کہ وہ عروضی ماہرین کے سامنے اپنا نرم تر ہی سہی لیکن استادی کا دعوا کیوں نہ پیش کر دے۔ یہ قدرتِ کلام اور مشقِ سخن کے ساتھ معقول علم رکھنے والے شاعر کا حق ہے کہ وہ بتائے کہ ہم نے بھی ''ڈیڑھ اینٹ کی اپنی جُدی مسجد'' بنالی ہے۔ اس مجموعۂ رباعیات کے صرف ابتدائی چند صفحات ملاحظہ کر لینے سے یہ پتا چل جائے گا کہ کس طرح شاعر کو تمام اوزان برتنے کا ہنر معلوم ہے۔ اس سے پڑھنے والے ایک ایسے شاعر کو اس کی عروضی مہارتوں کے لئے داد دیں گے جو عمر میں ابھی آٹھویں دہائی میں داخل ہونے سے بہت دور ہے لیکن اس نے فن کی جوانی میں مہارت کی پیرانہ سالی حاصل کر لی ہے۔

رباعی گوئی کا ایک کلاسیکی اصول یہ بھی ہے کہ چوتھا مصرع اس انداز میں کہا جائے جس سے پڑھنے والا چونک جائے۔ یہ موضوع، زبان، قافیہ اور مافی الضمیر ہر جہت سے انوکھا ہونا چاہیے۔ بعض فن کار غزل کے مطلع کے بارے میں بھی یہ اصول نافذ کرتے ہیں کہ شاعر اپنی تمام تخلیقی قوتیں اِن پر صَرف کر کے وہ بات پیدا کر دے جس سے غزل سُبک خرامی سے دلوں میں اتر جائے۔ آخر دو غزلہ سہ غزلہ وغیرہ میں الگ سے مطلع شامل کرنا اور قصیدے میں تو باضابطہ مطلع کہہ کے نئے سلسلۂ خیال کو آگے بڑھانے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ شعرائے کرام نے مطلعوں کے زور آور ہونے پر خوب خوب توجّہ کی ہے۔ اسی طرح بعض ماہرین اس بات پر بھی مُصر ہیں کہ جب مقطع کہا جائے تو اس میں شاعر اپنے کلیجے کا خون نکال کر رکھ دے۔ میر اور غالب کے دواوین کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے مطلعے اور مقطعے زیادہ مشہور اور ان کے نمائندہ اشعار میں شمار ہوتے ہیں؛ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان عظیم شعرا نے انھی روایات کو گرہ میں باندھ لیا تھا اور غزل گوئی کے مرحلے میں انھی دائروں میں کامرانی ڈھونڈنے سے پرہیز کرنا لازم نہ سمجھا۔

ظفر کمالی نے بھی ماہرینِ رباعیات کے اتّباع میں چوتھے مصرعے کا طلسم نہ صرف یہ کہ خود پر لازم کیا بلکہ اپنی مہارتِ فن کے ثبوت کے طور پر اس ہنر کو بھی پیش کیا۔ اپنے فن اور قدرتِ کلام کے تئیں انہیں جو اعتماد حاصل ہے، اسی نے انہیں رباعی کے آخری مصرعے کی تنگ گلی میں مقید ہو کر فن کے کسی انوکھے نمونے کی تلاش کے لئے اُکسایا ہے۔ پڑھنے والوں نے گذشتہ صفحات میں جن رباعیات کو بہ طورِ مثال ملاحظہ کیا ہوگا، وہاں بہت ساری رباعیات میں چوتھے مصرعے کی زور آوری یوں بھی ظاہر ہو چکی ہوگی، اس لئے علاحدہ سے مثالیں پیش کرنے سے گریز مناسب ہے۔

فنّی طور پر ظفر کمالی نے کئی اور بھی تجربے کیے ہیں۔ ایک خاص بات انہوں نے مخصوص ردیفوں کو متعدد رباعیوں میں استعمال کر کے پیدا کی ہے۔ کئی بار ردیف تو وہی ہوتی ہے لیکن اگلی رباعی میں اس کے مفاہیم بالکل بدل

جاتے ہیں۔ کئی ردیفوں میں پانچ پانچ رباعیات ترتیب دی گئی ہیں۔ بابا، اینٹھ، زعم، اے دل، کا احساس، سورج جیسی ردیفوں میں ظفر کمالی نے اگر بہترین رباعیات نکال لی ہیں تو یہ ان کا واقعی کارنامہ ہے۔ ان سلسلے وار رباعیوں میں کچھ بات پیدا کر لینا اور دہراو کی کیفیت سے گریزاں ہو کر کامران نکل جانا ظفر کمالی کی شاعرانہ قدرت ہے۔

ظفر کمالی کی ایک حیثیت خالص نثر نگار کی ہے، اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کو سادگی کے دائرے میں رکھتے ہوئے اس میں پُرکاری کے بیج ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ لفظوں کی چمک دَمک پیدا کرنا اور اس کے توتے مینا اُڑانے کا سودا پالنا ظفر کمالی کے خمیر میں نہیں ہے۔ وہ نہایت سادہ انداز میں شعر کہتے ہیں اور اُسی سادگی میں ایسی کوئی بات پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ بات دل کے قریب بیٹھ جاتی ہے۔ اس لئے اس مجموعے میں چمکتے ہوئے مصرعے اور بارُعب تراکیب اور استعارے آسانی سے نہیں تلاش کیے جا سکتے۔ ظفر کمالی فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں لیکن اپنے اشعار میں فارسیت کا زور ڈالنے کی کوئی مہم نہیں چھیڑتے۔ رباعی کے اوزان کی پابندیوں سے یوں بھی اضافتوں اور تراکیب در تراکیب کی گنجائش کم تھی لیکن کچھ تراکیب، شعری پیکر، تشبیہ اور استعارے ضرور ان رباعیات میں ایسی مستعمل ہیں جنھیں ذرا غور سے ملاحظہ کرنا پڑے گا، اس کے بعد ہی یہ عقدہ کھُلے گا کہ کیسے سادگی اور غیر فارسیت میں بھی کچھ تراکیب اور پیکر سامنے آ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: گناہوں کی دیوار، احساس کی جاگیر، تاروں کا فلک پہ جال بُننے والے، فن کی آگ، ساغر کی آگ، سمندر ٹوٹے (سمندر کا ٹوٹنا)، گل زارِ ستم گار، پُرسوز نظاروں کے بھنور، سفّاک اشاروں کے بھنور، شراروں کا بھنور، احسان کے مرہم، بہری دھند، تم عشق کی سرکار کے نوکر ٹھہرے، دھوکے کی دیوار، سورج کی کشتی، کرنوں کی پتوار، اخلاق کے دریا کی روانی، غفلت کا سمندر، خوف کی دیواریں، تنہائی کی بزم وغیرہ۔ یہ تراکیب زبان کا خوف، رعب اور آنکھوں کو چوندھیا دینے والی روشنی نہیں ہیں۔ یہاں شاعر ہندوی آدابِ زبان کا زیادہ رَسیا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تمام تراکیب غور و فکر کرنے والے ذہن کی عکّاس ہیں۔ ہر ترکیب معنیٰ کی ایک انوکھی دنیا تک قاری کو پہنچانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ کسی بھی زبان میں تراکیب معنوی وسعت کا ہی اہم پیغام بر ہوتی ہیں۔ ظفر کمالی نے اپنی رباعیوں میں ان سے یہی کام لیا۔

یہ مجموعۂ رباعیات ظفر کمالی کا بہ حیثیتِ شاعر ایک مستقل پڑاو ہے۔ انہیں صرف محقّق یا ظرافت نگار سمجھ کر چھوڑ دینا اب کسی سنجیدہ قاری کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ ہم عصر رباعی گویوں کے درمیان بہت خاموشی سے لیکن مکمل استادانہ رکھ رکھاو کے ساتھ باوقار انداز میں جلوہ افروز ہیں۔ اُن کے ذہن اور فکر، ادبی مزاج، علمی گہرائی اور طبیعت کے ٹھہراو کے نہایت خوش آئند نتائج برآمد ہوں گے۔ رباعی کی عارفانہ، عالمانہ، کاملانہ اور ظریفانہ چوٹیاں تو انہوں نے سَر کر لیں، آنے والے وقت میں وہ کون سا شعری مدار ڈھونڈتے ہیں جس کے دائرے میں رہ کر وہ بالکل نئے شاعر کے طور پر ہمارے سامنے آئیں گے؟ گُل کا مورّخ اور نقّاد ظفر کمالی سے اس کا موزوں جواب چاہتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

202, ABU PLAZA, ENGINEERING COLLEGE MORE
ASHOK RAJPATH, PATNA-800006, BIHAR

اردو میں ہم عصر تبصرہ نگاری کی ایک موثّر آواز

صفدر امام قادری

کے تحقیقی، تنقیدی، علمی کتب و رسائل پر تبصرے

نئی پُرانی کتابیں

☆ یہ تبصرے ادبی صورتِ حال کا نبض پیما ہیں۔
☆ یہ تبصرے متن سے دست و گریباں ہونے کی ایک دل چسپ کوشش ہیں۔
☆ یہ تبصرے ایک سچّے فن کار کے ضمیر کی آواز بھی ہیں۔
☆ یہ تبصرے مصنّفین کے مجموعی کاموں کے احتساب کا اشاریہ بھی ہیں۔
☆ یہ تبصرے محض تعارف نہیں بلکہ تنقید و تحقیق کی اعلا روایت سے آراستہ مضامین کا بدل ہیں۔
☆ یہ تبصرے چبھتے اور دل و دماغ کو جھنجھوڑتے بھی ہیں۔

۲۲ر کتب و رسائل پر تبصرے صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

arshiapublicationspvt@gmail.com

ملنے کے پتے

1۔ بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴ (بہار)
2۔ ۲۰۲، ابو پلازہ، اشوک راج پتھ، انجینیر نگ کالج موڑ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۶ (بہار)
3۔ آمد (سہ ماہی)، آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۷ (بہار)
4۔ Mob.09430466321 - safdarimamquadri@gmail.com

● شبنم افروز

اصغر گونڈوی: حیات اور صوفیانہ شاعری

اردو شاعری میں صوفیانہ روایت کے امین شاعروں کی فہرست میں جن شعرا کا نام سنہرے حروف سے لکھا جاتا ہے ان میں مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، میر تقی میر، آتش اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے علاوہ اصغر گونڈوی کا نام شامل ہے۔ اصغر گونڈوی کی شاعری کا بیشتر حصہ متصوفانہ افکار و خیالات، مسائل و مباحث اور اصطلاحات و کیفیات کے بیان سے لبریز ہے۔ درد کے صوفیانہ افکار اور غالب کی لفظیات کا استعمال کر کے اصغر نے مسائل تصوف کو بیان کرنے کے لئے جو طریقہ استعمال کیا وہ انوکھا، دلچسپ اور ان کا اپنا اسلوب ہے۔

پیدائش و جائے ولادت:

اصغر گونڈوی کی پیدائش ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ جبکہ ان کی جائے ولادت کے بارے میں بہت سے اختلافات ہیں۔ اصغر گونڈوی کی جائے ولادت کے حوالے سے کچھ بھی لکھنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی حالات زندگی پر لوگوں نے قلم کم ہی اٹھایا ہے اور جو لکھ دیا ہے اس میں بھی اختلافات کا دریا بہہ نکلا ہے۔ ویسے تو اصغر گونڈوی بہت بڑے اور اعلی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی ان کا خاندان ہی ریاست و امارت اور ادب کے نقطۂ نظر سے بہت مشہور تھا۔ مگر اس کے باجود جن ناقدین اور مصنفین نے ان کی جائے پیدائش اور زندگی کے حوالے سے بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں سے بھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے، گونڈہ یا گورکھپور۔ چنانچہ جن ناقدین اور مصنفین نے اپنی تحقیق کی بنا پر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اصغر کی پیدائش گونڈہ یا گورکھپور میں ہوئی، آیئے ان کے قول کی سچائی انہیں کے لفظوں میں دیکھیں۔

صغیر احمد صدیقی کی تحقیق کے مطابق ''مولانا اصغر حسین اصغر گونڈہ میں پیدا ہوئے''۔(۱)

سید رشید احمد نے اپنے مضمون مطبوعہ 'قومی آواز' لکھنؤ میں لکھا ہے ''اصغر کا آبائی وطن گورکھپور تھا''(۲)

اسی نظریے کی حمایت ڈاکٹر سید اعجاز حسین بھی کرتے ہیں۔ زیادہ تر ناقدین اور مصنفین ان کی جائے ولادت گورکھپور ہی مانتے ہیں۔ سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''بہر حال کچھ بھی ہو اصغر صاحب شہر گورکھپور کے محلّہ الٰہی باغ میں اسی 'چاند سورج کے مکان' میں مارچ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ آج آسمان

شاعری پر چاند سورج بن کر چمک رہے ہیں''۔(۳)

اصغر گونڈوی کے والد تفضّل حسین صاحب گورکھپور میں ملازم تھے۔1884 میں ان کا تبادلہ گونڈہ ہوگیا۔ وہاں انہیں صدر قانون کی حیثیت ملی اور اسی تبادلے کی وجہ سے لوگوں میں اصغر کی جائے پیدائش کو لے اختلاف پیدا ہوا ہے۔

اصغر گونڈوی کے والد منشی تفضّل حسین عربی فارسی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ خاص طور سے انہیں فارسی زبان سے زیادہ رغبت تھی اور ان کے پاس فارسی زبان کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنی تہذیب وتمدن سے جو والہانہ قربت تھی اس کی مثال ان کی ذاتی لائبریری میں مذہبی اور دینی کتابوں کے ساتھ اردو کی کتابوں کا کافی تعداد میں موجود ہونا تھا۔

تعلیم و تربیت:

اصغر کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا سلسلہ گونڈہ سے شروع ہوا۔ انہوں نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم مکتب سے حاصل کی اور عصری تعلیم کے لئے ان کے والد صاحب نے ایک انگریزی اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا۔ انہوں نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم مکتب سے حاصل کی۔ عصری تعلیم کے لئے ان کے والد نے ایک انگریزی اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا۔ 1898 میں اصغر کا نام گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں لکھا دیا گیا اور انہوں نے 1904 میں وہاں سے مڈل پاس کیا اور پھر ہائی اسکول کا امتحان دیا مگر کامیاب نہ ہوسکے اور یہیں سے ان کا باضابطہ تعلیمی سفر ختم ہوگیا۔ اصغر گونڈوی کے والد سمجھتے تھے کہ ان کے بیٹے نے ملازمت حاصل کرنے بھر کے لئے انگریزی سیکھ لی ہے اور اسی سبب ان پر ذریعہ معاش تلاش کرنے کا دباؤ ڈالا جانے لگا۔ مگر اصغر کو حصول تعلیم کا بہت شوق تھا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے دوران ملازمت اپنے ایک اینگلو انڈین آفیسر سے مزید انگریزی سیکھنے کا سلسلہ جاری رکھ کر اپنی قابلیت میں اضافہ کیا۔

شادی:

اصغر گونڈوی نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی موضع شاہ پور کے قاضی خاندان میں، دوسری چھٹن نامی ایک طوائف سے جو بہت ہی سلیقہ منداور نماز روزہ کی پابند تھی، اس کے ساتھ اصغر کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ چھٹن سے جب اصغر کو کوئی اولاد نہ ہوئی تو انہوں نے تیسری شادی 1927 میں اپنی سالی نصیر بیگم سے کر لی۔ نصیر بیگم کی شادی اس سے قبل جگر مرادآبادی سے ہوئی تھی اور یہ شادی اصغر نے خود کرائی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں کے درمیان دوستی رشتہ داری میں تبدیل ہو جائے۔ جگر نے نصیر کا نام بدل کر نصیر کر دیا تھا۔ مگر دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے نسیم بیگم نے جگر سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔

اصغر گونڈوی کے آل اولاد کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کی پہلی بیوی سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جبکہ دوسری اور تیسری سے کسی اولاد کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں۔

ذرائع معاش:

اصغر گونڈوی اپنے تعلیمی سلسلے کے منقطع ہونے کے بعد ذرائع معاش کی تلاش میں دربدر بھٹکنے لگے۔ اسی دوران

ان کی ملاقات بابو راج بہادر سے ہوئی۔ بابو رج بہادر کو اصغر صاحب کی ذہانت، انداز گفتگو اور سنجیدہ مزاج نے بہت متاثر کیا اور انہوں نے ان کو ریلوے میں نوکری دلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسی کے نتیجے میں انہیں اپنی پہلی ملازمت حاصل ہوئی۔ وہاں انہوں کچھ سالوں تک کام کیا اور اپنے ساتھیوں کے درمیان مقبول ہو کر 'بابو صاحب' بن گئے۔

ریلوے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد اصغر کچھ ہی دنوں میں اپنی بے روزگاری سے تنگ آ کر دوسرے ذریعہ معاش کی فکر میں لگ گئے اور جب روزی روٹی کے مسئلے نے ان کے دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام کرنے لگا تو ملازمت کے بجائے تجارت کے پیشہ سے وابستہ ہونے کی سوچنے لگے۔ رشتہ داروں اور دوستوں نے ان کی مدد کی اور انہوں نے ان سے ملنے والے سرمایے کو 1913 میں گونڈہ بازار میں 'بساط خانہ' کی دوکان کھول کر استعمال کیا۔ اصغر کا یہ کاروبار چل پڑا۔ لیکن چونکہ اصغر شاعر تھے، تاجر نہیں اس لئے انہیں تجارت کے پیچ وخم کا علم نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے وقت کے بعد ہی خسارہ اٹھانا پڑا اور بالآخر محض دو سال کی مختصر مدت میں اپنے تجارتی پیشے کے سلسلے کو ختم کرنا پڑا۔ اسی دوران اصغر بحیثیت مدیر فیض آباد تشریف لے گئے۔ 1913 میں محمد حامد حسرت نے ہفتہ وار 'قیصر ہند' جاری کیا اور اس کی ادارت کے لئے خصوصی طور اصغر کو دعوت دی۔ 'قیصر ہند' کی ادارت کے فرائض کو اصغر نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ پہلی جنگ عظیم کی خبروں کی اشاعت کی وجہ سے قیصر ہند اردو داں طبقہ میں بہت مقبول ہوا اور لوگ اس کی اشاعت کے منتظر رہنے لگے۔ تاہم اس سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ اصغر مستقل طور پر فیض آباد منتقل ہوسکیں۔ کچھ عرصے بعد 'قیصر ہند' 'پیغام' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اسے فروغ دینے کی اصغر نے بہت کوشش کی مگر اس کی آمدنی میں اضافہ نہ ہوسکا، جس سے اصغر کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے رسالہ ہی بند کر دیا۔ تجارت میں لگاتار خسارہ اور رسالے کی اشاعت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے بے زار اصغر گونڈوی ایک بار پھر 1926 میں ملازمت کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان کی ملاقات تاجور نجیب آبادی سے ہوئی۔ ان کے کہنے پر اصغر لاہور گئے۔ وہاں وہ عطر چند کپور کے ادارے 'اردو مرکز' سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں پہلے سے جگر مرادآبادی، یگانہ چنگیزی اور روش صدیقی جیسے اصحاب علم وفن موجود تھے۔

کتابیں:

اصغر گونڈوی کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تخلیق بہت کم کی مگر اپنے جداگانہ انداز و اسلوب سے مقبول ومعروف شاعروں کے درمیان امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'نشاط روح' 1925 میں اور دوسرا مجموعہ 'سرود زندگی' 1935 میں شائع ہوا۔ ادبی جہان میں وہ باکمال شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے نثر میں بھی مختلف موضوعات پر اپنے قلم کو حرکت دی ہے۔ جیسے شاعری کی ذہنی تاریخ، مرثیہ گوئی کی تاریخ، خطوط نگاری اور کئی کتابوں پر مقدمے نیز بچوں کے ادب سے متعلق بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ ان کے مضامین رسالہ 'سہیل' اور تماہی 'ہندوستانی' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔

شخصی عناصر:

اصغر گونڈوی ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت مختلف خوبیوں سے آراستہ وپیراستہ تھی۔ اپنی خوبیوں کی بنا پر وہ دوست واحباب اور ادبی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔ اصغر گونڈوی کی شکل وشباہت کے متعلق رشید

احمد صدیقی نے ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے:

''دراز قد، بھرا بھرا جسم، ستھری وخوش قطع پوشاک، سر پر پٹے سڈول، فرنچ کٹ داڑھی، اونچی ٹوپی، چہرے پر اجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت، متوسط عمر، انداز میں خوداعتمادی، دل آسائی، دل نے آواز دی کہ ایک اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اصغر صاحب مرحوم تھے''۔(۴)

رشید صدیقی کے ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ اصغر کی شخصیت بڑی پرکشش اور پراسرار تھی۔ وہ نیک سیرت اور پاکباز انسان تھے۔ سچے مسلمان، نماز روزہ کے پابند، محمد ﷺ کے عاشق، پرسکون طبیعت، بے ریا خلوص، نفاست، خودداری، صبر وضبط، انصاف پسندی، ایمانداری، اپنی غلطیوں کا اعتراف، دوسروں کی تعریف اور چھوٹوں سے شفقت و محبت کا برتاؤ وغیرہ ان کی شخصیت کے وہ عناصر ہیں جو انہیں اعلی مقام پر فائز کرتے ہیں۔

اصغر نے ملازمت کے ابتدائی دور میں بابو راج بہادر کی صحبت میں مے نوشی اور طوائفوں کے بالا خانے کے بھی جلوے دیکھے۔ مگر دوسری بیوی کے اعلی اخلاق نے بہت متاثر کیا اور انہوں نے شراب وشباب سے توبہ کرلی۔ یہیں سے وہ دین و مذہب کی طرف مائل ہوگئے اور ایک بزرگ حضرت قاضی عبدالغنی منگلوری کو اپنا مرشد بنالیا۔ اصغر کی شاعری میں تصوف کا جو رنگ ہے وہ انہیں کی صحبت سے حاصل ہوا ہے۔

اصغر کے دور میں مشاعروں کا چلن تھا۔ تاہم ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ بہت کم مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اگر دوستوں کے اصرار پر جاتے بھی تو اپنی غزلیں خود پڑھنے کے بجائے جگر مرادآبادی یا دوسرے شاعر سے پڑھواتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی آواز کا دھیما پن تھا۔

شاعری:

اصغر گونڈوی کے اکثر و بیشتر ابتدائی کلام دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ مختلف رسائل و جرائد میں ان کے کلام موجود ہیں۔ چونکہ اصغر نے خود اپنے کلام جلا دیے تھے جس کا ذکر 'نشاط روح' کے مقدمے میں ہے۔ تاہم اصغر کی شاعری کا جو حصہ شائع ہوکر قارئین کے سامنے ہے ان پر صوفیانہ افکار وخیالات کی دبیز چادر پڑی ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم ان کی اسی نوعیت کی شاعری پر بحث کریں گے۔

قاضی عبدالغنی منگلوری کے ساتھ وابستگی نے اصغر گونڈوی کی شاعری میں متصوفانہ خیالات کی راہ ہموار کی۔ یہیں سے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ حقیقت ومعرفت کے دریچے وا ہوتے گئے۔ ان کی شاعری میں سوز وگداز اور خیال انگیزی کی شمولیت ہوتی گئی۔ اس میں روحانیت کی تاثیر کے ساتھ واردات قلبی کا بیان ہونے لگا اور رنگینی و گہرائی کے ساتھ افکار دنیا کا ہجوم آباد ہونے لگا۔ ان کے یہاں صوفیانہ افکار کے علاوہ مذہبی اشعار بھی ہیں اور اخلاقیات نیز انسانیت کی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین بھی ان کے کلام کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر کاظم ہاشمی اصغر کی صوفیانہ شاعری کے امتیاز کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''انہوں نے تصوف کے اثباتی نقطۂ نظر سے زندگی اور اس کی رنگارنگی کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے بھی غم اور

خوشی، ہجر ووصال اور انسان وکائنات کے نئے نئے رنگ آنکھوں سے دیکھے اور ان کو محسوس کیا اور مطالعہ نفس وذات کا تجربہ بھی کیا ہے اور یہی تجربہ ان کے شعری سانچے میں ڈھل کر سامنے آیا''۔(۵)

اصغر گونڈوی کی شاعری کا اسلوب بہت عمدہ ہے۔ ان کے طربیہ لہجے میں فریاد وماتم کی گنجائش نہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہونچانے کے لئے خمریہ عناصر، عشقیہ عناصر اور نغمہ وساز نیز فطرتی مناظر کی عکاسی کا سہارا لیا ہے۔ ان کی شاعری دوسروں کی شعری روایت کی تقلید نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں جدت وندرت ہے۔ نفاست ونزاکت، نغمگی وموسیقی، سنجیدگی ومتانت، تقدس وطہارت، ماورائیت اور یکسانیت وہمواریت جیسی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں تشبیہات واستعارے اور صنائع لفظی ومعنوی کا استعمال عمدگی اور خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری زبان وبیان کے بناوٹی چمک دمک سے پاک عام اور سادہ روایتی الفاظ کی ترجمانی کرتی ہے۔

ویسے تو اصغر کا کلام مختصر مگر منتخب ہے۔ جس کا اہم موضوع تصوف ہے۔ انہوں نے متصوفانہ موضوعات کو اعلی فنی بصیرت کے ساتھ جامۂ اظہار عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ناقدین نے انہیں ایک صوفی شاعر تسلیم کیا ہے مگر مجنوں گورکھپوری کو ان کے تصوف پر شک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصغر کی شاعری کو تصوف کی شاعری بتایا جاتا ہے اور آج تک ہم اس مبہم رائے کا اعادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اصغر کے کلام کا اردو اور فارسی کے صوفی شعرا کے کلام سے موازانہ کیا جائے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ان کو بھی تصوف کا شاعر کہا جائے تو یہ کس قسم کا تصوف ہوگا۔ سطحی اور سرسری طور پر کہہ دینا بڑی غیر تنقیدی بات ہے کہ اصغر کے کلام میں خیام اور حافظ کا رنگ ملتا ہے''۔(۶)

حالانکہ اصغر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مجنوں نے جو بات کہی ہے وہ محل نظر ہے۔ کیونکہ اصغر کے یہاں عمر خیام کا فلسفہ لاادریت موجود ہے۔ مثلاً

تمام دفتر حکمت الٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں

مولانا روم، حافظ اور عمر خیام نے شراب اور مناظر فطرت وغیرہ کو بنیاد بنا کر جس طرح کی صوفیانہ شاعری کی ہے اصغر نے بھی اپنے کلام میں ان چیزوں کو شامل کیا ہے۔ ان کے یہاں بھی بادہ وساغر، مناظر فطرت اور کائنات کی دوسری اشیا کے سہارے عشق حقیقی کی ترجمانی بہت خوبصورت انداز میں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر حافظ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ یم
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

اسی مضمون کو اصغر کے یہاں دیکھئے

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موج مئے ظہور میں
اس نے مجھے دکھا دیا ساغر مئے اچھال کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمک برق طور میں

غرضیکہ اصغر کی صوفیانہ شاعری میں جس قسم کے رموز و نکات ملتے ہیں۔ ان سبھی کو ہم ان کے اور مولانا روم، عمر خیام اور حافظ کے درمیان موازنے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اس لئے اصغر کو صوفی شاعر کہنے میں کس طرح کی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اسی حوالے سے سلام سندیلوی رقمطراز ہیں:

''مجنوں صاحب کا یہ قول کہ اصغر کی شاعری میں حافظ کی مستی، خیام کی تیکھی حکیمانہ لاادریت یا رومی کی عرفانیت نہیں ہے، سراسر غلط ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصغر نے فارسی شعرا کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے بلکہ ان کی ندرت پسند طبیعت نے تصوف کے لئے اپنی نئی راہ تلاش کی ہے۔ مگر بہر حال یہ نئی راہ تصوف کی ہی طرف لے جاتی ہے''۔(۷)

اسی نظریے کی تائید میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اصغر کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے۔ صرف تصوف کی کیفیات ہیں جو کہیں کہیں فلسفے کے حدود میں داخل ہوتی نظر آتی ہیں''۔(۸)

خود اصغر گونڈوی نے اپنی شاعری میں صوفیانہ روش کی وضاحت کی ہے۔ مولوی محمد سراج الحق مچھلی شہری فرماتے ہیں:

''ایک دن غالباً خود کسی سلسلۂ سخن میں کہنے لگے کہ میری شاعری خواجہ میر درد کے معانی اور مرزا غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے''۔(۹)

اب تک ہم نے اصغر گونڈوی کے متصوفانہ افکار اور ان کے صوفی شاعر ہونے یا نا ہونے کے مسئلے کو لے کر بحث کر رہے تھے۔ اب جب اس بات کی وضاحت ہوگئی ہے کہ اصغر کی شاعری کا تعلق تصوف سے رہا ہے، تو آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں تصوف کے کون کون سے مضامین، اصطلاحات، اشارات اور نکات ملتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصغر رسمی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر صوفی تھے۔ انہوں نے عبادت و ریاضت کی بنا پر تصوف کی راہیں بذات خود طے کیں تھیں۔ ہمیشہ پاکیزگی، تقدس، خلوص عبادت اور صفائی قلب کے ساتھ زندگی گزاری۔ اسی لئے ہمیں ان کی شاعری میں تصوف کے وہ تمام مضامین و مسائل موجزن نظر آتے ہیں۔

اصغر گونڈوی کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے تھا اور اس سلسلے کا خاص اصول مسئلہ وحدت الوجود ہے۔ جس میں یہ تصور کارفرما ہے کہ کائنات میں صرف ذات واحد (یعنی خدا کی ذات) حقیقی ہے، باقی تمام اشیاء، مناظر اور دیگر

موجودات عالم غیر حقیقی، ظلی، ضمنی ہیں، جو انسانوں کو وہم و گمان میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اصغر کے کلام میں مسئلہ وحدت الوجود کے رنگ کو بہت گہرے شدت تاثیر میں لپٹا دیکھتے ہیں۔

لو شمع کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے
جو نقش ہے ہستی کا دھوکہ نظر آتا ہے — پردے میں مصور تنہا ہی نظر آتا ہے

جیسا کہ ہم نے جانتے ہیں کہ اصغر نے اپنی متصوفانہ شاعری میں تمام صوفیانہ اصولوں، اصطلاحات و کیفیات کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ وحدت الشہود بھی انہیں مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ تصوف کی حیثیت رکھتا ہے۔ وحدت الشہود بھی وحدت الوجود کی طرح ہی ہے۔ صوفی دنیاوی مناظر کو خدا کی ذات کا شاہد مانتے ہیں۔ یعنی کائنات کی ہر چیز اپنا الگ وجود رکھتی ہے لیکن ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا چونکہ خدا ہے اس لئے کائنات کی ہر شے اس کی ذات کی گواہی دیتی ہے۔ اصغر کی شاعری میں وحدت الشہود کے رموز و نکات جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً

پھر یہ سب شورش و ہنگامۂ عالم کیا ہے
اسی پردے میں اگر حسن جنوں ساز نہیں

یعنی دنیا کے تمام ہنگامے خدا کی ذات سے ہیں۔ اصغر نے یہاں استفہامیہ لہجہ اختیار کیا ہے جو بہت ہی پر لطف ہے۔ اس سے قبل اسی موضوع پر غالب نے یوں لکھا تھا۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

وحدت الشہود کا نظریہ اصغر گونڈوی کی شاعری میں کئی انداز میں بیان ہوا ہے۔ کہیں انہوں نے لالۂ و گل میں محبوب حقیقی کے عکس کو دیکھا ہے تو کہیں انہوں نے کائنات کے ہر ذرے میں جمال یار کو محسوس کیا ہے، کہیں بہار میں خدائے واحد کا جلوہ نظر آتا ہے، تو کہیں موج نسیم بہار میں ذات خداوندی کی شوخیوں کا دیدار ہوتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں

پردۂ لالۂ و گل بھی ہے بلا کا خوں ریز
اب زیادہ نہ کرے حسن کو عریاں کوئی
ہر ذرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا

یوں ہی نہ جانیے مرے مشت غبار کو
تیری ہی شوخیوں تھیں گرہ میں دبی ہوئی
چھیڑا جو میں نے موج نسیم بہار کو

ان کے علاوہ بھی بہت سے اشعار ایسے ہی جو اس نظریے کی مختلف پہلوؤں سے ترجمانی کرتے ہیں اور اصغر کے صوفیانہ انداز وفکر کی گواہی دیتے ہیں۔

معرفت کو تصوف کی اصطلاحات میں تیسرا درجہ حاصل ہے۔ اس حد میں پہنچ کر صوفیا کو خدا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ اصغر ایک صوفی تھے اس لئے بجب وہ تصوف کی منزل معرفت میں قدم رکھتے ہیں تو ذات حق یا راز حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

اٹھاؤں پردۂ ہستی جو ہو جہاں نہ خراب
سناؤں راز حقیقت جو خوف وار نہ ہوں

اصغر گونڈوی نے اپنے متعدد اشعار میں اس بات پر زور دیا ہے کہ خدا کو صرف جستجو سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کو محسوس کیا جاتا ہے۔ اس تک پہنچنے کا ذریعہ بے خودی ہے نیز اس کو پانے یا اس سے ملنے کا کوئی ایک مقام متعین نہیں ہے۔ بات تو سچے جذبات اور دل کی صدا میں شدت کے ہونے سے بنتی ہے۔ جو یہ کیفیت پیدا کر لے وہ اپنے محبوب کے وصال کی امید رکھے۔ اصغر کے چند اشعار جن میں معرفت کی متعدد صورتیں نظر آتی ہیں۔ ؎

جس پر مری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب — بے خودی نے اب اسے محسوس وعریاں کر دیا
پاس ادب میں جوش تمنا لئے ہوئے — میں بھی ہوں اک حجاب میں دریا لئے ہوئے
تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت — سب کچھ سہی مگر وہ ترا آستاں نہیں

تصوف کا ایک اہم مقام حقیقت ہے۔ صوفی اس منزل پر پہنچ کر خدا کی ذات کو مکمل طور پر سمجھ لیتا ہے اور اس سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ منزل حقیقت کے عناصر اصغر کے کلام میں کچھ اس طرح جلوہ افروز ہیں۔

اسرار عشق ہے دل مضطرب لئے ہوئے
قطرہ ہے بے قرار سمندر لئے ہوئے
دیکھتا ہوں میں کہ ہے بحر حقیقت جوش میں
جو حباب اٹھ اٹھ کے مٹتا ہے سر منصور ہے

فنا تصوف کا ایک اہم نکتہ ہے۔ اس کے متعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے:

''جو شخص اپنے وجود کے ہر ذرے کو تمام اشیا کا آئینہ پاتا ہے تو اسے فنا فی اللہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ سالک اپنے ہر ذرے کو فانی کرتا ہے اور ہر ذرے کی شیون الٰہی

کی ایک شان پاتا ہے''۔(۱۰)

صوفی وادیٔ فنا میں پہنچ کر اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور خود کو ذات حق میں گم کر دیتا ہے۔ اصغر کے یہاں بھی وادیٔ فنا میں پہونچے اور اپنی ہستی کو عشق حقیقی میں ضم کرنے کے متعلق کئی اشعار ملتے ہیں۔

اک صورت افتادگیٔ نقش فنا ہوں
اب راہ سے مطلب نہ مجھے راہ نما سے
خاک کردیں تپش عشق سے ساری ہستی
پھر اسی خاک کو خاک در جاناں کر دیں
اب مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز
مٹ گیا ہوں اس طرح اس نقش پا کے سامنے

تصوف میں فنا کے بعد جو مرحلہ آتا ہے وہ بقا کا ہے۔ بقا کو ہم غوث الاعظم کے قول کے ذریعہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں:

''بقا بغیر لقا کے نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بقا جس کے ساتھ فنا نہ ہو بغیر اس لقا کے نہیں ہوتی جس کے ساتھ انقطاع نہ ہو اور یہ حالت پلک مارنے بھر کی ہوتی ہے یا اس کے قریب۔ اور اہل بقا کی علامت یہ ہے کہ اس کے ہمراہ اس وصف لقا میں کوئی چیز فانی موجود نہیں ہوتی۔ بدرجۂ ان دونوں کے ایک دوسرے کے ضد ہونے کے''۔(۱۱)

اصغر گونڈوی نے اپنے بہت سے اشعار میں مقام بقا کا تصور بڑے والہانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیں۔

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تو کمال زندگی کہتا ہے مرجانے میں ہے
ان کی تجلیوں کا بھی کوئی نشاں رہے
ہر ذرہ میری خاک کا آتش بہ جاں رہے

بے خودی اس کیفیت کا نام ہے جس میں ڈوبے کے بعد انسان مدہوش ہو جاتا ہے۔ مگر یہ مدہوشی تصوف کی زبان میں مختلف ہوتی ہے۔ یعنی سکر کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ مگر مفہوم کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ صوفی پر یہ کیفیت معرفت حقیقت کے وقت طاری ہوتی ہے۔ جبکہ بے خودی کا عالم صوفی پر یاد خدا میں غرق ہونے کے بعد طاری ہوتا ہے۔ اصغر گونڈوی کے کلام میں بے خودی کی بہت سی مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ اصغر کا فلسفۂ خودی اقبال کے فلسفۂ خودی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

بےخودی کے اسی نظریے کو اصغر یوں بیان کرتے ہیں۔

خودی ہے جو لئے جاتی ہے سب کو بے خبر کرکے
اسی چھوٹے سے نقطے پر نظر ہے سارے عالم کی
مری اک بے خودی میں سینکڑوں ہوش و خرد گم ہیں
یہاں کے ذرے ذرے میں ہے اک وسعت بیاباں کی

مشاہدۂ حق تصوف کا وہ مقام ہے جس کو اصغر نے اپنے کلام میں بارہا پیش کیا ہے۔ مشاہدے کے معنی دل کے ذریعہ خدا کو دیکھنے کے ہیں۔ اصغر جب حسن حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں تو اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی طرب انگیزی کو اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ادنی سا یہ حیرت کا کرشمہ نظر آیا
جو تھا پس پردہ سر پردہ نظر آیا
بے تکلف ہو کے مجھ سے سب اٹھا ڈالے حجاب
شاہد دیر و حرم نے مست و حیراں کر دیا

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصغر گونڈوی نے اپنی شاعری میں تصوف کے جو بھی مسائل اور اصطلاحات ہیں، ان تمام کو جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں جن اصطلاحات کا تذکرہ ہوا ہے ان کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سارے مضامین و اصطلاحات کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ تجلی، ازل، شریعت، طریقت، وادیٔ طلب، وادیٔ استغنا، وادیٔ حیرت، مراقبہ، محادثہ، مسامرہ، شوق، حضور و غیب، احسان، وجد، بسط، قبض، صحو، سکر، تجرید، تفرید، تلوین، تمکین، انابت، اثبات، محو، رضا، دعا، سکوت، لقا، تعذر اور یک بینی وغیرہ کے رنگ ان کی شاعری کا خاص حصہ ہیں۔ اصغر گونڈوی کے متصوفانہ افکار سے پر مزید چند اشعار بطور مثال پیش کیے جا رہے ہیں۔

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا
(تجلی)

ازل میں کچھ جھلک پائی تھی اس آشوب عالم کی

ابھی تک ذرے ذرے پر ہے حالت رقص پیہم کی
(ازل)

ہوش کسی کا بھی نہ رکھ جلوہ گہہ نماز میں
بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں
(شریعت)

یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو میں لذت ہے
فضائے دہر میں تحلیل ہوگیا ہوں میں
(وادیٔ طلب)

بے خودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا
کیا فنائے عاشقی خود حسن بن جانے میں ہے
(وادیٔ استغنا)

اے پیکر محبوبی !میں کس سے تجھے دیکھوں؟
جس نے تجھے دیکھا ہے، وہ دیدۂ حیراں ہے
(وادیٔ حیرت)

رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا جز خیال دوست
اس شوخ کو ہوں آج سراپا لئے ہوئے
(مراقبہ)

ان کے علاوہ متعدد اشعار اصغر کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

خاتمہ:

اصغر گونڈوی کا شمار عبوری دور کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا کلام بھی درد کی طرح مختصر مگر منتخب ہے۔ انہوں نے اپنے متصوفانہ افکار کو اعلی فنی بصیرت کے ساتھ جامۂ اظہار عطا کیا ہے۔ اصغر کے کلام میں کائنات، حیات اور انسانی اخلاق و عادات سے متعلق فکر کی جتنی مثالیں نظر آتی ہیں ان پر تصوف کا پرتو پڑا ہوا ہے۔ خدا کے وجودی تصور، کائنات کی موہومی، خیر و شر میں تمیز، جبر و قدر کے مسئلے، قدر و قیمت، بندہ و خدا کے تعلق اور دیگر متصوفانہ افکار و خیالات اصغر کے کلام کی زینت ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

حواشی:

۱۔ مضمون صغیر احمد صدیقی، نقوش لاہور، شخصیات نمبر،ص:۱۴۸۳۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء،تصوف اور اصغر گونڈوی،ص:۳۵۷

۲۔ مضمون سید رشید احمد،مطبوعہ قومی آواز لکھنؤ۔قسط اول اکتوبر ۱۹۷۰ص:۳۵۷،بحوالہ تصوف اور اصغر گونڈوی،ص:۳۵۶

۳۔ سلام سندیلوی،تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۳۶۲

۴۔ گنج ہائے گراں مایہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ص:۱۰۴،مطبوعہ مکتبہ جامعہ، دہلی۔اگست ۱۹۷۲، بحوالہ،تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۴۰۹

۵۔ ڈاکٹر کاظم ہاشمی،تصوف کے نغمات سرمدی،ص:۱۵۵

۶۔ غزل سرا، مجنوں گورکھپوری،ص:۲۹۶ بحوالہ،سلام سندیلوی،تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۴۵۶۔۴۵۷

۷۔ سلام سندیلوی،تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۴۶۴۔۴۶۵

۸۔ غزل اور مطالعہ غزل،ص:۴۰۰،بحوالہ تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۶۴۷

۹۔ اصغر،مرتبہ عبدالشکور،مضمون مولوی محمد سراج الحق مچھلی شہری، بہ عنوان ''حضرت اصغر کے بعض ادبی افادات، ص:۱۳،بحوالہ تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۶۵۷

۱۰۔ حضرت مجدد الف ثانی،مولف محمد احسان اللہ عباسی،ص:۱۲۵،بحوالہ تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۲۲۳

۱۱۔ الدرالمنظم فی مناقب غوث الاعظم،مولفہ شاہ محمد علی انور،ص:۲۸۲۔۲۸۳،بحوالہ تصوف اوراصغر گونڈوی،ص:۲۲۴

Researc Scholar, Room No 28, Sabarmati Hostel(Girls wing) JNU, New Delhi-110067

گذارش

ادباءاورشعراء سے گذارش ہے کہ اپنی نگارشات اردو ان پیج (InPage) میں کمپوز کرکے درج ذیل ای میل آئی۔ پتہ پر ارسال کریں۔

email.eqbalhasan35@yahoo.com

اعزازی کاپی بھیجنے سے ادارہ قاصر ہے۔اس لئے' ثالث' کے مالی استحکام کے لئے خریداری قبول فرمائیں۔شکریہ

● اسلم بدر

نیاز اختر کی کہانیوں کے اشاریے

دنیا کا ہر انسان معلوم و غیر معلوم نفسیات کے ساتھ اپنی زندگی جیتا ہے۔ادب اور زندگی کے اٹوٹ رشتے کے سبب،ادب بھی بغیرِ نفسیات تخلیق نہیں پاسکتا۔افسانوی ادب میں بھی اس کے اثرات سے نہ تو پریم چند بچ سکے ہیں، نہ منٹو، نہ بیدی، نہ گدی نہ ہی ہمارے شہر جمشید پور کے اختر آزاد، انور امام، مہتاب عالم پرویز اور نہ ہی 'بوڑھے برگد کا انت' کے نیاز اختر۔الجھن اس وقت ہوتی ہے جب یہ نفسیاتی رویئے، کہانی پن کو تو کہیں دور پھینک دیتے ہیں اور افسانہ،محض نفسیاتی الجھنوں کا مکڑ جال بن کر رہ جاتا ہے۔الجھنیں اُس وقت اور پریشان کرنے لگتی ہیں جب افسانہ نگار کسی خاص مصلحت کے تحت یا دانشوری کا خودساختہ بوجھ ڈھونے کے لئے یا ابیقوریت کی تقلید میں یا کبھی کبھی بس یونہی (تفنن طبع کی خاطر) نہایت ہی پیچیدہ راستوں پر نامعلوم منزل کی تلاش میں چل پڑتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں۔ان حالات میں فن تو شکار ہوتا ہی ہے، ممکن ہے خود فنکار بھی شکار، بلکہ بیمار ہو جائے۔خصوصی طور پر آج کے افسانے اور افسانہ نگار اس چھوت کی بیماری سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ایسے میں اگر کبھی فلسفے کا بخار بھی چڑھ آیا تو موت یقینی سمجھئے۔ جس کا اعلان پچھلی صدی میں ہی ہو چکا ہے.....The death of an Author۔اس مضحکہ خیز اعلان کا تتمہ یہ کہ ادیب تو ادیب،ادب بھی دم توڑ چکا ہے۔

غرض،عرض معروض یہ کہ ادب، جو زندگی کا خوبصورت ترجمان ہے، ایسا نہ ہو کہ کسی ناقابل برداشت بوجھ تلے دب کر واقعی دم توڑ دے یا الجھنوں کا ایسا محبس ہو جائے کہ باہر سے اندر اور اندر سے باہر بیر بہوٹی جیسے مناظر تو ہوں مگر دکھائی ہی نہ دیں۔

مگر فی الوقت فلسفے کی نہیں،صرف نفسیات کی بات کروں گا،اس لئے کہ فلسفے کا جان لیوا بوجھ بیرون ذات کا مسئلہ ہے،اتارا بھی جاسکتا ہے۔نفسیات کا مسئلہ اندرون ذات کا ہے۔ اکثر یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کس چور دریچے سے کون گھس آیا ہے اور اندرون خانہ کیسی لوٗٹ مچا رکھی ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ یہ چور دریچے بند رکھے جائیں یا کھُلے۔سچائی یہ ہے کہ بند دریچے، کھلے دریچوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ایک سنہری لکیر یہ کہ ایسی صورت حال میں نفسیاتی علاج شرطیہ اور تیر بہدف ہے۔بیماری ناقابل علاج نہیں ہے۔بس کسی تجربہ کار معالج کے ساتھ دو چار نشستوں کی

ضرورت ہوگی۔

تازہ کار افسانہ نگار نیاز اختر کے افسانوں کے مجموعے 'بوڑھے برگد کا انت' کا ہر افسانہ کسی نہ کسی انسانی و حیوانی نفسیات کی طرف اشارہ کرتا ہے، مگر کوئی افسانہ کہیں بھی کسی نفسیاتی مکڑ جال کا شکار دکھائی نہیں دیتا۔ شاید اسی رویئے کو افسانوی ادب میں 'کہانی پن'، 'بیانیہ' یا 'خط مستقیم' پر چلنے کا عمل کہا گیا ہے۔ یہ عوامل نیاز اختر کی کہانیوں میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ میں نیاز اختر کو افسانہ نگار نہ کہہ کر کہانی کار کہنا پسند کروں گا۔

ہماری روزانہ کی زندگی میں ان گنت واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی معمولی یا غیر معمولی واقعہ، ایک کہانی کار کی سوچ میں پہلے ایک کہانی کے روپ میں جنم لیتا ہے، جسے شاعرانہ یا ڈرامائی رنگ دے کر افسانہ بنالیا جاتا ہے۔ اور تب کہانی، افسانے کا روپ لے کر خط منہنی کا سفر طئے کرنے لگتی ہے۔ خط منہنی کے اس سفر میں، ابہام، الجھنیں، استعاراتی نظام جیسے عناصر در آتے ہیں۔ کہانی یا بیانیہ کی 'سادگی کا حسن'، گہنے پہن کر پرشکوہ تو ہو جاتا، پر وقار نہیں رہتا۔ قاری کی نظر 'حسن' پر کم 'شکوہ' پر زیادہ جمنے لگتی ہے .... نیاز اختر کی کہانیوں میں 'سادگی' ہی حسن کا زیور ہے۔ ایک کلاسیکی شعر سُن لیجئے۔

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سِن کے لئے

میرے مطالعے کی حد تک، موجودہ نسل کے افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں میں مجھے اپنے شہر میں نیاز اختر کی شکل میں ایسا پہلا کہانی کار ملا ہے جس نے اپنی کہانیوں میں زبردستی کی جنسیات یا جنسی نفسیات یا دیگر مکڑ جال کی ٹھونس ٹھانس نہیں کی ہے۔ کہیں کہیں اشاروں، کنایوں میں ایک آدھ نفسیاتی ٹچ دے کر آگے بڑھ گئے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

'بوڑھے برگد کا انت' کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے جناب منظر کلیم کی اجمالی رائے کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی، تاہم اجمال کی تفسیر و تاویل تو پیش کی ہی جاسکتی ہے۔ میرا کام اب اتنا ہی ہے کہ نقطوں کا رقص دائرہ ہو جائے۔ اس کے لئے مرکز نگاہ خصوصی طور پر دو کہانیاں 'گدھ' اور 'بوڑھے برگد کا انت' ہیں۔ اپنی پسند کی دو ایک اور کہانیوں سے بھی سرسری گزر جاؤں گا۔

راقم و قاری پیشے سے ٹاٹا اسٹیل کے شعبۂ محافظت، صحت و ماحولیات سے متعلق تھا اور کسی حد تک Industrial Management سے بھی شناسائی تھی۔ اس لئے ہوسکتا ہے تاویل و تفسیر کچھ میکانکی ہو جائے، جس کے لئے قارئین سے معذرت چاہوں گا۔ ہوسکتا ہے کہانی کار کو بھی الجھن محسوس ہو کہ خواہ مخواہ میری سادہ سی کہانی کا افسانہ بنا دیا گیا۔ تاہم سن لیں۔ فیصلہ، تاویل کے بعد کیجئے گا۔

صنعتی ترقی کی بے سمت و بے مہار بھاگ کے نتیجے میں ماحولیاتی آلودگی کے سبب کچھ حیوانی نسلوں (بشمول پرندوں) کا عنقا ہو جانا، نئی نئی بیماریوں کا پھیلنا، موسموں کے مزاج کا بدلنا اور سنامی جیسے حادثات تو چھوٹے

چھوٹے وقوعے ہیں۔ ماہرین فلکیات و ماحولیات کا ماننا ہے کہ اگر زمین پر کنکریٹ اور چمنیوں کے جنگل یونہی اُگتے رہے اور چمنیاں یونہی بے لاگ اور بے روک ٹوک دُھواں اگلتی رہیں تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری زمین کو ایک بار پھر طوفان نوح کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کی دو وجہیں ہوں گی۔ گلوبل وارمنگ (global warming) اور اثیری تہوں میں سوراخ (Depletion in Ozone layer)۔ گلوبل وارمنگ کی بڑی وجہ تو ہمیں معلوم ہے کہ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں ہے (جس میں گرد و غبار اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس شامل ہیں)۔ اس سے نہ صرف ہوا میں، سانس لینے کے لئے ضروری آکسیجن کا تناسب بگڑ رہا ہے، بلکہ اس سے بھی اہم یہ کہ غبار اور دھوئیں کی دبیز تہیں سورج کی اُن کارآمد اور مفید شعاعوں کے آگے چلمن ہو جاتی ہیں، جن کی زمین پر بسنے والے ہر جاندار کو ضرورت ہے۔ نتیجہ، بیماریاں، مہاماریاں، موت۔

اوزون کی تہیں زمین کی سطح سے تقریباً ۳۰ میل کی بلندی پر ہیں اور زمین کے چاروں طرف ماسک کی صورت، سورج کی زہریلی شعاعوں (Ultra Violet Rays) کو چھان کر، مفید شعاعیں زمین تک اتارنے میں ہمہ دم مصروف عمل ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ اس ماسک میں سوراخ کرنے میں مصروف ہیں۔ کارخانوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں ایسے کچھ کیمیائی عناصر بھی ہوتے ہیں، جن سے اوزون کی تہوں میں سوراخ ہو رہے ہیں۔ اُن سوراخوں سے سورج کی زہریلی شعاعیں براہ راست زمینی سطح تک اتر رہی ہیں۔ ان شعاعوں کے اثر سے بھی عالم حیوانات و نباتات کی دائروی زندگی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ مگر یہ سب بھی چھوٹے چھوٹے وقوعے ہیں۔ بڑا وقوعہ یہ کہ ان شعاعوں کے زیر اثر آہستہ آہستہ شمالی اور جنوبی قطبین میں کھڑے ہوئے برف کے عظیم پہاڑ اور جمی ہوئی برف کے مہیب سمندر پگھل رہے ہیں۔ زمینی سمندروں کی سطح رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی ہے۔ اگر آلودگی پر لگام نہیں کسی گئی تو اثیری تہوں میں دریچے اور دروازے کھل جائیں گے۔ تب زمین کو غرقاب ہونے سے کون روک سکے گا..... آنے والی آبی قیامت کا منظر نامہ آپ کے سامنے ہے۔ صنعت کار بیدار ہوں یا نہ ہوں، ایک کہانی کار بیدار ہے۔

اب ذرا ایک نظر صنعت کاری کی بے لگام بھاگم بھاگ پر بھی ڈال لی جائے۔ صنعت کاری کے لئے 'خام مال' (Raw Material)، 'تکنیکی صلاحیت' (Technical Expertise) اور نفع بخش پیداوار (پیداواریت یا Productivity) کی اہمیت مسلم ہے۔ کارخانہ، کارخانہ دار اور کارخانے کے کامگار بھی اس مثلث کے زاویے ہیں۔ ان تمام اکائیوں میں سب سے اہم اکائی ہے، نفع بخش پیداوار (محض پیداوار نہیں بلکہ، پیداواریت)۔ صنعت کاروں کے بیچ 'پیداواریت' کے فروغ کے لئے ہی قومی و بین الاقوامی مقابلے جیسی فضا قائم ہوگئی ہے۔ ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے یہ دیکھنے کا بھی ہوش کسے ہے کہ 'منزل' کوسوں پیچھے چھوٹ چکی ہے۔

پہلی کہانی 'گدھ' کا تھیم یقینی طور پر قومی اور بین الاقوامی صنعتی فروغ کی یک طرفہ بھاگم بھاگ ہے۔ یک طرفہ اس لئے کہ یہ ایسی کساد بازاری ہے جہاں کچھ پانے کی ہوس میں، بہت کچھ کھویا جا رہا ہے۔

ہمارے ملک میں صنعتی فروغ کے لئے پارسیوں کو اولیت حاصل ہے۔ جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا کے کپڑے کی ملوں سے ہوتا ہوا یہ کاروبار، ٹاٹا اسٹیل تک اور پھر لاتعداد صنعتی اکائیوں تک پہنچ چکا ہے۔ نیاز اختر نے ایک

ماہر سنگ تراش کی طرح 'گدھ' کی صورت ایسا بُت تراشا ہے جس کی تصویر ان کے ذہن میں بھی تھی اور پتھر میں بھی۔ کہانی کا پس منظر پارسیوں کا Tower of Silence ہے، جسے کہانی کار نے بہت سوچ سمجھ کر باؤلی کا نام دیا ہے۔ باؤلی سنتے ہی ذہن میں 'اندھی باؤلی' کا تصور ضرور ابھرے گا۔

نیاز اختر کی اس صنعتی کہانی میں ایک ایسی صنعت کاری ہے، جہاں زرتشتیت یا پارسی مذہب' کارخانے کا مالک' (کارخانہ دار) ہے۔ یاد کیجئے کہانی کا وہ ڈائیلاگ:

''ہم پارسی اپنی لاش گاڑتے یا جلاتے کیوں نہیں''

''کیونکہ مرنے کے بعد بھی کسی کے کام آئیں''

''مسلمانوں کی لاش بھی تو دھرتی کے کیڑے مکوڑے کھاتے ہوں گے''

''چپ رہو....ہمارے زرتشت کا یہی حکم ہے''

سنگ تراش کے ذہن میں بنی ہوئی تصویر بالکل واضح ہے۔ 'کارخانے کے مالک' کے حکم کی تعمیل ہم 'کامگاروں' کی ذمہ داری ہے۔ کہانی کار (سنگ تراش) کے ذہن میں بنی ہوئی کچھ اور تصویریں دیکھئے۔ کہانی کی صنعت گری میں..... 'کارخانہ' ہے ٹاور آف سائلنس (باؤلی)،..... 'کارخانے کے کامگار' ہیں منوچہر، رستم اور عادل گجدھر..... 'گدھ' ہے تکنیکی صلاحیت (آپ مشینیں کہہ لیں)، 'لاش' ہے خام مال ہے اور 'نفع بخش پیداوار' (پروڈکٹی ویٹی) کے طور پر حاصل ہے، نجات، مکتی (مرنے کے بعد بھی کسی کے کام آجائیں)۔

کہانی کی صنعت گری کا حال یہ ہے کہ 'گدھ' کی صورت تکنیکی صلاحیت ماند پڑ چکی ہے۔ وجہ صاف ہے، مقابل صنعت گروں کی پھیلائی ہوئی آلودگی..... تکنیکی صلاحیت کے ماند پڑتے ہی 'خام مال' کی کھپت میں دشواری پیش آ رہی ہے..... تکنیک میں بدلاؤ لانے کے لئے دو فیصلے لئے جاتے ہیں..... پہلا یہ کہ باہر سے بہتر مشینیں (گدھ) منگوائی جائیں، دوسرا یہ کہ کام کرنے کے طریقے میں بھی کچھ تبدیلی ہو (سولر سل)۔ مگر نتیجہ کیا ہوا:

''صبح منوچہر کی آنکھ کھلی۔ وہ سیدھا باؤلی میں پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ دروازہ کھولا اور وہاں کا منظر دیکھ کر اس کے پیروں میں جان نہ رہی۔ اس کے ہاتھ سے دروازہ کا پلا چھوٹ گیا اور وہ وہیں پر ڈھے سا گیا۔ سامنے لاش تقریباً صحیح سلامت تھی۔ مگر چاروں طرف سے گدھ ایسے بے حس و حرکت پڑے تھے جیسے اس کا سوگ منا رہے ہوں۔''

عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک یہی حال ۱۹۷۴ء میں ٹاٹا اسٹیل کی مینجمنٹ کا ہوا تھا، جب مغربی جرمنی (تھیسن) سے درآمد شدہ نئی تکنک اپنائی گئی اور Sponge Iron (خام مال) سے فولاد (Steel) بنانے کے لئے ایک نیا پلانٹ (Bottom Blowing Oxygen) لگایا گیا۔ مگر تقریباً چار سو کروڑ روپئے کی لاگت سے تکمیل شدہ یہ پروجکٹ بُری طرح ناکام ہو گیا۔ کمپنی دیوالیہ ہوتے ہوتے رہ گئی، کہ ٹاٹا کمپنی تھی۔ نئے پلانٹ کو فوراً پرانی تکنیک (Top Blowing Oxygen) سے فولاد بنانے کے لئے استعمال کر لیا گیا۔

مجھے 'گدھ' پڑھتے ہوئے اکثر احساس ہوا ہے..... کیا نیاز اختر ٹاٹا اسٹیل کی انتظامیہ کی اس ناکامی سے

واقف تھے؟..... کیا نیاز اختر صنعت گری کے تمام اصول وضوابط سے آشنا ہیں؟..... بس دو باتیں سمجھ میں آئیں..... وہ ایک کہانی کار ہیں اور:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

میں 'گدھ' کو ایک صنعتی علامتی کہانی مانتا ہوں۔

یوں تو نیاز اختر کہ کئی کہانیوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ مثلاً 'ٹرمنیٹر'، 'رنتھی'، 'حقیقت'، 'افعی'، 'کتا' وغیرہ۔ 'ترمنیٹر' کا تھیم انوکھا ہے۔ نباتاتی و زرعی تحقیقات کے تحت نئی نئی فصلوں اور مختلف اقسام کے بیجوں کی دریافت سے تو واقفیت تھی، مگر 'بانجھ بیج' کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اخباروں سے کسانوں کی خودکشی کی خبریں ملتی رہتی تھیں، مگر خودکشی کی ایک وجہ 'بانجھ بیج' بھی ہو سکتی ہے، نہیں معلوم تھا۔ نیاز اختر کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کی اَن چھوئی زمین سے کہانی کاڑھی جائے۔

'گدھ' کا تھیم تو فضائی آلودگی ہے۔ 'افعی' کا تھیم 'آبی آلودگی' کا مسئلہ اُٹھاتا ہے۔ ناگفتہ بہہ حالات کی سفاکی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ، حالات کے خلاف اُٹھنے والی آواز کو بھی صنعتی مافیا ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے سے باز نہیں آتے۔

'رنتھی' کے تھیم کو بھی مَیں 'آلودگی' سے ہی تعبیر کروں گا۔ مگر اس آلودگی کا تعلق آب و ہوا سے نہیں بلکہ انسانی اقدار سے ہے، سماج اور تہذیب سے، جس کی حد درجہ تنزلی و پستی کے اسباب ہیں، لالچ، ہوس، کرپشن، گندی سیاست۔ ہمارے ملک میں چھوٹی بڑی صنعتی اکائیوں کی بھرمار تو ہو ہی رہی ہے۔ علاج و معالجہ کے لئے 'میڈیکل سنٹر'، 'نرسنگ ہوم'، 'کلینک' اور پانچ ستارہ ہوٹل جیسے 'پرائیویٹ ہسپتال' بھی اب نفع بخش 'بزنس سنٹر' ہو کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی مشین بن چکے ہیں، جہاں ڈاکٹروں کا اُٹھایا ہوا HippocraticOath (انسانی خدمت کا عہد نامۂ بقراط)، ہسپتال کے احاطے سے دور کھڑا سسکیاں لیتا دکھائی دیتا ہے اور اندر Hypocracy کا تانڈو جاری ہے۔

'حقیقت' اور 'کتا'، کو میں نیاز اختر کی نفسیاتی کہانیاں مانتا ہوں۔ مگر دوبارہ کہنا چاہوں گا کہ ان میں بھی نفسیاتی مکڑ جال کی پیچیدگی نہیں ہے۔ 'حقیقت' ازدواجی زندگی میں 'بیوی' کی اس نفسیات کو اجاگر کرتی ہے، جہاں ٹوٹ کر محبت کرنے والی بیوی، اپنے اور شوہر کے بیچ کسی تیسرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتی، خواہ وہ تیسرا کمرے میں در آنے والی خوبصورت سی تتلی ہی کیوں نہ ہو جو کمرے کے شوکیس میں سجے ہوئے 'مصنوعی' پھولوں کو حقیقی سمجھ کر عموماً آجایا کرتی ہے۔ کمرے میں تتلی کا آنا جانا چونکہ شوہر کو بہت پسند ہے اس لئے بیوی کو ناپسند ہے۔ تتلی اس کی رقیب ہو جاتی ہے..... اور تب، کہانی کا اختتام یوں ہوتا ہے:

''میں نے بیگم کو آواز دی اور پوچھا..... وہ تتلی کہیں نظر نہیں آ رہی ہے۔ میرے غائبانے میں وہ کمرے میں نہیں آتی تھی کیا؟..... آتی تھی، لیکن ایک دن تتلی کے آتے ہی میں نے شوکیس کا شٹر ہٹا دیا اور تمہارے ان مصنوعی پھولوں کے گلدستے کی اور تمہاری حقیقت اسے بتا دی''

نیاز اختر، اس کے بعد بھی دو ایک جملے بڑھا کر کہانی کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ کہانی

.....'تمہارے ان مصنوعی پھولوں کے گلدستے کی حقیقت اُسے بتا دی' پر ختم ہو جاتی۔اس جملے میں 'اور تمہاری حقیقت' بھی اضافہ ہے اور اس کے بعد کے جملے بھی۔نفسیات کے ہر دریچے کو کھولنا ضروری نہیں ہوتا۔قاری کو کبھی کبھی تھوڑا سا پیاسا چھوڑ دینا چاہئے۔

کہانی 'کُتّا' بھی ایک نہایت ہی حساس نفسیاتی اشاریہ ہے۔جس میں انسان وحیوان کی اپنی اپنی نفسیات بھی ہے اور دونوں کے بیچ کا ایک نفسیاتی بچ بھی۔مسز نائر اور ان کے ٹائیگر دونوں کو قصداً ہوش وحواس سے محروم کر دیا گیا۔نشہ ٹوٹا تو اپنی انانیت کے ٹوٹ جانے کا غصہ مسز نائر نے ٹائیگر پر اتارا کہ وہ بھی اس کی حفاظت نہ کر سکا۔کتے کا نشہ ٹوٹا تو وہ شرمسار ہے کہ اس کی موجودگی میں مالکن کا سب کچھ لُٹ گیا۔اور حیران حیران سی ایک تیسری آنکھ جو کبھی مسز نائر کو دیکھ رہی ہے تو کبھی ٹائیگر کو۔ٹائیگر کے انجام کے بغیر یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔انجام کی یہی پیاس تو کہانی کو سیراب کرتی ہے۔اس لئے میں نے اسے 'نفسیاتی اشاریہ' کہا ہے۔

کہانی کار نے جس کہانی سے کتاب کا نام تراشا ہے، ظاہر ہے وہ کہانی اہم ہوگی۔ڈاکٹر کوثر مظہری کے بارے میں خوب جانتا ہوں کہ وہ 'سانچے' والے ناقد یا مبصر نہیں ہیں، متن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی اپنی رائے پیش کرتے ہیں، لہٰذا ان کی رائے میں: 'بوڑھا برگد' ہماری قدیمی تہذیبی میراث کی علامت ہے، جس کے تحفظ کے لئے ہم اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔

منظر کلیم کی یہ رائے کہ نیاز اختر نے اپنی کہانیوں میں قصے سے زیادہ کردار کو اہمیت دی ہے۔اور تب انہیں 'جٹا شنکر' ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو 'ملک کی آزادی' کی علامت ہے۔

ان دونوں ناقدین کی آراء کا اثر مجھ پر یہ پڑا کہ مجھے 'ہندوستان کی آزادی' اپنی قدیم تہذیبی میراث نظر آئی اور جٹا شنکر اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دینے والا ایک ہندوستانی کردار۔اگر میں جٹا شنکر کو کہانی کا سب سے اہم کردار مان بھی لوں تو 'ہندوستانی کردار' نہ مان کر 'ہندو کردار' مانوں گا۔

مابعد جدیدیت کے رجحانات میرے پلے نہیں پڑتے۔نہ میں ادب وتاریخ کی موت کا قائل ہوں، نہ خالق وتخلیق کار کی موت کا۔نہ ہی میں تکثیریت کا قائل ہوں، نہ اسٹرکچرل ادب وشاعری کا۔تانیثیت بھی ایک حد تک ہی مجھے قائل کرتی ہے، حد سے گزر جائے تو 'کالی' کے پاؤں کے نیچے مجھے 'شیو' کا آکار دکھائی دینے لگتا ہے اور کالی کی حیرت و ندامت سے نکلی ہوئی زبان۔اگر مجھے مابعد جدیدیت میں کوئی چیز بھاتی ہے تو ادب کی قرأت میں 'قاری' کا اختیار اور اس کی حیثیت۔مگر میں قاری کو یہ حیثیت واختیار، ادیب یا ادب کو موت کا جان لیوا مژدہ سنا کر نہیں دینا چاہتا۔

میری نظر میں نیاز اختر کی کہانیاں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ دوران قرأت مجھ سے ہمہ وقت باتیں کرتی رہی ہیں۔مجھے دوران قرأت کہانی کار کی سوچ کی سانسیں بھی محسوس ہوتی رہی ہیں اور نبض احساس کی دھڑکنیں بھی۔پھر بھی نیاز اختر کی کہانیوں کے ایک قاری کی حیثیت سے مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ میں ان کی کہانی کی تفہیم اپنے طور پر کروں۔سو میں نے کیا ہے۔سواب کرنے جا رہا ہوں۔

ظاہر ہے جناب منظر کلیم اور ڈاکٹر کوثر مظہری نے بھی ایک قاری کی حیثیت سے اپنے اختیار کا استعمال کرتے

ہوئے کہانی کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔جو خوب ہے، بہت خوب ہے۔مگر، ذرا ایک بار پھر سے آپ یہ کہانی پڑھ لیں۔میں بطور خاص اس کہانی کے اندرون بہتے ہوئے Under Current کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں: ''(یہ برگد) زوال پذیر مغلیہ دور حکومت، برطانوی سامراجیت، گوری پلٹن کے جبر واستبداد کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے حادثوں کا چشم دید گواہ ہے''.....جٹا شنکر اس برگد کا پجاری ہے.....برگد کے ساتھ اس کا سنٹی منٹل لگاؤ ہے.....اس سنٹی منٹ میں ان کے اپنے بیٹے بہو شامل نہیں ہیں.....ایک بار برگد کی ایک موٹی ٹہنی ٹوٹ کر گر گئی تھی تو وہ یوں زار وقطار رویا تھا جیسے اس کا کوئی سگا اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہو.....جٹا شنکر جو 'انگریزو، بھارت چھوڑو' کے زمانے کا فریڈم فائٹر تھا، آزاد ہندوستان کا فریڈم فائٹر نہیں بن سکا محض برگد کا پجاری بن گیا۔

میری قرأت میں اس گاؤں کی کہانی کا سب سے بڑا اور اہم کردار جٹا شنکر نہیں، خود برگد کا پیڑ ہے۔جٹا شنکر تو برگد کا ایک سنٹی منٹل پجاری ہے۔برگد کے دوسرے چاہنے والے بھی ہیں، مگر پجاری نہیں ہیں، پجاری بھی ہوں گے مگر ویسے سنٹی منٹل نہیں ہوں گے۔آگے آپ ایک ایک جملے کی تہہ تک اتر کے اس کی تاویل وتعبیر میں ڈوب جائیے تو شاید آپ کو ایسا لگے کہ:

برگد کا پیڑ، غلام اور آزاد ہندوستان، دونوں کی علامت ہے کہ زوال پذیر مغلیہ حکومت، برطانوی سامراجیت، گوری پلٹن کے جبر واستبداد کے علاوہ ہر 'چھوٹے بڑے' حادثوں کا 'چشم دید گواہ' ہے۔اس اشارے پر بھی غور کیجئے کہ اسی برگد (ہندوستان) کی ایک موٹی ٹہنی (پاکستان) کے ٹوٹ جانے پر جٹا شنکر (ہندو ہندوستانی) زار وقطار رویا تھا، جیسے اس کا کوئی سگا اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا ہو۔یہ جٹا شنکر کون ہے جو غلام ہندوستان کا فریڈم فائٹر تھا مگر آزاد ہندوستان کا فریڈم فائٹر نہیں بن سکا (صرف زار وقطار رویا)۔اگر اب بھی 'انتہا پسند ہندو تنظیم' کی بو نہیں محسوس ہو رہی ہو تو اگلا اشاریہ دیکھئے.....برگد (ہندوستان) کا پجاری بن گیا۔اس اشارئے پر بھی غور کیجئے کہ اس انتہا پسند تنظیم کے سنٹی منٹ میں خود ان کے اپنے شامل نہیں ہیں۔گاندھی، امبیدکر، نہرو، رادھا کرشن، نمبودری پد، جیوتی باسو، رام منوہر لوہیا.....یہاں تک کہ (اپنا بیٹا) اٹل بہاری باجپائی بھی۔

آخری بات۔کہانی میں نیاز اختر نے اس 'بوڑھے برگد کے انت' کی طرف بڑھتے ہوئے قدم ہی دکھائے ہیں۔برگد کا ابھی انت کہاں ہوا ہے۔برگد کا انت ہو جاتا تو کہانی کچھ اور ہوتی۔ایک قاری کی حیثیت سے میں کہانی کار کی سوچ میں شامل ہوں، مجھے بھی اس بات کا یقین ہے کہ اس برگد کا انت کبھی نہیں ہوگا۔ہاں! شاید ڈالیاں ٹوٹتی رہیں گی، یا توڑنے کی کوششیں جاری رہیں گی۔سنٹی منٹل پجاری کی لاش ضرور لٹکے گی، ایسے پجاریوں کا انت ضرور ہو جائے گا۔کہانی یہی تو کہہ رہی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

▶ New Azad Nagar Near J.K.S College
Jamshedpur (Jharkhand)

عرفان ستار

ہمیں نہیں آتے یہ کرتب نئے زمانے والے
ہم تو سچے لوگ ہیں یارو، وہی پرانے والے

ان کے ہوتے کوئی کمی ہے راتوں کی رونق میں؟
یادیں خواب دکھانے والی، خواب سہانے والے

کہاں گئیں رنگین پتنگیں، لٹو، کانچ کے بنٹے؟!
اب تو کھیل بھی بچوں کے ہیں دل دہلانے والے

وہ آنچل سے خوشبو کی لپٹیں بکھراتے پیکر
وہ چلمن کی اوٹ سے چہرے چھب دکھلانے والے

بام پہ جانے والے جانیں اس محفل کی باتیں
ہم تو ٹھہرے اس کوچے میں خاک اڑانے والے

جب گزرو گے ان رستوں سے تپتی دھوپ میں تنہا
تمہیں بہت یاد آئیں گے ہم سائے بنانے والے

تم تک شاید دیر سے پہنچے مرا مہذب لہجہ
پہلے ذرا خاموش تو ہوں یہ شور مچانے والے

ہم جو کہیں سو کہنے دنیا، سنجیدہ مت ہونا
ہم تو ہیں ہی شاعر بات سے بات بنانے والے

اچھا؟ پہلی بار کسی کو میری فکر ہوئی ہے؟
میں نے بہت دیکھے ہیں تم جیسے سمجھانے والے

ایسے لبالب کب بھرتا ہے ہر امید کا کاسہ؟
مجھ کو حسرت سے تکتے ہیں آنے جانے والے

سفا کی میں ایک سے ہیں سب، جن کے ساتھ بھی جاؤ
کعبے والے اِس جانب ہیں، وہ بت خانے والے

میرے شہر میں مانگ ہے اب تو بس ان لوگوں کی ہے
کفن بنانے والے یا مردے نہلانے والے

گیت سجیلے بول رسیلے کہاں سنو گے اب تم
اب تو کہتا ہے عرفان بھی شعر رلانے والے

عرفان ستار

کس عجب ساعتِ نایاب میں آیا ہُوا ہوں
تجھ سے ملنے میں ترے خواب میں آیا ہُوا ہوں

پھر وہی میں ہوں، وہی ہجر کا دریائے عمیق
کوئی دم عکسِ سرِ آب میں آیا ہُوا ہوں

ایسے آئینے کے مانند چمکتا ہُوا میں
عشق کے شہرِ ابدتاب میں آیا ہُوا ہوں

میری ہر تان ہے از روزِ ازل تا بہ ابد
ایک سُر کے لئے مضراب میں آیا ہُوا ہوں

کوئی پرچھائیں کبھی جسم سے کرتی ہے کلام؟
بے سبب سایۂ مہتاب میں آیا ہُوا ہوں

ہر گزرتے ہوئے لمحے میں ٹپکتا ہُوا میں
درد ہوں، وقت کے اعصاب میں آیا ہُوا ہوں

کیسی گہرائی سے نکلا ہوں عدم کی عرفان
کیسے پایاب سے تالاب میں آیا ہُوا ہوں

سخن کے شوق میں توہین حرف کی نہیں کی
کہ ہم نے داد کی خواہش میں شاعری نہیں کی

جو خود پسند تھے ان سے سخن کیا کم کم
جو کج کلاہ تھے اُن سے تو بات بھی نہیں کی

کبھی بھی ہم نے نہ کی کوئی بات مصلحتاً
منافقت کی حمایت، نہیں، کبھی نہیں کی

دکھائی دیتا کہاں پھر الگ سے اپنا وجود
سو ہم نے ذات کی تفہیمِ آخری نہیں کی

اُسے بتایا نہیں ہے کہ میں بدن میں نہیں
جو بات سب سے ضروری ہے وہ ابھی نہیں کی

بنامِ خوش نفسی ہم تو آہ بھرتے رہے
کہ صرف رنج کیا ہم نے، زندگی نہیں کی

ہمیشہ دل کو میسّر رہی ہے دولتِ ہجر
جنوں کے رزق میں اُس نے کبھی کمی نہیں کی

بصد خلوص اٹھاتا رہا سبھی کے یہ ناز
ہمارے دل نے ہماری ہی دلبری نہیں کی

جسے وطیرہ بنائے رہی وہ چشمِ غزال
وہ بے رخی کی سہولت ہمیں بھی تھی، نہیں کی

ہے ایک عمر سے معمول روز کا عرفان
دعائے ردِّ انا ہم نے آج ہی نہیں کی۔

عرفان ستار

اک خواب نیند کا تھا سبب، جو نہیں رہا
اُس کا قلق ہے ایسا کہ میں سو نہیں رہا

وہ ہو رہا ہے جو میں نہیں چاہتا کہ ہو
اور جو میں چاہتا ہوں وہی ہو نہیں رہا

نم دیدہ ہوں، کہ تیری خوشی پر ہوں خوش بہت
چل چھوڑ، تجھ سے کہہ جو دیا، رو نہیں رہا

یہ زخم جس کو وقت کا مرہم بھی کچھ نہیں
یہ داغ، سیلِ گریہ جسے دھو نہیں رہا

اب بھی ہے رنج، رنج بھی خاصا شدید ہے
وہ دل کو چیرتا ہوا غم گو نہیں رہا

آباد مجھ میں تیرے سِوا اور کون ہے؟
تجھ سے بچھڑ رہا ہوں تجھے کھو نہیں رہا

یا بے حسی کا دور ہے لوگو کہ اب خیال
اپنے سِوا کسی کا کسی کو نہیں رہا

114, Jack Monkman Cres.
Markham, Ontario,L3S 4T5, Canada.

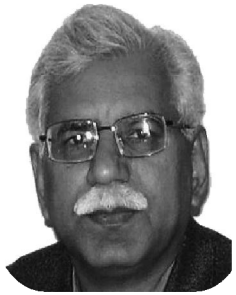

نصیر احمد ناصر

میں سوچتا رہتا ہوں دماغوں میں نہیں جو
وہ کون سا ہے پھول کہ باغوں میں نہیں جو

پانی میں، زمینوں پہ، ہوا میں اسے کھوجا
وہ کیسا نشاں ہے کہ سراغوں میں نہیں جو

ہوتی ہے کسی دیدۂ نم ناک کی لو سے
وہ روشنی کیسی ہے چراغوں میں نہیں جو

اس محفلِ احباب کی سرشاری عجب ہے
وہ مے بھی چھلک جائے ایاغوں میں نہیں جو

اک کارِ مسلسل ہے اسے چاہتے رہنا
لطف اس کا لگاتار ہے ناغوں میں نہیں جو

رنگت ہی نہیں، آب و ہوا کا بھی اثر ہے
بگلوں میں کوئی بات ہے زاغوں میں نہیں جو

دیکھو نہ مرا جسم، مری روح جلی تھی
یہ داغ ہے وہ جلد کے داغوں میں نہیں جو

ناصر ہیں عجب بولیاں طاؤسِ ماں کی
اشجار کے پر غول کلاغوں میں نہیں جو

پکارتی ہوئی پرچھائیوں کے پہرے ہیں
فصیلِ جسم پہ تنہائیوں کے پہرے ہیں

وہ دے رہا ہے صدائیں مجھے بلندی سے
قدم قدم پہ مگر کھائیوں کے پہرے ہیں

مِری نظر بھی تھکن آشنا ہے صدیوں سے
تِرے بدن پہ بھی انگڑائیوں کے پہرے ہیں

نکل کے گھر سے بھرے شہر میں کہاں جاؤں
ہر ایک در پہ شناسائیوں کے پہرے ہیں

وہ روشنی ہے کہ کچھ بھی نظر نہیں آتا
ہر ایک عکس پہ بینائیوں کے پہرے ہیں

وہ بھیڑ ہے کہ کہیں راستہ نہیں ناصر
لگی ہے آگ، تماشائیوں کے پہرے ہیں

Editor Tasteer
Rawalpindi, Pakistan

ساجد حمید

آہٹیں جلتی بجھتی آ رہی ہیں
نوحۂ جاں کو لب پہ لا رہی ہیں

موسمِ گل دھنک بچھا رہا ہے
تتلیاں گل پہ ناچ گا رہی ہیں

باعثِ فتنہ بن گئی ہے شام
بدلیاں خامشی کی چھا رہی ہیں

ساحلوں پر تماشہ بیں ہیں کھڑے
کشتیاں ڈوب ڈوب جا رہی ہیں

کوہساروں پہ تیرگی کے حمیدؔ
چند کرنیں لہو نہا رہی ہیں

◀◀ ● ▶▶

ہمیں سے منسوب لوگ کرتے ہیں کیوں دھماکے
نہ میسرہ کے، نہ قلب کے ہم، نہ میمنہ کے

چلو خیالوں کا شہر ہونے لگا ہے آباد
سکون سے کون رہ سکا تھا اسے بھلا کے

فلک سے پوچھو کہ امتحاں کتنے دے چکے ہیں
ازل سے عاشق رہے ہیں ہم تیری ہر ادا کے

ارادے اس کے میں جانتا ہوں بلند ہیں پر
نظر سے دنیا کی خود کو رکھے گا کیا بچا کے

وہ لاکھ برسائے اپنی آنکھوں سے سرخ شعلے
مٹا نہ پائے گا ساجدؔ نقشِ پا صبا کے

◀◀ ● ▶▶

DEPUTY CONSERVATOR OF FORESTS,
NO.1/1, OFFICERS QUARTERS LANE
BASAVANAGUDI, SHIMOGA - 577201 (KARNATAKA)

معراج رسول

میرے اندر گمان بولتے ہیں
اور باہر زمان بولتے ہیں

یونہی کُندن نہیں بنا وہ شخص
پوچھ لو، امتحان بولتے ہیں

ہاتھ خالی ہیں پھر بھی خطرہ ہے
انگلیوں کے نشان بولتے ہیں

مجھ کو خود سے ہے سابقہ درپیش
لوگ کیوں درمیان بولتے ہیں

جو بھی رہتے ہیں تیرے گردوپیش
وہ تری ہی زبان بولتے ہیں

جو بھی کہنا وہ سوچ کر کہنا
منہ سے نکلے بیان بولتے ہیں

جہاں ٹھہرا، کیا زیاں تُو نے
یہ ترے میزبان بولتے ہیں

حادثے ہو کے چھپ نہیں سکتے
کھڑکیاں اور مکان بولتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

کام آسان کیوں نہیں ہوتا
جسم بے جان کیوں نہیں ہوتا

روز اپنے ہی ساتھ رہتا ہوں
میں پریشان کیوں نہیں ہوتا

مجھ سے قربانیاں جو مانگے ہے
مجھ پہ قربان کیوں نہیں ہوتا

جس کا نقصان دیکھنا چاہوں
اُس کا نقصان کیوں نہیں ہوتا

وہ جو ہونا ہے اُس کے ہونے
کوئی امکان کیوں نہیں ہوتا

مجھ سے کرتا ہے دوستی جو بھی
خود پہ حیران کیوں نہیں ہوتا

کھولتا ہوں میں جب بھی دروازہ
کوئی مہمان کیوں نہیں ہوتا

آج اِک اور دن گزارا ہے
میں بھی ہلکان کیوں نہیں ہوتا

◀◀ ● ▶▶

622 ocean PKWY, Apt B4, Brooklyn,
New York 11218, USA..

ذوالفقار نقوی

دھواں تھا چار سو اتنا کہ ہم بے انتہا روئے
فلک محوِ تماشا تھا، نہ کیوں تحت الثریٰ روئے

عجب حدت مرے اطراف میں جلوہ فروزاں تھی
کہ میری خاک سے شعلے لپٹ کر بار ہا روئے

کسی پتھر کے کانوں میں مری آواز یوں گونجے
کہ اس کے دل کے خانوں میں چھپا ہر اژدھا روئے

سریرِ حضرتِ سلمانِ دوراں کیا اُتر آیا؟
اَنا سر پیٹتی آئی، جفاؤں کے خدا روئے

مرے آغاز میں مجھ کو ہی رونا تھا، سو میں رویا
نہ جانے کیوں مرے انجام پہ شاہ و گدا روئے

تمہاری خاک سے انکار ہیں ارض و سماء نقوؔی
عبث ہے، دست و پا روئیں، یا تیرا نقشِ پا روئے

◀◀ ● ▶▶

یہ صحرا کیوں مجھے الجھا رہا ہے
مرے قبضے میں کیا دریا رہا ہے؟

بجھا دی تھی جو میرے آنسوؤں نے
کوئی وہ آگ پھر بھڑکا رہا ہے

بہا لے جائے گا اِس کو بھی دریا
جو ٹیلہ ریت کا اِترا رہا ہے

عجب غم ہے کہ آ جاتا ہے پھر سے
مگر ہر بار منہ کی کھا رہا ہے

ہے جگنو یا اندھیرے کا شرارہ
مرے اندر وہ کیا چمکا رہا ہے

مری، منزل سے اُس کو کیا تعلق
مجھے رستے سے جو بھٹکا رہا ہے

◀◀ ● ▶▶

ذوالفقار نقوی

رنگ اپنا پھر دکھانے لگ گیا
حرفِ لا پھر سے پڑھانے لگ گیا

ہاتھ کیا میں نے بڑھایا اُس طرف
وہ مجھے اپنا بنانے لگ گیا

پھر ہوا کے دوش پر ہیں تلخیاں
پھر یہ موسم آزمانے لگ گیا

ایسا چمکا وہ چراغِ آرزو
آنکھ کی پتلی جلانے لگ گیا

صورتیں بنتی بھی ہیں، مٹتی بھی ہیں
خاک پر وہ گل کھلانے لگ گیا

شہر میں جو شخص تھا پہچان کا
دیکھتے ہی منہ چھپانے لگ گیا

وہ مری مٹی میں پنپا اِس قدر
میرے اندر گھر بنانے لگ گیا

◀◀ ● ▶▶

موج میری ذات کی قائل کہاں
میں کہاں ہوں اور وہ ساحل کہاں

وہ مری گلیوں سے گذرا ہی نہیں
میرے کرب و درد میں شامل کہاں

,,نرگسیت،، چھلنی چھلنی کر گئی
تیرا سینہ پیار کے قابل کہاں

اٹھ رہا ہے شور لفظوں سے بہم
بھاگتا ہے فکر کا قاتل کہاں

میرے حصے پر وہ قابض ہو گیا
اب میں اپنے آپ کا حامل کہاں

◀◀ ● ▶▶

▸ Care of ... Ayoub Shah, Police Transport Workshop,
Police Lines Channi Himmat Jammu. J&KPin 180015

مسعود حساس

خزاں کا دست سدا فصلِ نو بہار پہ تھا
گلا ضمیر کا خنجر کی تیز دھار پہ تھا

ہوا کے سر پہ ہی الزام بارہا کیونکر
مرا چراغ ہی خود بجھنے کی کگار پہ تھا

یہ اور بات کہ بینائی تھک گئی ورنہ
نوشتہ جو بھی تھا سب سامنے دار پہ تھا

شعو ر و آگہی نوحہ کناں تھے ہر شئی پر
غروبِ شمس بھی طاری ہوا جوار پہ تھا

اگر چہ دہر نے بخشا تھا اس کو قفلِ دہن
وہ ایک شخص تھا بھاری مگر ہزار پہ تھا

مری صدا تھی مشابہ صدا بصحراء سے
غبارِ وقت کا سایہ مگر دیار پہ تھا

فضاء میں دور گرا جا کے اک دھماکے سے
وہ اک سفید کبوتر کہ جو منار پہ تھا

قلم کو دے گیا حسّاس ایک پیرایہ
جو وقت آن پڑا داخلی حصار پہ تھا

◀◀ ● ▶▶

مری بلا سے آنے دو حریف کیا خریف کیا
قضا ءنہیں کوئی مری عدیل کیا ثقیف کیا

مرا ضمیر آئینہ پڑھو اسے بھی غور سے
دلی کتاب رخ پہ ہے مہیب کیا ظریف کیا

ہوا کی خاصیت ہے یہ چراغ وہ بجھائے گی
ہوا تو بس ہوا ہی ہے نسیم کیا کثیف کیا

نبھائے جا تو زندگی بھلے یہ بوجھ ہی سہی
اٹھا لیا ہے سر پہ گر ثقیل کیا خفیف کیا

حروف کے حصار سے فقط نہیں غزل کا دم
جو فکر ہی نہیں رہی بحور کیا ردیف کیا

ہوائیں ایسی تند تھیں کہ زادِ رہ بچا نہیں
سبھی اجڑ پچھڑ گئے جسیم کیا نحیف کیا

ہے امرِ واقعی یہی کہ مال و زر کی چاہ میں
سبھی ہوئے ہیں ایک سے خبیث کیا شریف کیا

◀◀ ● ▶▶

P. box no 451 Farwaniya 81015,kuwait

واقف انصاری

خودی کو بیچ دینا بے ضمیری کو نہاں رکھنا
بلا کا وصف ہے اس میں تقدّس ساعیاں رکھنا

ہمیں پہلے سے ہے اندازۂ سود وزیاں رکھنا
نظر میں ہر گھڑی دار و رسن کے امتحاں رکھنا

توانائی کی عظمت میں نہ ہو تبدیل یہ اک دن
زیادہ سے زیادہ جسم پہ بارِ گراں رکھنا

درونِ شہرِ جاں میں شور وشر برپا ہے جب پیہم
عبث ہے قصہء شام وسحر نوکِ زباں رکھنا

ذرا سن لے خدا ہی کچھ ہماری کون سنتا ہے
دعائے نارسائی میں فغانِ بے زباں رکھنا

اسیرِ گیسوئے حرص و ہوس جب معتبر ٹھہرا
چراغِ انس و جاں ممکن نہیں ذوفشاں رکھنا

منوّر کرتا رہتا ہے ہمارے دیدۂ نم کو
خرام ناز کا نقشِ کفِ پا نقدِ جاں رکھنا

ہمارا حال کچھ ایسا ہے جیسے موجِ دریا میں
کسی کاغذ کی کشتی پر کشادہ بادباں رکھنا

اجالا بانٹ دینا کوچہ و بازار ومحفل میں
ہمارے واسطے خالی چراغوں کا دھواں رکھنا

زمانے سے اگر آگے نکلنا ہے تمہیں واقفؔ
برابر ذہن و دل میں عہد کی تیاریاں رکھنا

◀◀ ● ▶▶

ہاں ازل سے پوچھیئے لولاک سے ہوتا ہوا
خاک پر آ ہی گیا میں چاک سے ہوتا ہوا

زندگی کا کرب روحِ پاک سے ہوتا ہوا
لب تک آیا ہے دلِ صدچاک سے ہوتا ہوا

جو پسِ منظر تھا منظر پیش منظر ہو گیا
لمحہ لمحہ دیدۂ نمناک سے ہوتا ہوا

بے خطر بڑھتا چلا جاتا ہوں منزل کی طرف
ریگزاروں سے خس و خاشاک سے ہوتا ہوا

وہم کا جو زہر تھا کیوں ذہن سے نکلا نہیں
گرچہ وہ گزرا تنِ تریاک سے ہوتا ہوا

آخرش آ ہی گیا سب نغمہء حق زیرِ لب
ذہن و دل کے لہجہء بے باک سے ہوتا ہوا

چھن کے سارا آ گیا ہے زاویہ قرطاس پر
صاف اور شفاف استدراک سے ہوتا ہوا

◀◀ ● ▶▶

House No.E.W.S-238 A.D.A. Colony
Preetam Nagar, Allahabad (U.P)

اصغرؔ شمیم

آج دنیا میں کیا نہیں ہوتا
صرف عہد وفا نہیں ہوتا

سچ کا دامن پکڑ لیا میں نے
جھوٹ کا سامنا نہیں ہوتا

سب ہی انسان ایک جیسے ہیں
کوئی دل کا برا نہیں ہوتا

دو گھڑی میں بھی مسکرا لیتا
دل میں غم جب ترا نہیں ہوتا

سب مجھے چھوڑ کر گئے اصغرؔ
میرا سایہ جدا نہیں ہوتا

◀◀ ● ▶▶

C/O- BAITUL QASIM
12/3/H/1- PATWAR
BAGAN LANE
KOLKATA- 700009(W.B)

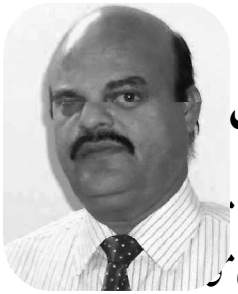

سلیم انصاری

ے اگر مجھ میں رائیگاں
تو مجھے کردے بے نشاں

خاک سے خاک تک سفر میرا
اور کیا میری داستاں مٹّی

جھیلنا ہے عذابِ در بہ دری
ہے ابھی مجھ سے بدگماں مٹّی

اور کب تک شکستِ لفظ وخیال
اور کب تک مرا زیاں مٹّی

کاش لوٹ آئے پھر مسافرِ دل
منتظر ہے سرائے جاں مٹّی

اک ترے لمس کی کرامت سے
ہو گئی مجھ میں ضو فشاں مٹّی

◀◀ ● ▶▶

HIG-3 ANAND NAGAR
ADHARTAL JABALPUR(M.P.)

پرویز ساحر

کوئی نظر نہ پڑ سکے مجھ حال مست پر
بیٹھا ہواہوں اس لئے پچھلی نشست پر

اک موج آتشیں رگ وپے میں اتر گئی
رکھا ہےاس نے جوں ہی کف دست دست پر

کب راس آئی مجھ کو مری فتح کی خوشی
میں دل شکستہ ہوگیا اس کی شکست پر

کیسے سنبھال رکھا ہے اک ذات نے اسے
ششدر ہوں کائنا کے کل بندو بست پر

ہے یاد مجھ کو آج بھی پہلا مکالمہ
قائم ہوں میں تو آج بھی عہد الست پر

طے مرحلہ کیا ہے عدم سے وجود کا
پہنچا ہوں تب میں منزل ناہست وہست پر

ساحر ! میں اپنے آپ سے آگے نکل گیا
حیرت زدہ ہیں سب مری روحانی جست پر

◀◀ ● ▶▶

House No- 898/8 Mohalla Shahar Nawan
Aibatabad, Pakistan

مسلم سلیم

کسقدر بے خوف تھے ہم دشمنوں کے درمیاں
سازشوں میں گھر گئے ہیں دوستوں کے درمیاں

ہے یہ اک مٹتی ہوئی تہذیب کا اندازِ عشق
وہ جو دو آنکھیں ہیں روشن جالیوں کے درمیاں

مدتوں سے اک جہانِ وہم بھی آباد ہے
ہم اکیلے ہی نہیں ہیں فاصلوں کے درمیاں

غیر سے منسوب تھی ساری پسند و نا پسند
چند لمحے تھے بس اپنے مدتوں کے درمیاں

امن ہے سستی کا باعث خواب آور ہے سکوں
ذہن کھلتا ہے جہاں کا حادثوں کے درمیاں

◀◀ ● ▶▶

280, Khanu Gaon, Near Masjid
Bismillah, Bhopal-462001

● علی اکبر ناطق

رَت جگے

مَیں غنودگی سے رِہا ہوا تو کُھلا یہ مجھ پہ معاملہ
مرے ہم نفس سرِ شام ہی مری بستیوں سے چلے گئے
وہی بستیاں کہ مضاف میں ہرے باغ تھے گل ِ سرخ تھے
دمِ صبح پھیلتی وادیاں پرِ جبرائیل کے نام تھیں
شبِ ماہ کھیلتی چاندنی رہِ جاں میں نورِ کلام تھی
بڑے پھاٹکوں کی حویلیوں میں ڈیوڑھیوں پہ نقیب تھے
کُھلے صحن تھے کہ چبوتروں پہ نزولِ مجلسِ دوستاں

یہی بستیاں کہ چہار سُو یہاں سُنبلوں کے چراغ تھے
یہیں وسط میں بڑے چوک تھے جہاں برگدوں کی سپاہ تھی
کہیں دھوپ تھی تو وہ ساونی، کہیں چھاؤں تھی تو وہ چیتری

وہ غروبِ عصر کے مرحلے پسِ شہر سونے کی بدلیاں
اُنہی بدلیوں کے حِصار میں رُکیں پنچھیوں کی سواریاں
وہی پنچھیوں کی سواریاں مرے دوستوں کی نقیب تھیں
کہ سراغ جن کا ملے گا اب نہ جنوب میں نہ شمال میں
اُنہیں زرد وادیاں کھا گئیں، جہاں گھر شفق کا ہے آخری

بُری نیند تھی مری تاک میں جو ہزار صدیاں اُڑا گئی
مرے ہم نشیں کہ ازل سے ہی رہے منتظر مرے خواب کے
مجھے دے گئے ہیں وہ رَت جگے کہ قیامتیں مرے خواب ہیں

◂◂ ● ▸▸

● احمد سہیل

مرگی زدہ بچہ

میری بے آواز محتاج بازگشت
خاموشی کا زہر ہیں
آنکھیں الفاظ نہیں لکھتیں
آنکھیں کہانی سناتی ہیں
ان دنوں کی
جہاں ہم جنے گئے
جہاں ہم جلا دیئے گئے۔
ہماری مائیں ایندھن ہیں
وہ خود جلتی ہیں
اپنی آگ پر روٹیاں پکاتی ہیں
محض ہمیں زندہ رکھنے کے لئے
ماں رونے لگتی ہے
جب اس کا مرگی زدہ بچہ
عمر کے چند سال کاشت کئے بغیر مر جاتا ہے
پانیوں سے بھرے آئینے ٹوٹ جاتے ہیں
آئینہ در آئینہ طوفان ہی طوفان ہے
ہماری زندگیوں کو محبت کے بغیر ختم کر دیا گیا ہے
اور خدا شہر میں افواہ کی طرح گشت کرتا ہے
دھوئیں، دھول اور آگ سے لگی بے زبان تحریریں
تمہارے جسم پر رات کے دھبّے

تمھارا گناہ لکھ دیتے ہیں
ہم سمندر سے ریگستان کی طرف دھکیل دیئے گئے ہیں
خشک راتوں، خشک ہونٹوں کی کہانیاں لکھنے کے لیئے
یہاں آنکھیں ہی پھول ہیں
آنکھیں ہی سمندر.....اور آنکھیں ہی راکھ
یہ بجھی رات کا عنوان ہے
جن پر کبھی سوچا نہیں گیا
کیا محبت، محبت میں تبدیل ہوسکتی ہے
یہی عنوان ہے، یہی سوال ہے ہماری زندگی کا
جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے
ان لوگوں کی طرح
جو محبت کئے بغیر مرجاتے ہیں

◂◂ ● ▸▸

▸ 225 Trail hollow lane,
Palestine, TX. 75801 U.S.A

قیصر اقبال

کا اولین افسانوی مجموعہ

مھاپرش کے بعد

شایع ہو چکا ہے

صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۲۰۰ روپئے

رابطہ: ثالث پبلیلیشنز شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر

● تبسم فاطمہ

چند نظمیں

(۱)

میں ہنسنے کے لئے روئی
آسمان پر روئی کے بادل چلتے تھے/
تاروں کی راتوں میں چاند تیرتا تھا/
لہروں کی کروٹوں میں کشتی ہلکوریں لیتی تھی/
کھیتوں کی فصلوں میں خواہشیں بہتی تھیں/

میں نے ہاتھ پھیلائے
تو تاروں کی راتیں خالی تھیں/
نظر اٹھائی
تو روئی کی جگہ لاشوں کو کندھے دیتے بادل کے ٹکڑے تھے/
لہروں کی طرف دیکھا/
تو کشتی کے بادبان ٹوٹ چکے تھے/

کسانوں کی موت کی خبر ملنے تک/
کھیت ہوتے ہوئے بھی پہنچ سے دور تھے/

میں ہنسنے کے لئے روئی
یا رونے کے لئے ہنسی
کہ جذبات پر/
پہلے سے ہی دھند نے اپنی جگہ بنالی تھی/

(۲)

میں دکھ جاتی ہوں
ہر بار زندگی کو سمجھنے
اور خوابوں میں پت جھڑ چنتی ہوئی
دکھ جاتی ہوں میں/

ہر بار رشتوں کو بکھرتا دیکھ کر/
سیپیوں میں بند، گہری اداسی کا تجزیہ کرتے ہوئے/
دکھ جاتی ہوں میں

بچپن میں بنائے ننھے منے گھروندے/
اور ان کے توڑے جانے کی صورت حال کو
آج کے وقت سے جوڑتی ہوئی
جب خود کو
اکیورم کے باسی پانی میں/
رکھی مردہ مچھلی کی طرح پاتی ہوں/
دکھ جاتی ہوں میں

(۳)

میں شرمندہ ہوئی.....
میں رونے سے پہلے شرمندہ ہوئی
کہ آنسوؤں کے ہزار راستے
دوسرے دروازے سے بھی ہو کر جاتے تھے

میں ہنسنے سے پہلے شرمندہ ہوئی
کہ درد کی طرف جانے والے راستوں کی
ہزار شاخیں بن چکی تھیں

میں ایمان لانے سے پہلے شرمندہ ہوئی
کہ میں خدا کو اپنے جوڑے میں ٹانکتے ہوئے
بہتوں سے الگ کر رہی تھی

میں پیار کرنے سے پہلے شرمندہ ہوئی
کہ اپنے لئے ایک حق کو مانگ کر
پیار کے ہزاروں حقداروں کا حق چھین رہی تھی/

زینے کی ہر سیڑھی پر
شرمندگی کے پھول پڑے تھے
انہیں چنتے ہوئے ہی/
مجھے جینا سیکھنا تھا
اپنے لئے/

(۴)

رونا.....ایک رہگزر
ماں بتاتی تھی،
پیدا ہوتے ہی اتنا روئی تھی
کہ آسمان نیلا پڑ گیا/

میری آمد سے چہکنے والے چہرے
خزاؤں کا حساب لگاتے ہوئے
برآمدے میں امرود سے گرنے والے سوکھے
پتوں کو دیکھ رہے تھے/

تب کی بات ہے
جب آنگن میں گوریا آتی تھی/
منڈیر پر بیٹھ ہوتے تھے کوے

اور کبھی کبھی امرود کے پیڑوں سے
چھپی کویل کی کوک بھی سنائی دے جاتی تھی.....

تب پہلی بار
گھر میں ہوئی پہلی موت کی دستک سنی تھی میں نے/
آنگن میں گوریے، کوے اور چڑیوں کو/
ہکانے والے دادا کے ہاتھ بے جان تھے/
بے روح اور بے جان ہوتے جسم سے پہلے
روح میں امڑنے گھمڑنے والی/
درد کی آواز سنی تھی میں نے/

عمر کے خزاں ہوتے احساس کو دیکھ کر/
اچانک میں ٹھہر گئی ہوں/
پیدائش سے موت تک
درد میں پھیلے کہرے میں
سمٹی ہوتی ہے زندگی/
راز کا جال بنتی/
مکڑے کی طرح/

ایک دن/
جال رہ جاتا ہے/
دور کھو جاتی ہے ایک رہگزر/
اور جسم غائب ہو جاتا ہے/

◄◄ ● ►►

D-304 Taj Enclavie Gita Colony
Delhi-110031

● مسرت زماں

زندہ ہوں میں.....

برسوں کا سفر طے کیا ہے میں نے
اپنی اس بے آب و گیاہ صحرا کی مانند زندگی میں
جہاں محبت کے پھول تھے اور نہ پیار کی شبنم
دست شفقت سے بھی محروم رہی
ممتا بھی نہ تھی دور تک
پر آج تلک میں زندہ ہوں
سینے میں ہزاروں زخموں کا ناسور لئے
ہونٹوں پہ ہزاروں شکووں کا انبار لئے

◄◄ ● ►►

C-001,silver Manor Apt,A.M.C Main Road,M.M Layout,Kaval-Byrasandra.R.T.Nagar.Bangalore, 560032,KARNATAKA.Mob,09739832004..

محمد ارمان حسین
کا ناول
ترشول
صفحات:۱۳۶ قیمت:۱۵۰
رابطہ: ثالث پبلیلیشنز شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر

● رضی شہاب

موت سے پہلے

بھیگی ہوئی اک شام
دہلیز پہ آ کر ٹھہر گئی ہے
دروازہ کھولوں
اندر آؤ، آواز لگاؤں
پر کیوں؟
میں نے تو اب کچھ ٹھان لیا ہے
بوجھ ہوں تو پھر کیوں نہ خود ہی ہلکا ہو جاؤں!
وقت کی رسی جکڑ رہی ہے
میری نس نس کے تیور بدل رہے ہیں
آنکھوں میں خون کی لالی در آئی ہے
آنسو نہ جانے کیوں نکل رہے ہیں
منہ سے تھوک کی جھاگ ابلنے کو ہے
پر سانس کہیں جا اٹکی ہے...
رسی تھوڑی ڈھیل کرو
میں تھوڑا سا نس تو لے لوں
اتنی بھی کیا جلدی ہے؟
دور افق پر روشن مہتاب
میری سیہ تنہائی کا ساتھی ہے
ابھی ابھی تو رات شباب پہ آئی ہے
اس کے روشن چہرے کا دیدار کروں
آنچل سے لپٹے ہیں جو ستارے ان سے بات کروں

مست ہوا کے جھونکوں میں تھوڑی دیر آرام کروں
اک شام اور مرے ساقی کے نام کروں!
اتنی بھی کیا آفت آن پڑی ہے؟
سانسوں سے کتنا پرانا رشتہ ہے؟
جسم کو جان سے جانے کی ضد کیوں ہے؟
مجھ کو ذرا جھنجھوڑ کے دیکھو
آواز لگاؤ
میرے کندھے میرے بازو پر چوٹ کرو
کچھ یاد دلاؤ
کوئی خوشیوں سے لبریز گھڑی
کوئی ہمدم، کوئی ساتھی
کوئی موسم، کوئی ہنستا سا عالم
کوئی...
ہاں کوئی....
شاید میں اٹھ جاؤں
کیونکہ
مردہ سے اس جسم میں شاید
روح ابھی بھی زندہ ہے!!!

◂◂ ● ▸▸

▸ #016, Narmada Hostel, JNU
New Delhi-67

● کے بی فراق

روپ سروپ کا جیون دھارا

اندھیر جیون کی پرت در پرت کا زاویہ ہے میرا
جس کی ہر گُھپا کو کاڑھ رہا ہوں میں اپنی ہستی سے
جس میں ایک البیلے پرتو کی صورت ایسی
اپنی ہستی کے بھیتر جھانکنے کی چِنتا سے
یُگوں نے خُود کو تحلیل کیا ہے
اور جیون ایک سزا ہے.....مَٹ میلا چہرہ لے کر
جن کے مُہرے بے شکل پھرا کرتے ہیں ہر سو
جن کی سمت کا چلت پھرت ہی اپنے آپ تک آنا ہو
اس زرتار مٹی کی ردا مرا پہناوا
ہم رنگولی کھیل رہے ہیں کالے رنگوں کی عظمت سے
کالا میرا کرشن صبا ہے
جو تقلیب ہوئی اِس بن میں۔

◀◀ ● ▶▶

● کے بی فراق

مڈنائٹ چلڈرین

مجھے چُھو کر ذرا دیکھو
مَیں کس سیارے کا باشندہ
نہ میرے اَب وجد کا ناک نقشہ
کسی معقول صورت گر سے اُتارا
اور نہ نباضِ جہاں گر سے
جو جیون ماپ کے سب کی کتھا کا بھید
جانے ہے
ذرا اِس پار جینے کی چلن کا
رنگ تو دیکھو
یہاں جیون کی ریکھائیں سبھی تو
خوف کی صورت
نہ پائیں خواب کی ہستی
یہ ہستی بیج ہے ہم
کل سے بے کل ہونے والے
بے سِتر شبِ میانی کے بچوں کی۔

◀◀ ● ▶▶

GEWS Reference Library
Near Mir Ghaus Bakhsh Bezanjo
Stadium Harbor road Gwadar Balochistan.

پورا نام :	مہدی علی شیخ پوروی
والد محترم :	سید فضل علی افضل ایڈوکیٹ
بھائی :	سید ہادی علی ریٹائرڈ فوڈ کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا
جائے پیدائش:	محلّہ اسانند پور، شہر بھاگلپور
تاریخ پیدائش:	۲۹/مارچ ۱۹۳۱ء
تعلیم :	بی اے (انگریزی آنرس) ٹی، این، بی، کالج بھاگلپور
	ایم، اے (انگریزی) پٹنہ یونیورسٹی
ملازمت :	نومبر ۱۹۵۴ء سے لکچرار انگریزی ڈی جے کالج۔ مونگیر
رفیق حیات:	پھوپھی زاد بہن ساکن شیخ پورہ سے شادی ہوئی
صاحب زادگان:	جاوید مہدی، ثمر مہدی
صاحب زادیاں:	تین (!) اہلیہ جابر حسین (ایم پی)
	(۲) اہلیہ سید غضنفر عباس (لکچرار ایگری کلچر کالج، رانچی، برسا)
	(۳) اہلیہ سید قدر پاروی (غازی پور۔ یوپی)
قیام مونگیر :	۱۹۵۴ء تا ۱۹۹۸ء (۴۴ سال)
تصانیف :	(۱) رنگ حنا
	(۲) برگ حنا
	(۳) وسیلۂ نجات
وفات :	۷۔۶ دسمبر ۲۰۰۷ء کی درمیانی شب

◀◀ ● ▶▶

نوٹ: اس گوشے میں شامل تمام مشمولات پروفیسر مہدی علی مرحوم کی حیات میں تحریر کئے گئے تھے اور جو اردو فورم مونگیر کے مجلّے ''ورق در ورق'' میں شایع ہوئے تھے۔ ہم اردو فورم، مونگیر کے موجودہ کنوینر ڈاکٹر سید سہیل کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے ان مضامین کو گوشے میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(ادارہ)

مہدی علی - اہل قلم کی نظروں میں

● ''پروفیسر مہدی علی کی کلاسکی شاعری معتبر اور صالح روایتوں کی امین ہے۔ شاعری، ادب و ثقافت ان کی وراثت میں شامل ہے۔ مہدی علی کو زندگی جس رنگ اور جس کیفیت میں ملی اس کا اظہار ان کین غزلوں میں ہے اور یہ حقیقت ہے ء کہ انہوں نے اپنے سفینۂ غزل کو بحر حیات کے تموج سے دور نہیں رکھا۔ مہدی صاحب صنف سخن کے مخصوص مزاج سے اچھی طرح باخبر ہیں اور اس لئے انہوں نے اپنی خاندانی وراثت و روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں ذاتی فکر و فن سے گرانقدر اضافے کئے ہیں۔ ان کے یہاں لب و لہجے کی متانت و شائستگی بھی ہے اور رفعت خیال بھی، عصری آگہی کا شعور بھی ہے اور سلیقۂ سخن آرائی بھی۔ ناقدانہ بصیرت بھی ہے اور جذبات کی حرارت بھی۔ الفاظ کا حسن کارانہ استعمال بھی ہے اور ندرت کلام بھی۔'' (بہزاد فاطمی)

● ''اردو غزل فارسی غزل کی طرح دنیائے شاعری کی آبرو ہے۔ شاعرانہ خیالات کا اس سے بہتر ذریعۂ اظہار ادب کی کسی دوسری صنف میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے اس کی عام مقبولیت کی۔

آج کل عام طور پر جو غزلیں چھپ رہی ہیں وہ نہایت فرسودہ قسم کی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے صکہ اردو ادب میں غزلوں کا ایک طوفان آیا ہوا ہے۔ اس طوفان میں جب کبھی غزلوں کا کوئی ایسا مجموعہ سامنے آجاتا ہے جس کے اشعار میں ذاتی تجربات و احساسات کا خلوص و رسوخ اور اظہار بیانکی پختگی و عمدگی ہوتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے ککوئی نعمت مل گئی ہو یہ اردو تغزل کی وسیع روایت میں انفرادیت کا وہ نمونہ معلوم ہوتا ہے جس سے شاعری کے مستقبل کی توقع پیدا ہوتی ہے اور جس کے مطالعہ سے طبیعت میں فرحت ہوتی ہے۔

مہدی علی کی غزلیں اہل ذوق کے لئے ایک ایسا ہی تحفہ ہے۔ انہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ایک پختہ فکر اور قادر الکلام شاعر نے زندگی اور زمانے کے حالات و واقعات کا جو براہ راست مطالعہ بہت غور و خوص کے ساتھ کیا ہے، اسے بہتر سے بہتر پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔ (پروفیسر عبدالمغنی)

● ''پروفیسر مہدی علی خاندانی شاعر ہیں۔ ان کا شاعرانہ کمال ان کی غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے ان کی زیادہ تر غزلوں سے شاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ مہدی صاحب غزل کے رموز سے واقف ہیں اور غزل کی زبان میں غزل کہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزلیت کے ساتھ نہایت نفاست ہے اور بے سروپا شاعری سے ان کی غزلیں کوسوں دور ہیں۔ پروفیسر مہدی علی نے غزلوں کے حسین ڈھاگوں میں نہایت خوش نما موتی پروئے ہیں جن کا لطف بھولا نہیں جاتا۔''
(نقی احمد ارشاد)

● ''برگ حنا کے شاعر (پروفیسر مہدی علی) نے غزل کے روایتی پیکر میں جس کرب کو پیش کیا ہیوہ ایک پوری نسل اور قوم کا کرب ہے، جس نے آزادیٔ وطن کے خواب دیکھے تھے اور اب ان خوابوں کی تعبیر دیکھ کر حیران ہے۔ یہ وہ نسل ہے جس نے کچھ خاص قدروں سے محبت کی ہے اور اب ان قدروں کے انہدام کا خاموش تماشائی ہے اور یہ وہ قوم ہے جس کے دل میں اپنی بے بسی کے غم کے ساتھ ساتھ اپنی عزت و ناموس کا احاس بھی زندہ ہے۔ شاعر نے اپنے آپ کو گزری ہوئی راتوں کا خواب، دیمک زدہ کتاب، وقت سے غروب ہونے والا آفتاب زندگی کے لئے عذاب اور سطح دریا پر نمودار ہونے والا حباب کہنے کے بعد جس طرح کے اشعار کہے ہیں وہ ایک خاص ذہنی کیفیت کا اظہار اور بظاہر شکست کے باوجود حوصلہ کے پست نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

دراصل یہ کیفیت صرف مہدی علی کا حصہ نہیں ہے۔ اس میں ان کی قوم کے ایسے بیشتر لوگ شریک ہیں جنہوں نے چالیس پچاس برس پہلے ترئینِ گلستاں کے نقشے میں خونِ جگر سے رنگ بھرا تھا۔ مگر آج ان کی نگاہوں کے سامنے باغ کا سارا منظر دھواں دھواں ہے اور وہ خود اپنی حیثیت کے بارے میں بے یقینی کی ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہیں۔ اس لئے برق و نیشمن کے استعارے میں پروفیسر مہدی علی نے اس پوری قوم کے احساسات کو پیش کیا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد تیزی سے روبہ زوال ہو رہی ہے۔

بہترین روایات اور صلاحیتوں کے مالک ہونے کے باوجود اپنی ناقدری کا احساس پروفیسر مہدی علی کی غزل گوئی کی اساس ہے۔ یہ انفرادی احساس ایک اجتماعی کرب سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شناخت بن گیا ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد)

● ''کلاسیکی شاعری اردو ادب کی روح ہے اور جو چند لوگ اسے زندہ رکھے ہوئے ہیں ان میں ایک نام پروفیسر مہدی علی کا بھی ہے۔ پروفیسر مہدی علی نے شاعری کو کبھی پیشہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک طرح کی عبادت سمجھا۔ شاعری کو نہ تو انہوں نے سیاسی استعمال کا ذریعہ بنایا نہ پرچم یا نعروں کی طرح کسی ازم سے جڑے رہے۔ ایک خالصدب کی تخلیق اور ادبی سرگرمی کو زندہ رکھنا ان کی زندگی کا مقصد رہا۔ خاموشی کے ساتھ بغیر کسی شور شرابے کے عبادت کی طرح شاعری کی اور اپنی غزلوں سے زندگی کے معنی کو کئی شکلیں عطا کیں۔

مہدی علی نے زندگی میں گھلنے والے رنگوں کو قرینے اور صفائی سے اپنی غزلوں میں پرو کر الفاظ کو نئے معنی عطا کئے، نئے محاورے گڑھے۔ شاعری کو انہوں نے عشق و محبت، ہجر و وصال کی بندھی ٹکی روایتوں سے ہٹ کر سماجی رشتوں سے ہمکنار کیا۔ انسانی رشتوں کی تشریح کی۔ ان کی غزلوں میں خوش گواری اور سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ موجودہ سماجی رشتوں کی عکاسی اپنی غزلوں میں انہوں نے بہتر ڈھنگ سے کی ہے۔ ان کی شاعری کلاسیکی رنگ اور لب و لہجہ اور نازک احساسات سے پُر ہے۔ ملک کے سیاسی، سماجی حالات کو بھی انہوں نے بہتر ڈھنگ سے شعری پیکر عطا کیا ہے۔

(فضل امام ملک)

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر جابر حسین

غزل اور مہدی علی

غزل ایک انتہائی حیرانگیز وسیلہ اظہار ہے۔ یہ انسانی ذہنی عمل کی طرح ایک پیچیدہ لیکن ناگزیر صنف ہے۔ اس کی حیرت انگیزی اس کی متضاد تعریفوں سے بھی نمایاں ہوتی ہے۔ کسی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا تو کسی نے نیم وحشی صنف سخن۔ غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہنا غزل کی فنی خصوصیات اور اس کی روح سے ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں ہونے کی علامت ہے۔ غزل کے ادبی اور تہذیبی ارتقاء میں مختلف تہذیبوں کے باہمی امتزاج کی بازگشت جاری و ساری ملتی ہے۔

جناب مہدی علی غزل کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ شاعری، ادب و ثقافت ان کی وراثت میں شامل ہیں۔ غزلیں کہنا ان کی مجبوری بھی ہے اور خاندانی روایات کی پاسداری بھی۔ ان کی غزلیں کلاسیکی روایات اور عصری تخلیقیت کے سبب فکر و فن کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں۔ الفاظ و تراکیب، رموز و علائم، سب کے سب وہی ہیں، جو غزلیہ شاعری کی جان ہیں۔ احساس کی شدت اور جذبے کی آنچ نے ان کی شاعری میں جان ڈال دی ہے۔ ان کی غزلیں کلاسیکی انداز فکر میں دور جدید کے کرب کا خوبصورت اظہار ہیں:

شادابی گلشن سے یہ اندازہ ملا ہے
اس سال گلستاں کو لہو تازہ ملا ہے

دوسری خوبی جو ان کے یہاں خاص طور سے نظر آتی ہے، وہ ان کی ناقدانہ بصیرت ہے۔ ان کے اندر چھپا ہوا نقاد جب اپنے آپ پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے تو اسے زمانے کی شکست کے ساتھ اپنی شکست کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اوقات ان کی غزلوں میں ان کے باطن کا انکشاف ہوا ہے۔

میرا مقصد مہدی علی صاحب کی غزلوں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں۔ جو باتیں ان کی غزلوں کے مطالعے کے دوران میرے ذہن میں آئیں میں نے انہیں قلم بند کر دیا ہے۔ یوں بھی میں غزل کو اچھی بری کہنے کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ غزل اپنے قاری یا سامع کو اس سطح پر جا کے پکڑتی ہے۔ غزل کا ہر شعر منفرد اور جداگانہ معنی رکھتا ہے اور اپنے پڑھنے یا سننے والے کو اس کے تجربات و مشاہدات اور اس کی ذہنی سطح پر ہی متاثر کرتا ہے۔ ممکن ہے کسی غزل کا کوئی شعر کسی کی تسکین بخشی کا ذریعہ ہو تو کسی اور کے لئے صرف الفاظ کی بازی گری ثابت ہو۔

◀◀ ● ▶▶

● شفیع مشہدی

مہدی علی - ایک بہترین دوست

مجھ سے جب یہ فرمائش کی گئی کہ مہدی علی صاحب کے بارے میں کچھ لکھوں تو جیسے یادوں کے خرمن میں ہلچل سی مچ گئی۔ ناسٹلجیا (Nostalgia) شعور پر حاوی ہوگیا اور آنکھیں بند کیں تو ذہن کے پردوں پر چار دہائیوں سے زائد کی یادیں دست و گریباں ہونے لگیں کہ مجھے لکھو۔ میں کسے لکھوں اور کسے چھوڑوں؟ اس کے لئے تو ایک دفتر چاہئے۔ ان گنت چہرے سرگوشیاں کرنے لگے۔ یادرفتگاں نے دل میں کسک پیدا کردی اور میں نے قلم رکھ دیا۔ شاید میرے لئے کچھ لکھنا ممکن نہیں تھا۔ مگر ڈاکٹر سہیل صاحب کا پھر فون آیا۔ میں ان کے خلوص کا قائل ہوں اس لئے ان کی فرمائش کو فہمائش سمجھتا ہوں۔ حکم تھا کہ لکھنا ہوگا۔

کہانی ۱۹۶۲ء سے شروع ہوتی ہے جب میں نے ملازمت شروع کی تھی اور مونگیر میں جوائن کیا تھا۔ عروس البلاد دہلی سے براہ راست مونگیر۔ ایسا لگتا تھا جیسے شہر سے ویرانے میں آ گیا ہوں۔ اجنبی شہر اجنبی لوگ، جی میں آتا تھا کہ واپس چلا جاؤں۔ ڈاک بنگلے میں قیام، سندھی ہوٹل میں طعام اور بے کیف شام سے بے حد الجھن ہو رہی تھی کہ اچانک کلکٹریٹ کے برآمدے میں حسنو بھائی (حسن امام ملک۔ چیواڑہ) سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایسے شفیق و مخلص کہ میرے درد کا درماں بن گئے۔ انہوں نے اظہار الحق صاحب سے ملوایا اور اظہار صاحب نے مہدی علی صاحب سے ملوایا۔ پھر یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ ڈاکٹر منصور صاحب، جسیم صاحب، حلیم صاحب، رام سروپ ضبط سیتاپوری، خلیل صاحب، پریمیشور پرشاد سنہا، حکیم باقر حسین شاعر لکھنوی، تقی صاحب شاعر بجنوری، شرف بہاری، مہدی حسن اور دیگر مخلصین کا ایسا حلقہ بنا کہ مونگیر میں گذارے مہہ و سال زندگی کا گراں قدر سرمایہ بن گئے۔ میں نے جو چند نام لئے ہیں ان میں اب جسیم صاحب، مہدی صاحب اور حسنو بھائی ساتھ دے رہے ہیں، بقیہ داغ مفارقت دے گئے۔ اعداد شمار کرتا ہوں تو سودا خسارے کا ہی رہا ہے۔

بہت جلد ہی میں مہدی صاحب کا پڑوسی بن گیا اور شب و روز ایسے گذرنے لگے کہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ میں تنہا تھا اس لئے میرا گھر کلب بن گیا تھا جہاں شام کو سارے لوگ یکجا ہوتے تھے۔ اظہار صاحب جیسے مخلص و سنجیدہ لوگ بھی اس محفل میں اپنی بذلہ سنجی پر اُتر آتے تھے اور مہدی علی تو محفل کی جان تھے ہی۔ انجمن رس گلہ خوران بنی، بزم احباب قائم ہوئی۔ ڈاکٹر منصور صاحب کی سنیچری (کھچڑی کی دعوت) اور شائے بن

لیمن (یعنی لیمون کی چائے) مہابیر کے رس گلے اور شاعری..... بس یہی اس میکدے کا مشغل تھا۔

ان دنوں مہدی صاحب جوان تھے اور میں نوجوان تھا۔ یہ رفاقت اتنی گہری ہوئی اور اتنی پائیدار کہ الفاظ میں اس کا بیان ممکن نہیں۔ مہدی علی کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ آپ کے والد جناب فضل علی خاں صاحب شادؔ کے شاگرد تھے اور ان کی کلاسیکی شاعری (جو ضائع ہوگئی۔) سن کر ہم دم بخود رہ جاتے تھے کہ ایسے گوہر نایاب، گمنام رہ گئے۔

یوں تو مہدی صاحب کی شخصیت میں بہت ساری خوبیاں ہیں مگر دو چیز ان کی شخصیت کو امتیاز عطا کرتی ہے ..... وہ ہے ان کی شاعری اور ڈائری۔ وہ پچھلے ساٹھ برسوں سے شاعری کر رہے ہیں اور تقریباً ستر برسوں کے شب روز کا مفصل حساب ان ڈائریوں میں محفوظ ہے۔ وہ کھانا اور سونا بھول سکتے ہیں مگر ڈائری لکھنا نہیں بھول سکتے۔ اس لحاظ سے ان کا نام گنیز بک آف ریکارڈ میں شامل ہونا چاہئے۔ میں نے ان کی ڈائریاں دیکھی ہیں۔ ہر صفحے پر کچھ Codes یعنی خفیہ نشانات بھی ہوتے ہیں جنہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ ان Codes کو وہی Decipher کر سکتے ہیں۔ ایک دو کوڈ مجھے معلوم تھے۔ ان سے جو اعداد و شمار نکلتے ہیں ''وہ رازہائے سربستہ'' کو افشاء بھی کرتے تھے اور عروج و انحطاط کا گراف بھی بناتے تھے۔ وضاحت کرنی ممکن نہیں کہ افشائے راز کا اندیشہ ہے اور امانت میں خیانت کا بھی پہلو ہے۔ اپنی علالت اور مجبوریوں کہ باوجود ڈائری جاری ہے۔

مہدی علی کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو ان کی سنجیدہ شاعری اور دوسری ظریفانہ۔ مجھے چونکہ دونوں ہی قسموں سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ ظریفانہ شاعری کو عام کرتے تو اردو کے صف اول کے مزاح نگاروں میں ان کا نام آتا۔ اس ظریفانہ شاعری کا وہ حصہ جسے وہ Non-Veg کہتے ہیں اور جسے چند ہی لوگ سن سکے ہیں، لاثانی ہے۔ دشواری یہ ہے کہ اردو تہذیب اسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

مہدی علی صاحب کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ وہ شریف آدمی ہیں اور ہر شریف آدمی کی طرح بیگم کے اسیر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مہدی صاحب کے ساتھ یہ محاورہ پورا اترتا ہے ''ہاتھ ہونا'' محاورہ ضرور ہے مگر خالق محاورہ نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ ہاتھ سر پر ہوتا ہے یا گریبان پر۔ میں وضاحت کر کے گنہگار نہیں ہونا چاہتا۔ میں بیگم مہدی علی کا شکر گذار ضرور ہوں کہ انہوں نے مجھے اتنی چائے پلائی ہیں، پان کھلائے ہیں اور ناشتہ کھلایا ہے کہ میں اس قرض کو تا زندگی نہیں اتار سکوں گا۔

مہدی صاحب کی دو تین کمزوریاں ہیں۔ ان میں سرفہرست پان اور بیگم ہیں۔ ان پر تساہلی اور کاہلی، کا الزام بھی دوست لگاتے تھے جو میری نظر میں غلط ہے۔ چونکہ بعض امور میں بلکہ خاص امر میں ان کی ''تیز گامی'' قابل رشک رہی ہے۔ [اللہ جانے اب کیا حال ہے]

یادوں کا ہجوم، شعور پر غالب ہے۔ بزم احباب کے افراد [جن میں بہت سارے ساتھ چھوڑ چکے ہیں] نگاہوں میں گھوم رہے ہیں۔ کس کس کا تذکرہ کیا جائے اور کن کن واقعات کو صفحۂ قرطاس پر لایا جائے..... یہ ممکن ہی نہیں ہے:

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

بیشتر حضرات ساتھ چھوڑ چلے۔ مہدی صاحب [اللہ ان کی عمر دراز کرے] محاورۃً ساتھ دے رہے ہیں ورنہ گوشہ نشین ہیں اور علالت سے معذور ہیں۔ یہ میری ستم گری ہی تھی کہ میں ایک دن زبردستی انہیں اپنے گھر پر ہونے والی نشست میں لے آیا تھا۔ غنیمت ہے کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی ہے تو پرانی باتیں یاد کر کے دل اداس ہوجاتا ہے۔ عجیب محفل تھی وہ جس میں ضبط صاحب اور منصور صاحب جیسے وضعدار بزرگ بھی تھے اور مجھ جیسا نوجوان بھی جسے بقول ڈاکٹر منصور صاحب ''ابھی تو تمہارے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔'' کھیل ختم ہوا۔ داستان باقی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ پوچھوں:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

◀◀ ● ▶▶

منظر اعجاز

کا

اولین شعری مجموعہ

ورق ورق اُجالا

شایع ہو چکا ہے

صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۲۰۰ روپے

رابطہ: 67/B پی سی کالونی

کنکڑ باغ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۲۰

● ڈاکٹر سہیل

ورق در ورق

''چولی دامن کا ساتھ'' ایک پرانی مثل ہے۔ علم اور مطالعہ کے لئے یہ مثل صادق آتی ہے۔ علم تو درسگاہوں میں حاصل ہوجاتا ہے مگر علم کی گہرائی اور فن کی گیرائی مطالعہ کے بغیر تشنہ کام رہتی ہے۔ علم حقیقت ہو یا علم معیشت، علم حیوانیات ہو یا علم نباتات، علم الٰہی ہو یا علم غیب، علم دین ہو یا علم الیقین، علم مجلس ہو یا علم کلام، سبھوں پر عبور مطالعہ کا محتاج ہے۔ پہاڑوں کی بلندی، سمندر کی گہرائی، اس کے تلاطم اور موجوں کے زیر و بم، کلیوں کا کھلنا، پرندوں کا چہکنا، آفتاب کی گرم شعاعیں، ماہتاب کی فرحت بخش ضیا پاشی، آسمان پر ستاروں کی درخشانی، برسات کی پھواریں، شمع پر پروانوں کی جاں نثاری، آندھیوں کی زد میں بھی اپنی بقا کے لئے چراغ کی زور آزمائی، توجہ اور دلچسپی کے ساتھ انہیں دیکھنے پرکھنے اور غور کرنے پر سبق آموز علم حاصل ہوسکتا ہے۔ فطرت کی ضاعی اور قدرت کے نظام کے صحیح مطالعہ کے بغیر یہ علم حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ان تمام علوم اور فنون کی کتابوں کے علاوہ ایک کتاب اور بھی ہے جس کے مطالعہ میں جانفشانی اور عرق ریزی کو بھی بہت حد تک دخل ہے۔ یہ کتاب ہے کتاب زندگی جس کا عنوان تو ایک ہے مگر ہر ورق کی تحریر الگ اور ہر باب کا موضوع جدا۔ اس میں پے در پے حالات بدلتے ہیں، نئے واقعات روز نمودار ہوتے ہیں۔ زندگی کہیں ایک حسین خواب ہے تو کہیں جان لیوا عذاب، کبھی دھوپ ہے تو کبھی چھاؤں، کبھی پا لینے کی خوشی تو کبھی کھو دینے کا غم، کبھی مسکراہٹیں ہیں تو کبھی آنسوؤں کی داستان، کہیں تشنگی ہے تو کہیں آسودگی۔ آج زندگی وہ ہے جس سے خلوص و مخلص ایسی ہجرت کر گئے ہیں کہ انہیں ڈھونڈنے کے سارے جتن بے سود، ایسی پر پیچ کتاب کا صحیح مطالعہ اور اس مطالعہ سے کچھ مرتب کرنا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔

جب قلم آمادۂ تحریر ہوا اور موضوع تحریر شخصیت نگاری، تو شخصیت کی تعمیر کے لئے ذہن کو آب و گل فراہم کرنے کی جستجو کرنی پڑی۔ شخصیت کسی کے اطوار، فطرت، عادت و خصلت، ادارک و فہم، فکر و فن کی مجموعی عکاسی کرتی ہے۔ زندگی میں پل پل بدلتے ہوئے حالات اور شب و روز نشیب و فراز سے دل و ذہن متاثر ہوتا ہے اور مجروح بھی اور جب دل و ذہن متاثر ہو تو شخصیت بھی فطری طور پر اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کسی کی شخصیت کا صحیح علم اس سے ذاتی قربت، اس کے تمام حالات کی بھرپور واقفیت، اس سے نجی تعلقات اور معاملات کے بغیر نہیں ہوسکتا اور پھر اس کی روشنی میں کشادہ دل، وسیع ذہن اور غیر جانبدارانہ نظریہ کے ساتھ پوری بصارت اور عقل و شعور کی حد میں مطالعہ کے بعد ہی ممکن ہے۔

شخصیت نگاری کا جوکھم اٹھانے کے لئے جب ذہن کمر بستہ ہوا تو غیر ارادی طور پر تصورات کی نظروں کے سامنے ایک شبیہہ نمودار ہوئی اور پھر ذہن میں تعمیر شدہ یادوں کے معبد کے دریچے پے در پے کھلنے لگے۔ پرانی یادیں

ذہن کے پردۂ بصارت پر آشکار ہونے لگیں اور گذری ہوئی باتیں حافظہ کے نہاں خانہ سے صدائے بازگشت بن کر پردۂ سماعت سے ٹکرانے لگیں اور رفتہ رفتہ وہ شبیہہ قریب سے قریب تر ہوتے ہوئے بالکل روبرو ہوگئی۔

ہلکا گندمی رنگ، گول چہرہ، ڈاڑھی اور مونچھوں سے عاری، اوسط قد، منھ میں گلوریاں، تجربات، علم اور فراست کی چمک سے بوجھل آنکھیں، بھاری بھرکم نپا تلا قدم، یادوں کے نقوش اور نمایاں ہوئے تو شبیہہ اور واضح ہوگئی۔ پتہ چلا وضع داری اور رواداری کے پیکر، وضع قطع، لباس، فطرت میں سنجیدگی، گفتار میں متانت، انداز رہائش، رکھ رکھاؤ، ہر اعتبار سے پرانی تہذیب کے پروردہ نظر آئے۔ ورنہ اس دور میں یہ خصوصیات نہ دیکھنے کو ملتی ہیں اور نہ میسر ہیں۔ محبت ہمدردی، دانشمندی یک رنگی، عاجزی، لطافت اور یک جہتی کی جیتی جاگتی تصویر:

یہی وہ تیر ہیں جو دل میں اُتر جاتے ہیں

ہم جلیسوں سے بے تکلف مگر تہذیب کے دائرہ میں۔ وقار و خودداری ہمیشہ عزیز رہی۔ غرض ایک مقناطیسی شخصیت جو ایک بار ملا وہ ان کی قربت کا اسیر ہوا:

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

وہ جس سے ملتے خوب ملتے۔ انداز ملاقات سے یہ اندازہ لگانا مشکل کہ ملنے والا ان کے لئے کتنا معتبر ہے یا کس حد تک ان کا معترض۔ ان کا شیوہ ہے۔

ہم کشادہ دل ہیں کشادہ مزاج ہیں
ہم کو راہ میں جو ملا دوڑ کر ملے

اپنی نجی زندگی اپنی خواہش اور شوق سے جینا پسند کرتے ہیں جس میں کسی کی دخل اندازی ان کے لئے قابل قبول نہیں۔ خانگی زندگی اپنی ہے، اور اپنے طور پر بسر کرنے کا حق سبھوں کو ہے۔ عوامی زندگی میں ضرورت کے مطابق حالات کے مطالبہ پر زندگی کو ڈھالنے کا ڈھنگ بھی وہ خوب جانتے ہیں۔

خطوط نویسی ان کا محبوب مشغلہ اور ان کی خوش خطی طباعت کا شبہہ پیدا کرتی ہے۔ عمدہ اور لذیذ کھانوں کے شوقین اور کھانے کے مواقع تلاش کرنے کی جستجو بھی ہمیشہ رہی۔ میٹھے کے دلدادہ ہمیشہ رہے، شاید اسی میں ان کی شیریں زبانی کا راز مضمر ہے۔ بے تکلف ملنے والوں میں کسی نے کوئی نئی چیز خریدی خواہ وہ جوتہ چپل ہی کیوں نہ ہو، اس کے افتتاح کی فرمائش میں انہیں لطف آتا اور پھر کم از کم چائے نوشی کا دور ضرور چلتا۔ دعوتوں میں (بصد احترام) دسترخوان پر محتاط نہیں رہتے مگر میزبان کے انتخاب میں احتیاط ضرور برتتے۔

ان کی نجی محفل لطافت آمیز گفتگو، مزاحیہ جملے بازی اور شعر و شاعری سے آراستہ ہوتی۔ انگریزی پڑھانا ان کا پیشہ۔ اس زبان کے ایک مستند استاد اور دیانت دار ممتحن۔ اردو سے والہانہ محبت اور فطری کمزوری۔ مغرب اور مشرق کی اس آمیزش نے ان کی شخصیت کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

شاعری وراثت میں ملی اور سرشت کا حصہ بن کر ان کا خوشگوار مشغلہ بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں

کے ذریعہ آدمی اور آدمی کے رشتوں کی پہچان کرائی۔

دوسروں کو ان کی سخنوری کا اعتراف ہے اور خود انہیں اپنے فن سخن پر اعتماد و رنہ یہ کیوں کہتے:

''یہ رنگ سخن اب تو پہچان ہماری ہے''

مشاعروں میں شریک ہوتے۔ چھوٹے پیمانے کا مشاعرہ ہو یا ملک گیر پیمانے کا، پھر بھی انکساری سے یہی کہتے:

اہل دل اہل نظر اہل قلم بیٹھے ہیں
ہم بھی محفل میں لئے اپنا بھرم بیٹھے ہیں

وہ انسان، استاد اور شاعر ہر حیثیت سے قابل قدر شخصیت کے مالک ہیں۔ اکثر ادبی اداروں سے منسلک رہے۔ اپنے کالج کے بزم اردو کے صدر تھے اور دوران صدارت موصوف نے بڑے بڑے جلسے اور مشاعرے منعقد کرائے۔

اردو انجمنوں کے معمار بھی ہیں۔ مونگیر جیسے شہر میں ایک ادبی انجمن کا قیام ان کا مرہون منت ہے۔ اس انجمن کے قیام نے اس شہر کی ادبی زندگی میں حرارت پیدا کی۔ اردو نوازوں کی ادبی تشنگی بجھائی۔ قلم کاروں کے ذوق کی تسکین ہوئی اور اس کے زیر سایہ اب بھی خدمت لوح و قلم ہو رہی ہے۔ یہ انجمن اس شہر میں اردو دوستوں کے لئے آبشار ادب بن کر صدقۂ جاریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے ستائیس برسوں تک اس کی آبیاری کی اور یکے از سرپرست رہے۔ اسے توانائی بخشی، قوت گویائی عطا کی اور ہر دلعزیز بنایا۔ ضابطے، اصول، انداز، روایت اور رواداری سے آراستہ کیا۔ اور اسے پھلتا پھولتا دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

یار کا گیسوئے پیچاں ہے یہ
شوق کا سلسلہ جنباں ہے یہ
دل فرہاد کی کاہش کہئے
دودھ کی نہر کی کوشش کہئے

اس ادبی انجمن کے اراکین فورم کو ایک گراں قدر تحفہ سمجھ کر بے حد عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اپنے مجموعہ کلام کو وہ اپنے ''خون جگر'' سے موسوم کرتے ہیں اور نوحوں کے مجموعہ کے متعلق کہتے ہیں کہ:

''یہ بیاض غم ہے میری ڈائری نہیں ہے''

زندگی کے تمام نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے اور ناموافق حالات اور غیر متوقع حادثات سے متاثر ہوتے ہوئے بھی یہ دعوت دینے کی ہمت رکھتے ہیں:

آ اے غم دوراں تجھے سینے سے لگالیں
دل میں مرے گنجائش آلام بہت ہے

مگر گنجائش کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب غم دوراں کو سینے سے لگانا حد سے گذرنے لگا تو دل کی دھڑکنوں نے محتاط رہنے کی تنبیہہ کرنا شروع کیا مگر اپنی عادتوں اور خصلتوں سے باز نہ آئے اور ہر تنبیہہ کو نظر انداز کرتے رہے کیونکہ شاعری ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے اور احباب کی صحبتیں نشاط ثانیہ۔ فکر یہ کہ کوئی چھوٹنے نہ پائے۔ اتنا ضرور کیا

کہ دل کو مضبوط رکھنے اور اس کی دھڑکنوں میں توازن قائم رکھنے کے لئے اسے ایک مددگار دے دیا جو ہر لمحہ ان کے دل سے قریب ہے اور اپنی ذمہ داری ایمانداری سے نبھا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دل میں محبوب کے ساتھ اس آلہ نے بھی جگہ پالی ہے۔ محبوب دل کو دھڑکنے کی ترغیب دے رہا ہے تو یہ آلہ ان دھڑکنوں کو متوازن رکھنے میں معاونت۔ غرض دونوں ہی نے دل میں گھر کر لیا ہے۔ ویسے ان کی فطری صلاحیت کا کمال ہے کہ اپنی زندگی میں رفیق سے گلے ملے اور رقیب کو بھی سینے سے لگانے میں تامل نہ برتا۔

آہستہ آہستہ وہ شبیہہ جو کچھ دیر قبل تصورات کی نظروں کے سامنے نمودار ہوئی تھی نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ یادوں کے دریچے رفتہ رفتہ بند اور حافظے کے نقوش دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگے۔

اپنی تحریر پر غور کیا۔ بار بار جائزہ لیا تو لگا کہ یہ شبیہہ پروفیسر مہدی علی کی ہے اور پھر یہ یقین ہو گیا کہ یہ شخصیت صرف اور صرف مہدی علی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں صحت کے ساتھ لمبی عمر دے، ان کی صحبت حاصل ہوتی ہو رہے، ان کی یادوں اور باتوں کی ہر ملاقات کے بعد تجدید ہوتی رہے۔ ترک شہر کے بعد ہر روز وہ نظروں کے سامنے تو نہیں ہیں مگر ہر لمحہ ہم سبھوں کے دل و ذہن کے قریب ہیں۔ اس شہر میں شاہراہ ادب پر گامزن ہر فرد یہ کہنے پر مجبور ہے:

وہ زمانہ گیا کہ تھے کچھ لوگ
راستے میں وفا کے راہ نورد

اقبال حسن آزاد

کا

تیسرا افسانوی مجموعہ

پورٹریٹ

عنقریب منظر عام پر

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر

● اقبال حسن آزاد

مہدی ہے جس کا نام

دلاور پور شہر مونگیر کا دل ہے۔ اس محلے میں آجکل جہاں پرار دو فورم کے رکن پروفیسر منصور احمد نیازی کا عالیشان مکان ایستادہ ہے وہاں پر کبھی ایک قدیم طرز کا مکان ہوا کرتا تھا۔ کھلا برآمدہ، گول ستون، موٹی موٹی دیواریں، چوڑا دالان، کشادہ ڈرائنگ روم اور اندر کئی کمرے اور آنگن۔ ۱۹۸۸ء کے زلزلے میں یہ مکان منہدم تو نہیں ہوا مگر مخدوش ضرور ہو گیا۔ چنانچہ مہدی صاحب نے اس کی طویل رفاقت کو الوداع کہا اور چند ماہ مختلف علاقوں میں گزارنے کے بعد بالآخر وہ پھر دلاور پور واپس آ گئے اور اپنے مونگیر کے کے قیام کے بقیہ ایام وہیں گزارے۔ میں مہدی علی صاحب کے اس پرانے مکان کے پاس ایک کمرے میں کرائے دار کی حیثیت سے مقیم تھا۔ نیا شہر، نئے لوگ، نئی آب وہوا، نئی زمین اور نیا آسمان..... یہاں قدم جمانے میں کچھ وقت لگا۔ بہر کیف میں جب بھی شام کے وقت ادھر سے گزرتا، چند خوش باش چہرے اس برآمدے پر فروکش نظر آتے۔ یہ سب کے سب سن رسیدہ لوگ تھے۔ فقیر کی نوجوانی کا عالم تھا۔ گھر اور اسکول کا ماحول کچھ ایسا رہا تھا کہ بزرگوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی لہذا ادھر سے گزرتے وقت میں نظریں نیچی ہی رکھا کرتا البتہ اتنا ضرور علم ہوا کہ اس گروپ میں جو صاحب کرسی نشیں نظر آتے ہیں ان کا نام نامی اسم گرامی پروفیسر مہدی علی ہے۔ آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج مونگیر میں انگریزی کے سینئر پروفیسر ہیں۔ مونگیر کا ہر طالب علم ان کا شاگرد ہے، کوئی نصابی اعتبار سے اور کوئی شعری حوالے سے، اس لیے کہ موصوف نہ صرف انگریزی کے اچھے استاد ہیں بلکہ شعر وسخن میں بھی استاد ہیں۔ مزید برآں کہ مونگیر کی واحد سرگرم ادبی انجمن اردو فورم کے کنوینر ہیں (اس وقت تک مونگیر میں کوئی دوسری ادبی انجمن قائم نہیں ہوئی تھی) اور پھر یہ کہ مشہور سیاست داں پروفیسر جابر حسین کے خسر محترم ہونے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ اب بھلا اتنی بھاری بھرکم شخصیت کے روبرو ہونے کا یارا مجھ جیسے کم سواد کو کیونکر میسر آتا۔ چنانچہ کئی مہینے بس اس کوچے میں سر جھکائے ہوئے آتے جاتے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے گزر گئے کہ:

صف اولیں تو ہے خاص صف وہاں پاؤں جائے کہاں شرفؔ
صف آخریں سے بھی دور تک جو نظارہ ہو تو وہی سہی

اور ان سے ملاقات کا شرف اس بندہ ءناچیز کو حاصل نہ ہو سکا۔

پٹنہ میں میرے ایک دوست ہوا کرتے تھے..... صفی منظر عرف منن میاں۔ وہ انگریزی ادب میں ایم اے

تھے۔ان کی تقرری بحیثیت انگریزی لکچرر کے آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج میں ہوئی۔حضرت جمال پور سے مع ساز و سامان کے براہ راست کالج پہنچ گئے۔وہاں انہوں نے اپنی جوائننگ دی۔شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کی ملاقات وہیں مہدی صاحب سے ہوگئی۔مہدی صاحب انھیں اپنے ساتھ لے کر اپنے دولت کدے پر آئے۔ انھیں کھانا کھلایا اور ان کا حال چال پوچھا اور ان کے احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کرنے لگے۔منن میاں نے انھیں اس حقیر پر تقصیر کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ کم بخت بھی شاید یہیں کہیں رہتا ہے۔اس وقت دن کے کوئی تین بج رہے ہوں گے۔میں کالج سے واپس آ کر حسب معمول قیلولہ فرما رہا تھا کہ کسی نے میری کنڈی کھٹکھٹائی۔اٹھ کر دروازہ کھولا تو مہدی علی کو اپنے دروازے پر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ذہن میں غالب کا شعر گونج اُٹھا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

درحقیقت میں انھیں اپنے دروازے پر دیکھ کر تھوڑا نروس ہوگیا تھا۔میں نے انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''آپ کے ایک دوست پٹنہ سے آئے ہوئے ہیں۔''

''میرے دوست..... پٹنہ سے.....کہاں ہیں؟''

''میرے گھر پر.....ان سے مل لیجیے۔'' اتنا کہہ کر مہدی صاحب چلے گئے۔میں نے کپڑے تبدیل کیے اور ان کے در دولت پر پہنچا تو دیکھا کہ منن میاں شکم سیر ہو کر ڈکاریں لے رہے تھے۔مجھے دیکھ کر منن میاں یوں کھل گئے جس طرح میلے میں کھویا ہوا لڑکا اپنے والدین کو دیکھ کر خوش نظر آنے لگتا ہے۔اس کے بعد منن میاں میرے ساتھ میرے کمرے میں آ ٹکے۔منن میاں تیز آدمی تھے۔دو ہی دن میں مہدی صاحب کے حلقۂ یاراں میں شامل ہوگئے۔روز وہاں جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے اور مجھے بھی مجبور کرنے لگے کہ میں بھی ان کے ساتھ چل کر ان بزرگوں کی صحبت سے فیض اُٹھاؤں۔چنانچہ میں بھی گاہے بگاہے ان کے ہمراہ مہدی صاحب کے در دولت پر جانے لگا مگر زیادہ تر سر جھکائے خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ دراصل اس بندۂ ناچیز کو بڑوں سے بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔میر تقی میر نے فرمایا ہے:

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

اور یہاں یہ حال تھا کہ:

کھُلنا کم کم زباں نے سیکھا تھا

میرے بزرگ دوست مرزا مشکور بیگ کا ایک مصرع ہے؛

'مگر اردو زباں نے میرے منہ میں بھی زباں رکھ دی'

ادھر یہ معاملہ ہوا کہ اردو فورم نے اس کم سخن کو سخنور بنا دیا۔

ایک روز مہدی صاحب نے دریافت فرمایا کہ کیوں جناب! آپ کچھ لکھتے بھی ہیں؟ میں نے شرماتے ہوئے جواب دیا کہ جی! کہانیاں لکھتا ہوں۔میرا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے۔میری بات سن کر کہنے لگے۔

''آپ شاعری کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی طبیعت تو موزوں لگتی ہے۔'' میں نے ان کی جانب حیرت سے دیکھا۔انھیں کیسے معلوم ہوا کہ میری طبیعت موزوں ہے۔انہوں نے تو اب تک میری کوئی چیز دیکھی بھی نہیں۔یہ ضرور تھا کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری ہی سے کیا تھا اور اسکول کے زمانے میں ہی میری نظمیں بچوں کے مختلف رسائل مثلاً کھلونا' نور' ٹافی' مسرت اور بچوں کا ڈائجسٹ وغیرہ میں شائع ہونے لگی تھیں۔اس کے ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی سامنے آتی رہی تھیں۔یہ سلسلہ کلکتہ کے قیام تک جاری رہا جہاں سے میں نے بی اے پاس کیا۔ یونیورسیٹی میں آنے کے بعد میں نے شاعری ترک کر دی تھی اور اپنا سارا دھیان افسانہ نگاری پر لگا دیا تھا۔مہدی صاحب کے دریافت کرنے پر وہی کیفیت ہوئی کہ'' آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔'' اب جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے میں اس حسینۂ دلنواز کی کج ادائیوں سے اچھی طرح واقف تھا لہذا اس کی جانب قدم بڑھانے سے ہچکچاتا تھا۔شاعری کرنا دشوار ہے مگر غزل کہنا دشوار تر۔تک بندی کر لینا اور لنگڑی لولی شاعری کر لینا اور بات ہے اور مرصع اور مسجع غزل کہنا اور بات۔ردیف' قافیہ' وزن' بحر کی پابندی تو الگ' یہاں تو قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ایطائے جلی' ایطائے خفی اور شتر گربہ جیسے عیوب سے بچ کر شاعری کرنا شاعری ہر کس و ناکس کی بات نہیں؛

'انھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد'

اور پھر الفاظ کی نشست و برخاست کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے بقول آتش:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بہر کیف مہدی صاحب سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ مختصر رہا کیونکہ میں نقل مکانی کر کے شاہ زبیر روڈ میں جا رہا۔ اس کے بعد چند ماہ کمیلا میں رہا۔پھر کبھی نیلم روڈ پر اور کبھی شاہ فیملی میں میرا قیام رہا۔اس پورے عرصے' جو کہ لگ بھگ چھ سالوں پر محیط ہے میں شاید دو یا تین بار مہدی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔جن دنوں میں نیلم روڈ میں مقیم تھا' میرے برادر نسبتی ڈاکٹر قیصر جمال ایک پیروی کے سلسلے میں میرے پاس آئے۔مہدی صاحب کے پاس ان کے کسی عزیز کی کاپی آئی ہوئی تھی۔میں نے زندگی میں کبھی بھی کسی بھی طرح کی پیروی نہیں کی تھی لہذا پیروی کے آداب سے ناواقف تھا مگر یہاں تو'' ساری خدائی'' والا معاملہ تھا' مجبوراً مہدی صاحب کے در دولت پر حاضری دینی پڑی۔مجھے دیکھ کر خوش تو ہوئے مگر جب میں نے مدعا بیان کیا تو ان کا مسکراتا ہوا چہرہ سنجیدگی کی دبیز چادر میں چھپ گیا۔مجھے گمان ہوا کہ شاید موصوف بھی میری طرح پیروی کی رسم کو ناپسند کرتے ہیں یا شاید مجھ جیسے ایرے غیرے کی پیروی سننا پسند نہیں کرتے اور میرا یہ گمان اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب میرے رول نمبر بتانے پر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ

مذکورہ کاپی ان کے پاس آئی ہی نہیں ہے۔ مجھے ان کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا کیونکہ میرے سالے صاحب اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے اور ان کی اطلاع کبھی غلط نہیں ہوسکتی تھی۔ بہرکیف میں اپنے اس پہلے پیروی و نیچر میں ناکام رہا۔ سچ کہا ہے کسی نے؛

"Practice makes a man perfect." اور یہاں عالم یہ تھا کہ پریکٹس تو دور کی بات کوئی بنیادی تجربہ بھی نہ تھا۔ بہرکیف بات آئی گئی ہوگئی۔

یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے جب میں نیلم روڈ کو خیرباد کہہ کر شاہ فیملی میں کرائے دار کی حیثیت سے آیا۔ ایک روز میرے عزیز دوست پروفیسر جوہر صاحب نے مجھے اپنے دولت کدے پر منعقد ہونے والی اردو فورم کی نشست میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں اس غیر متوقع دعوت کو پا کر خوش ہوا۔ گرمی کا موسم تھا' جوہر صاحب کے مکان کی کھلی چھت تھی۔ دھیمے دھیمے سروں میں کوئی دلنشیں گیت گنگناتی ہوئی ہوا تھی اور اردو فورم کی کہکشاں سجی تھی اور اس کہکشاں میں جو ستارے چمک رہے تھے' ان میں سے مسند نشیں پروفیسر مہدی علی' میزبان پروفیسر جوہر صاحب اور موجودہ کنوینر اردو فورم ڈاکٹر سید سہیل کے علاوہ جن اصحاب کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں ان میں جناب شوق مونگیری' مٹو بھائی' شہود بھائی' حاجی جسیم الدین احمد' ڈاکٹر تسنیم احمد صدیقی' جناب اختر حسین شیخپوروی' جناب حسن احمد صاحب' پروفیسر اسلام صاحب' ظفر رضوی صاحب' مرزا مشکور بیگ' سید اظہار الحق ایڈووکیٹ اور خواجہ صاحب وغیرہ شامل تھے۔ کچھ اور ممبران بھی تھے جو بعد میں کسی وجہ سے اس فورم سے علاحدہ ہو گئے یا انھیں Breach Of Trust کی وجہ سے فورم سے نکال دیا گیا۔ بہرکیف' اردو فورم کی اس نشست میں ایک مہذب' سنجیدہ' خوشگوار فضا قائم تھی۔ دھیرے گفتگو کرنے کا انداز' ہلکی چھیڑ چھاڑ' کچھ آپ بیتی' کچھ جگ بیتی.... اس محفل میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی طلسمی ماحول میں آگیا ہوں جہاں ہر طرف نور کی برسات ہو رہی ہے۔ اسی یادگار محفل میں اس کمترین کو اس کا رکن بننے کا شرف حاصل ہوا اور یہ بندہ تادم تحریر Without a break اس کا ممبر ہے۔ اردو فورم کا ممبر بننے کے بعد مہدی صاحب کو قریب سے دیکھنے' سننے اور جاننے کا موقع ملا۔ اس انجمن میں اول اول صرف شعری تخلیقات پیش کی جاتی تھیں مگر مہدی صاحب کو معلوم تھا کہ میں افسانے لکھتا ہوں چنانچہ انہوں نے اس کی نشستوں میں افسانہ خوانی کا اہتمام کرانا بھی شروع کرادیا۔ اس فورم سے منسلک ہونے کے بعد میں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے فن پر توجہ دینی شروع کی۔ مہدی صاحب میرے افسانے ذوق وشوق کے ساتھ سنتے اور اپنے نپی تلی رائے' ایک دو جملوں میں دیتے۔ اگر افسانہ پسند آتا تو کہتے 'واہ!' اور اگر ناپسند ہوتا تو فرماتے 'مزہ نہیں آیا۔' موصوف کا ذہن رومانی ہے اور اکثر وہ مجھ سے رومانی افسانے لکھنے کی فرمائش کرتے۔ میں ٹھہرا حقیقت پسند۔ حقیقت اور رومان میں میں بعد المشرقین ہے لہذا میں ان کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر رہا۔ آپ شب خونی ادب کے سخت ترین مخالفوں میں سے ہیں۔ اس سلسلے میں میں ان کا ہم خیال تھا۔

فورم میں میری شمولیت کے بعد انہوں پھر اس بات کو دہرایا کہ مجھے غزلیں کہنی چاہئیں۔ چنانچہ جب ان کی فرمائش پر میں نے غزلیں کہنی شروع کیں تو انھی کو اپنا استاد تسلیم کیا اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا شروع کیا

کیونکہ میں اس مقولے پر یقین رکھتا ہوں کہ ''گرو بنا گیان نہیں۔'' موصوف کے اصلاح دینے کا طریقہ بالکل سائنٹفک تھا۔ بس ایک دو جملوں میں اصلاح دے دیا کرتے۔ میں کوئی مصرع پڑھتا۔ وہ کہتے۔ ''فلاں لفظ کو بدل دیجیے۔'' کبھی کسی شعر پر یوں اصلاح دیتے۔ ''مصرع اولیٰ وزن میں نہیں ہے۔'' کبھی کہتے۔ ''فلاں شعر کے دونوں مصرعے الگ الگ بحروں میں ہیں۔ انھیں درست کیجیے۔'' ایک دفعہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو تقطیع آتی ہے؟ بولے' نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ کیسے سمجھتے ہیں کہ کہ کوئی مصرع وزن میں نہیں ہے یا خارج از بحر ہے؟ جواب دیا کہ میں تو آہنگ دیکھتا ہوں۔ میں نے یہ گر کی بات اپنی گرہ میں باندھ لی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے حتی المقدور علم العروض اور علم بلاغت کا مطالعہ کیا لیکن شاعری کرتے وقت مہدی صاحب کی تعلیم ہی کام آتی ہے۔ جب تک وہ مونگیر میں رہے' احقر نے استاد کو دکھائے بغیر کوئی غزل فورم میں نہیں سنائی' سوائے ایک موقع کے۔ ہوا یوں کہ میں اپنے صاحبزادے ثالث عرف ٹیٹو میاں کو لے کر ان کے پاس چلا گیا۔ ٹیٹو میاں اس وقت دو سال کے رہے ہونگے۔ جب وہ میری غزل دیکھنے لگے تو ٹیٹو میاں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ مہدی صاحب کی یکسوئی ختم ہوگئی اور انہوں نے غزل واپس کرتے ہوئے کہا کہ شام کو آیئے گا مگر شام کے وقت مجھے فرصت نہ مل سکی اور میں نے بغیر انھیں دکھائے وہ غزل فورم میں سنا دی۔ اس روز مہدی صاحب نے میرے کسی شعر پر داد نہیں دی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں بچے پیارے نہیں ہیں۔ اس کے بعد وہ جب بھی میرے یہاں اردو فورم کی میٹنگ میں تشریف لائے' ٹیٹو میاں کو بلا کر خاص طور پر انھیں پیار کرتے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب وہ پٹنہ شفٹ کر گئے تو شروع شروع میں وہ اکثر خط لکھا کرتے تھے اور ہر خط میں ٹیٹو میاں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے۔

صرف میں ہی کیا' اردو فورم میں شامل ہر شاعر ان کا شاگرد ہونے کا شرف رکھتا ہے۔ اردو فورم کے ایک نسبتاً کم سن رکن پرویز اقبال ہیں۔ اول اول وہ افسانے لکھتے تھے اور یہ ان کی سعادت مندی تھی کہ وہ اپنے افسانے اس ہیچمداں کو دکھایا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ بھی غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوگئے اور مجھ سے اصلاح لینے کے لیے آئے۔ اس وقت وہ اردو فورم کے ممبر نہیں بنے تھے۔ میں نے کہا کہ بھیّے! میں تو خود مبتدی ہوں' تمھاری صلاح کیونکر کر سکوں گا۔ تم ایسا کرو کہ استاد الاساتذہ مہدی صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ وہ کہنے لگے کہ مجھ میں مہدی صاحب کے رو برو ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ چنانچہ میں انھیں اپنے ہمراہ لے کر مہدی صاحب کے حضور میں حاضر ہوا۔ مہدی صاحب ان سے پہلے سے واقف تھے۔ دیکھ کر خوش ہوئے۔ میں نے انھیں عزیزی پرویز کے آنے کا مقصد بتایا۔ وہ یہ سن کر مزید خوش ہوئے کہ اب وہ شاعری کرنے لگے ہیں۔ انہوں نے پرویز سے غزل مانگی اور گاؤ تکیے پر نیم دراز' دھیرے دھیرے پان چباتے ہوئے' موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے جھانکتی مسکراتی آنکھوں سے غزل کو دیکھا اور پھر بولے' ٹھیک ہے۔ آپ شاعری کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پرویز اقبال غزل کی ہو کر رہ گئے۔ افسانہ نگاری وہ لگ بھگ ترک کر چکے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا کہ میں غزل کی اصلاح کے لیے ان کے پاس حاضر ہوا اور انھیں تاش کے پتوں میں الجھا ہوا پایا۔ میں اس وقت انھیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھتا اور معذرت کر کے اُٹھ جاتا۔

اردو فورم کی یہ روایت رہی ہے کہ اس کی نشستوں میں میزبان یا کنوینر اپنی جانب سے کسی دوست، عزیز و اقارب، صاحبِ سخن یا شہر میں آئے ہوئے کسی اہلِ قلم کو کو مدعو کر لیتے ہیں ایسے مدعوین کو مہمانِ خصوصی کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان مہمانانِ خصوصی کی تعداد اراکین فورم سے تجاوز کر گئی۔ ایسے مواقع پر کنوینر سے اجازت لینا لازمی تو نہیں لیکن رسماً ان سے پوچھ لیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک نشست میرے غریب خانے پر ٹھہری۔ میں اپنے ایک دوست کو، جو اس وقت اس فورم کے ممبر نہیں بنے تھے، مدعو کرنا چاہا مگر جب میں نے مہدی صاحب کے سامنے ان کا نام لیا تو موصوف نے ذرا بلند آواز میں کہا 'No!' چنانچہ میں نے اپنے دوست کو دعوت نہیں دی۔ اردو فورم کے ایک سینیئر رکن ہوا کرتے تھے مہدی صاحب کے ہمعمر تھے اور دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی مگر دونوں کے درمیان Love and hate والا Relation تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مہدی صاحب کئی ماہ تک مع اہل و ایال شہر سے باہر رہے۔ جب وہ لوٹ کر آئے ان کے دوست نے ایک خوبصورت افسانہ تحریر کیا جس کا عنوان تھا ''پرندے لوٹ آئے ہیں۔'' اس افسانے میں انہوں نے مہدی صاحب کی غیر حاضری اور اپنی دلی کیفیات کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا تھا۔ اس افسانے نے اراکین فورم کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ پھر ایسا ہوا کہ موصوف کسی بات پر اردو فورم سے خفا ہو گئے اور اس سے علاحدگی اختیار کر لی مگر مجھ سے ان کے تعلقات بدستور قائم رہے۔ اسی طرح جب ایک بار پھر میرے گھر پر نشست طے پائی تو میں مہدی صاحب کے پاس پہنچا اور ان سے اس بات کی اجازت طلب کی کہ میں انھیں مدعو کروں۔ مہدی صاحب نے مجھے اس کی اجازت دے دی۔ شاید ان کے دل میں یہ بات رہی ہو کہ شاید اس طرح ان کے یار کی خفگی ختم ہو جائے مگر یہاں یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ مہدی صاحب غضب کے قیافہ شناس اور فطرتِ انسانی کے نباض ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ آپ انھیں بلا تو رہے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ نہیں آئیں گے۔ آزمایش کے طور پر انہوں نے اپنے ڈرائنگ روم میں رکھے فون پر ان کے نمبر ڈائل کیے اور رسیور مجھے تھما کر اندر چلے گئے۔ ادھر سے جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو تو پہلے تو وہ میری آواز سن کر بہت خوش ہوئے مگر جب میں نے اردو فورم کی نشست میں آنے کی دعوت دی تو وہ بگڑ گئے اور اردو فورم اور خاص طور پر مہدی صاحب کے خلاف بہت ساری باتیں کہہ گئے اور انھیں مطلق العنان کا خطاب تک دے ڈالا۔ میں نے انھیں ان کے افسانے ''پرندے لوٹ آئے ہیں'' کا حوالہ دیا مگر وہ پھر بھی نہ پسیجے۔ اسی دوران مہدی صاحب کا شیر خوار نواسہ زور زور سے رونے لگا۔ جب اس کے رونے کی آواز ادھر پہنچی تو انہوں نے فوراً پوچھا ''آپ کہاں سے فون کر رہے ہیں؟''

''اپنے گھر سے۔''

''آپ کے گھر فون لگ گیا؟''

''جی ہاں!''

''نمبر کیا ہے؟'' میں انھیں نمبر کیا بتاتا کہ اس وقت تک میرے گھر پر فون ہی نہ لگا تھا۔ میں نے انھیں ایسے ہی ایک نمبر بتا دیا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔

''یہ بچہ کس کا رو رہا ہے؟'' میں نے جھٹ جواب دیا۔

''میرا۔'' مگر انھیں کچھ شک سا ہو گیا تھا لہذا انہوں نے فون رکھ دیا۔ ادھر اندر سے مہدی صاحب برآمد ہوئے۔ چہرہ تمتمارہا تھا مگر لبوں پر تبسم تھا۔ کہنے لگے۔

''ابھی ابھی Hot Line پر جو گفتگو ہوئی وہ میں نے Extention پر سن لی۔'' میں کیا کہتا۔ سلام کر کے لوٹ آیا۔ مہدی صاحب کے وہ دوست اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کی یہ ادا بہر حال لائق تحسین ہے کہ ایک بار جو اردو فورم سے نکل گئے تو نکل گئے پھر پلٹ کر نہیں آئے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مگر اس انجمن میں کچھ ایسے اراکین بھی ہیں جنھوں نے پہلے تو اس سے کنارہ کشی مگر پھر یہیں لوٹ کر آ گئے۔ بقول علامہ اقبال:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

کہتے ہیں کہ ہر جینون فنکار میں حس مزاح بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ مہدی صاحب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی معیت میں بیٹھنے والا کبھی بور نہیں ہو سکتا۔ ایک نشست میں میں نے جیسے ہی یہ مصرع پڑھا؛

گرچہ یہ دشمن زمانہ بر سرِ پیکار تھا

مہدی صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی اور وہ فوراً بول اُٹھے۔ ''کیا کہا؟ گرچہ یہ دشمن زنانہ.....'' میں نے جواب دیا۔ ''جی نہیں! دشمن زمانہ۔ ردیف ''تھا'' ہے ''تھی'' نہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ مہدی صاحب کے ذخیرے میں مزاحیہ کلام کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے مگر وہ اس طرح کا کلام کبھی سناتے نہیں تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ مصرع طرح پر بیک وقت دو غزلیں کہتے تھے۔ ایک سنجیدہ اور دوسری مزاحیہ۔ سنجیدہ غزل تو خود سناتے تھے اور مزاحیہ غزل کسی اور کو مرحمت فرما دیتے تھے۔ کبھی کبھی نجی محفلوں میں وہ ترنگ میں آ کر کوئی مزاحیہ شعر سنا دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مصرع طرح ملا؛

اس شہر کی فضا ہی چراغ آشنا نہ تھی

مہدی صاحب نے اس پر تضمین لگائی؛

بیکار ہر مقام پہ کھمبے لگا دیے

اس شہر کی فضا ہی چراغ آشنا نہ تھی

مہدی صاحب کے چھوٹے صاحب زادے ثمر کی شادی خانہ آبادی تھی۔ بارات پٹنہ جانے والی تھی۔ موصوف نے بیشتر اصحاب کو بارات میں شرکت کی دعوت دی مگر اس کمترین کو صرف ولیمہ کا کارڈ بھجوایا۔ میں چونکہ حضرت کے شاگرد ہونے کا شرف رکھتا تھا چنانچہ؛

یہ بات ''مجھ'' کو بہت ناگوار گزری تھی

احتجاجاً میں ولیمے کی تقریب میں شریک نہ ہوا۔اس تقریب سعید کے بخیر وخوبی انجام پا جانے کے بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو نہ انہوں نے میرے نہ آنے کا سبب پوچھا اور نہ میں نے وجہ بتائی؛

اس نے پوچھا بھی نہیں میں نے بتایا بھی نہیں

یہ بات اہل مونگیر کے سان وگمان میں بھی نہ تھی کہ پروفیسر مہدی علی کبھی اس شہر کو خیر باد کہہ کر کہیں اور جا بسیں گے۔انہوں نے جب اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تو ہم لوگ بالکل Speachles ہو کر رہ گئے۔آخر آخر تک لوگ اس گمان میں رہے کہ شاید وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ انھیں پٹنہ منتقل ہونا پڑا۔اپنی الوداعیہ نشست میں جب انہوں نے یہ مصرع پڑھا؛

ہمارے بعد اب رنگ بہاراں کون دیکھے گا

تو سارے اراکین فورم نم دیدہ ہو گئے۔جس روز مہدی صاحب یہاں سے رخصت ہو رہے تھے انھیں الوداع کہنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔مہدی صاحب سب سے گلے ملتے گئے اور روتے گئے۔

پٹنہ جانے کے بعد انہوں نے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے رفیقوں کو خط لکھتے رہے۔اب یہ سلسلہ موقوف ہو چکا ہے۔اکثر ایسا ہوتا کہ عین نشست کے دوران ان کا فون آتا اور وہ فرداً فرداً سب سے گفتگو کرتے۔اک دفعہ مصرع طرح ملا؛

ملے نہ پھول تو کانٹوں سے دوستی کر لی

دوران نشست جب ان کا فون آیا تو میں نے اپنی غزل کا مطلع انھیں سنا دیا؛

غزل مزاج تھا اقبالؔ کا کہاں مہدی
وہ نقش پا تھا ترا جس کی پیروی کر لی

سن کر بہت خوش ہوئے۔

اکثر پٹنہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔اگر کبھی موقع ملا تو ان سے ملنے چلا جاتا ہوں۔گرچہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور چلنے پھرنے سے معذور ہیں مگر فطری بشاشت اور حس ظرافت میں کمی نہیں آئی ہے۔خدا سے دعا گو ہوں کہ موصوف کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رہے۔(آمین)

◀◀ ● ▶▶

مہدی علی

تیری بزم ناز میں رات ہم جو جلائے دل کا کنول گئے
یہ چراغ کیسا چراغ تھا کہ چراغ بزم میں جل گئے

کبھی آہ بن کے نکل گئے کبھی اشک بن کے مچل گئے
جو سہارا ساز کا مل گیا تو یہ درد شعر میں ڈھل گئے

مرے دل میں کوئی بھی آرزو نہ ٹھہر سکی نہ پنپ سکی
یہ تو آنسوؤں کا نصیب تھا جو نظر پہ چڑھ کے بھی پل گئے

مری چشم آج بھی نم نہیں مجھے فکر رنج و الم نہیں
کوئی غم اگر ہے تو بس یہی مرے غم گسار بدل گئے

کوئی ربط خاص ضرور ہے مجھے تم سے کچھ تو لگاؤ ہے
نہ مرا نصیب سنور سکا نہ تمہاری زلف کے بل گئے

ذرا شوق سیر تو دیکھئے یہ خرام ناز تو دیکھئے
مری رہگذار خیال میں دبے پاؤں آ کے ٹہل گئے

وہ فضائے ارض بہشت تھی جہاں معصیت کا سبق ملا
یہ تو خیر اپنا جہان تھا کہ جہاں پہنچ کے سنبھل گئے

تمہیں مہدی اس کی خبر بھی ہے جو اُٹھا کے دوش پہ لائے تھے
تمہیں رکھ کے کنج مزار میں وہی یار چپکے سے ٹل گئے

◀◀ ● ▶▶

یوں میکدے کا راز سنبھالے ہوئے ہیں ہم
دل کا لہو نچوڑ کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم

خود سے اُڑا کے اپنے گریباں کی دھجیاں
دیوانگی کا نام اُچھالے ہوئے ہیں ہم

اے گردش حیات ہمارا لحاظ کر
مایوسیوں کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

یوں مسکرا کے اے نگہ فتنہ گر نہ دیکھ
اب تک تو اپنے دل کو سنبھالے ہوئے ہیں ہم

وہ رات جس میں ڈوب گئی نبض کائنات
ایسی سیاہ رات بھی ٹالے ہوئے ہیں ہم

توفیق غم نہیں ہے مگر اُف رے یہ ہوس
چادر سے جیسے پاؤں نکالے ہوئے ہیں ہم

یہ زیست کی طلب یہ تمنائے زندگی
کن بیڑیوں کو پاؤں میں ڈالے ہوئے ہیں ہم

مہدیؔ وہ اور ہونگے خوشی جن کو مل گئی
قسمت کی تیرگی کے حوالے ہوئے ہیں ہم

◀◀ ● ▶▶

مہدی علی

کس نے قائم رکھا پندار وفا میرے بعد
سر ہتھیلی پہ لئے کون بڑھا میرے بعد

معذرت خواہ ہوئی ان کی جفا میرے بعد
یہ بھی اک معجزۂ ہوش ربا میرے بعد

مرے ہمدم مری رفتار سے مایوس نہ ہو
راہ دکھلائے گا نقش کف پا میرے بعد

بن گئی میرے مقدر کی تڑپتی تصویر
پیچ کھا کھا کے رہی زلف دوتا میرے بعد

اب کہاں جانئے برق نگہ ناز گرے
دیکھئے آتی ہے کس کس کی قضا میرے بعد

میرے تلووں کا لہو چوسنے والے کانٹو
کیا کوئی اور نہیں آبلہ پا میرے بعد

ہم تو بازوئے ستم گر کو دعا کے چلے
اس طرح دے گا کوئی داد جفا میرے بعد

ہم تو محروم تماشا ہی رہے ہم سے نہ پوچھ
کب کھلا کیسے کھلا بند قبا میرے بعد

چھپ سکے گی نہ مرے خون کی سرخی مہدؔی
رنگ لائے گی ان ہاتھوں کی حنا میرے بعد

قطرۂ اشک مرے گر کے نہ ارزاں ہونا
تیری معراج تو ہ زینت مژگاں ہونا

دیدنی تھا وہ مرا چاک گریباں ہونا
اور ادھر آپ کا انگشت بدنداں ہونا

یہ ترا حسن تغافل بھی نئی بات نہیں
دیکھتے آئے ہیں سائے کا گریزاں ہونا

پھول کھلنے کو بیاباں میں بھی کھل جاتے ہیں
سب کی قسمت میں ہاں زینت داماں ہونا

چوم کر تجھ کو ترے آبلہ پا گذریں گے
ملتفت تو بھی ذرا خار مغیلاں ہونا

یہ بھی تفسیر ہے برگشتہ مقدر کی مرے
عارض حسن پہ زلفوں کا پریشاں ہونا

اور کیا ہوگی سوا لذت ایذا کوشی
دل کے ہر زخم کا خود آپ نمکداں ہونا

تیغ قاتل یہ مروت بھی تری خوب رہی
دور کھنچنا کبھی نزدیک رگ جاں ہونا

پارسائی بھی نچھاور مری توبہ بھی نثار
زیب دیتا ہے تجھے دشمن ایماں ہونا

یا شفق بن کے کھلے یا کف قاتل پہ جمے
خون مہدؔی کی تو فطرت ہے نمایاں ہونا

مہدی علی

مرا آنسو ترے دامن کو گوارا بھی نہیں
یہ تو ٹوٹا ہوا تارہ ہے شرارہ بھی نہیں

وہ تو کہئے ابھی زنجیر کی جھنکار ہوئی
تو نے اے فصل جنوں ہم کو پکارا بھی نہیں

ہو نہ ہو یہ مری تقدیر کی سازش ہو گی
بھول میری بھی نہیں جرم تمہارا بھی نہیں

آپ اس کشمکش دل میں کہاں سے الجھے
ربط بھی ہم سے نہیں ہم سے کنارا بھی نہیں

تو نے اے موج سفینے کا اُڑایا ہے مذاق
جب ڈبویا بھی نہیں پار اُتارا بھی نہیں

نا خدائی کے لئے موج بلا خود ہی بڑھے
میری کشتی کو تو تنکے کا سہارا بھی نہیں

کس کشاکش میں مریض غم اُلفت ہوگا
جو شفا پا نہ سکا اور سِدھارا بھی نہیں

فسانۂ غم الفت سنا کے کیا کرتے
کسی کے ضبط کو ہم آزما کے کیا کرتے

بجھا تو لیتے نشیمن کی آگ ہم لیکن
اک اور آگ دلوں میں لگا کے کیا کرتے

کسی نے گوشۂ دامن بڑھا کے کھینچ لیا
ہماری آنکھ میں آنسو بھی آ کے کیا کرتے

بھری بہار میں پھولوں پہ جب نکھار نہیں
تو دل کے زخم مرے رنگ لا کے کیا کرتے

وہ زندگی جو کوئی نقش بھی نہ چھوڑ سکی
ہم اس حیات کا نقشہ بنا کے کیا کرتے

الجھتے کس لئے زلف دراز سے اے دوست
اب اور طول شب غم بڑھا کے کیا کرتے

تھا اپنے ہاتھ میں دامن بھی اور گریباں بھی
مگر جنوں کو تماشا بنا کے کیا کرتے

ہنسی کے ساتھ کچھ آنسو اگر چھلک جاتے
تم ہی بتاؤ کہ ہم مسکرا کے کیا کرتے

سیاہیء شب غم دور تو نہیں ہوتی
چراغ دل کا بھی مہدؔی جلا کے کیا کرتے

مہدی علی

ملے وہ دل جسے پہلو میں ہم سنبھال سکیں
خلش بھی ایسی ملے جس کو دل میں پال سکیں

عجیب جبر مشیت مری حیات بھی ہے
کبھی تو اپنے ارادے سے اس کو ٹال سکیں

نگاہ ناز سے رنگ حنا کبھی تو چھٹے
وہ میری آنکھوں میں آنکھیں کبھی تو ڈال سکیں

تری نگاہ میں ایسا بھی تیر ہے ظالم
کہ جس کو کھینچ کے سینے سے ہم نکال سکیں

بھری بہار میں بس اتنا ہوش رہ جائے
اُٹھا کے بیڑیاں پاؤں میں اپنے ڈال سکیں

مرے نصیب سے مہدیؔ وہ دوست مل جائے
وہ سانپ جن کو کہ ہم آستیں میں پال سکیں

◀◀ ● ▶▶

کس طرح سے گذرے گی آج شام غم تنہا
ساتھ اب کہاں تک دے میری چشم نم تنہا

تھی زباں پہ بندش بھی ہونٹ پر بھی پہرے
کہہ گئی مگر سب کچھ میری چشم نم تنہا

تم ہی پھونک دو آ کر شعلۂ جگر میرا
آگ کیا بجھائے گی ایک چشم نم تنہا

آ کے میرے سانچے میں تم کبھی تو ڈھل جاؤ
کب تلک تراشیں ہم ذہن میں صنم تنہا

آپ تو مسرت کے پھول چن بھی لیتے ہیں
سہہ رہے ہیں ہم لیکن وقت کے ستم تنہا

وہ بھی اک زمانہ تھا دوستوں کی محفل تھی
زندگی گذرتی ہے آج بیش و کم تنہا

زہد و پارسائی کی کاش لاج رہ جائے
گھِر گئے ہیں رندوں میں شیخ محترم تنہا

اور بھی پیاسے تھے جاں بلب بہت سے تھے
پی گئے مگر مہدیؔ ہم ہی زہر غم تنہا

◀◀ ● ▶▶

مہدی علی

کچھ آہ بلب رہیے کچھ آنکھ کو نم رکھئے
مغمون نہ رہ کر بھی کچھ حسرت غم رکھئے

اس مشق ستم میں بھی انداز کرم رکھئے
ماتھے پہ شکن رکھئے کچھ زلف میں خم رکھئے

پی جائیے آنسو کو آنکھوں کو نہ نم رکھئے
میرا نہ سہی لیکن اپنا تو بھرم رکھئے

بہتر ہے کہ آئینہ شفاف رہے دل کا
اور بات اگر دل میں رکھئے بھی تو کم رکھئے

جو رنگ حنائی ہے وہ خون دل مہدیؔ ہے
تصویر کے دو رخ ہیں دونوں کو بہم رکھئے

◀◀ ● ▶▶

وارفتگیٔ شوق یہ تیرا کمال ہے
بیباکیوں کی زد میں بھی یہ اعتدال ہے

سونی پڑی ہوئی ہے مری بزم آرزو
اے پیکر خیال تجھے بھی خیال ہے

قربان جائیں اس لب خاموش کے تیرے
جس کا سکوت ایک مجسم سوال ہے

یاں تو وفور شوق میں ہم مسکرا دیئے
اور وہ سمجھ رہے ہیں طبیعت بحال ہے

گذری ہے کیسے فصل جنوں کچھ نہ پوچھئے
دیکھا نہیں جو میرے گریباں کا حال ہے

مہدیؔ کو اپنا غم بھی پریشاں نہ کر سکا
جا اے غم حیات تری کیا مجال ہے

◀◀ ● ▶▶

● مھدی علی

اردو فورم کیا ہے؟

اپنا فورم ہے رفیقوں کا گروہ
مشفقوں اور شفیقوں کا گروہ

نہ تو یہ جادہء گمراہی ہے
نہ تو یہ شغل ہوا خواہی ہے

یار کا گیسوئے پیچاں ہے یہ
شوق کا سلسلہ جنباں ہے یہ

دل مایوس کی امید ہے یہ
شب تاریک میں خورشید ہے یہ

دل فرہاد کی کاہش کہیے
دودھ کی نہر کی کوشش کہیے

سب کے سب اس میں برابر بھی ہیں
ہمنشیں بھی ہیں برادر بھی ہیں

اس میں سب پیر و جواں یکساں ہیں
اس میں سب خورد و کلاں یکساں ہیں

سب ہی دل پھینک ہیں سودائی ہیں
سب ہی اردو کے تولائی ہیں

قابل رشک ہے نظم فورم
قابل دید ہے بزم فورم

اس میں کچھ لذت گفتار بھی ہے
اس میں کچھ جراءت اظہار بھی ہے

لذت کام و دہن ہوتی ہے
اردو موضوع سخن ہوتی ہے

آئینہ صاف ہے حیرت کیسی ؟
اس جگہ گرد کدورت کیسی؟

◀◀ ● ▶▶

مکتوبات

● مذکورہ دو غزلیں آپ کے رسالے کے لئے ہیں، مجھے ان پیج میں بھیجنا نہیں آتا۔

نصیر احمد ناصر

● (۱) آپ نے جس محبت سے اصرار کیا ہے اس پہ اپنی کاہلی پہ شرمندہ ہوں آپ کے لئے ایک تازہ افسانہ لکھ رہا ہوں ممکن ہے کل تک پوسٹ کر سکوں گا۔
(۲) اسی افسانے کو رات بھی کی محنت سے ان پیج میں کنورٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ شاید ٹائپ کرنے میں کم وقت لگتا۔

عامر ابراہیم

● جی.....ای میل ایڈریس میں غلطی ہوگئی۔ پہلے ہی کافی دیر ہوگئی آپ کو افسانہ بھیجنے میں۔ شرمسار ہوں۔
عرض کر رہا تھا کہ نسیان کے لئے لگتا ہے بادام استعمال کرنا ہوں گے۔ میرا پوسٹل ایڈریس ای میل کے اختتام پر موجود ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

محمد حامد سراج

● جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ایک ادبی رسالے کا آغاز کر رہے ہیں، اگر چہ فی زمانہ یہ کام مشکل ہے لیکن ہمت بہر حال راستے نکال لیتی ہے، اگر آپ نے واقعی معیاری رسالہ نکالنے کا سوچ رکھا ہے تو جان لیجیے کہ بہت سے لوگوں سے آپ کے تعلقات خراب ہونے کا خطرہ ہے جسے آپ کو قبول کرنا ہوگا۔ آپ کے حکم کے مطابق میں آپ کو اپنا ایک افسانہ اور ایک نظم بھیج رہا ہوں، اسے دیکھ لیجیے گا۔ باقی بات آپ کا رسالہ آنے کے بعد ہی ہو سکے گی۔

علی اکبر ناطق

● میں نے چار مہینے بعد کسی رسالے کو کوئی چیز بھیجی وہ آپ ہیں۔ اپنے دوست خورشید اکبر کی فرمائش مہینوں سے ٹالتا رہا۔ مجھے یقین ہے آپ کا رسالہ کئی دریچوں کو روشن کرے گا۔ شاید مدت بعد کسی افسانہ نگار نے رسالے کے لئے سوچا۔ دیکھتا ہوں بھائی.....میرا خیال ہے شاید ابھی کسی فکشن ایٹر نے رسالہ نکالنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ میرا ایک ناول ہے ''اُڑنے دو ذرا''.....اس کی دو قسطیں آجکل اور ایوان اردو میں شایع ہوئی تھیں۔ اس ناول کے کئی صفحات بھیج دئے ہیں۔ مکمل کہانی کا ذائقہ۔ یہ ناول مئی ۲۰۱۴ء تک شایع ہوگا۔

مشرف عالم ذوقی

● آپ سے فون اور فیس بک پ باک کر کے اچھا لگا۔ ثالث کے متعلق تشہیر دیگر دستوں کو پسند آئی۔ پرچے میں مصاحبے، تراجم، علمی، ادبی، تنقید اور جدید ادبی نظریات پر مباحث شروع کریں۔ اس سے پرچے کے قدر ومنزلت میں اضافہ ہوگا اور اردو ادب کا دستاویزی جواز بھی بنے گا۔ اللہ پاک آپ کو سرخرو کرے۔ آمین

احمد سہیل

● ڈر ہے کہ مضمون کی طوالت سے آپ کہیں گھبرا نہ جائیں۔ لیکن غیر مطبوعہ کی آپ نے شرط رکھی تھی اس لئے یہ مضمون بھیج رہا ہوں۔ پڑھنے کے بعد شاید پسند آئے۔ صفدر امام قادری

● میں اپنے تئیں کوشش کرتا ہوں کہ افسانہ کے معیاری اسلوب بیان سے قاری کو دور حاضر کے فکری و علمی مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل سے بھی روشناس کرواؤں۔ میں کتنا کامیاب ہوں یہ آپ جیسے اہل علم اور دانشور قاری ہی بیان کر سکتے ہیں۔

'ثالث' کے لئے ایک افسانہ بعنوان 'یو۔ڈیم۔سالا' پیش خدمت ہے۔ گر قبول فرمائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اور احباب اکرام پسند فرمائیں گے۔ نعیم بیگ

● نیا افسانہ بھیج رہا ہوں۔ دیکھ لیجئے اگر معیار اور مزاج پر پورا اترے تو۔

منیر احمد فردوس

● سر... میل چیک کریں..... چار غزلیں ان پیج میں ارسال کی ہیں..... غیر مطبوعہ۔

ذوالفقار نقوی

● ثالث کے اجرا پر آپ کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے معیاری ادب کے فروغ کے لئے ثالث کا اجرا تاریخ ساز ثابت ہوگا۔

ثالث کے اس پہلے شمارے کے لئے اپنا افسانہ ''اک بات ذرا سی!'' پیش خدمت ہے، امید ہے شرف قبولیت بخشیں گے۔ محمد نعیم دیپالپور

● (۱) امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا. آپ کی گزارش کے مطابق ایک افسانہ برائے اشاعت مع مراسلہ پیش خدمت ہے قابل اشاعت سمجھیں تو شامل فرالیں.

(۲) سہ ماہی "ثالث" کا سالانہ چندہ کل آپ کے اکاونٹ میں جمع کرا چکا ہوں. میرا ارادہ تو لائف ممبر شپ کا تھا اس مرتبہ نہیں ہو سکا مستقبل قریب میں کوشش کروں گا انشاءاللہ.

● میں نے افسانے کے ساتھ کالج کا پتہ دیا تھا. ثالث مکان کے پتے پر بھیج دیں تو نوازش ہوگی. پتہ ہے علیم اللہ علیم

● امید ہے مزاج بخیر ہیں۔ شکریہ سر، یہ میرے لئے نہایت خوشی اور فخر کی بات ہے کہ میرا افسانہ کسی قد آور اور معیاری رسالہ کا حصہ بننے جا رہا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔

تصویر اٹیچمنٹ میں بھجوا رہا ہوں، مزید یہ بتائیے گا کہ کیا دوسری دو تحاریر اب آزاد ہیں، یعنی کیا آپ کو ان کی ضرورت ہے یا میں وہ کسی دوسرے رسالہ کو اب ارسال کر سکتا ہوں؟ عمر احمد بنگش

● (۱) آپ کے رسالے کے بارے میں جان بے حد خوشی ہوئی۔ انشاء اللہ آپ کو اپنی غیر مطبوعہ کچھ نظمیں جلد ارسال کروں گی۔

(۲) آپ کی ذرہ نوازی کے لئے ممنون ہوں۔ کچھ تخلیقات آپ کے رسالے کے لئے بھیج رہی ہوں۔ میری نیک خواہشات قبول کریں۔ تبسم فاطمہ

● ثالث کے اجراء کے لئے پیشگی مبارک باد۔ اولین شمارے کے لئے دو غزلیں حاضر ہیں، پسند خاطر ہوں تو شامل کر لیں۔ ممنون ہوں گا۔ امید ہے شگفتہ ہوں گے۔ سلیم انصاری

● میں آپ کے رسالے کے لئے اپنی تازہ نظم ارسال کر رہا ہوں۔ رسید سے نوازیں۔ رضی شہاب

● حسب الحکم چند تخلیقات مُرسل خدمت کر دیں گے اِنشاءاللہ۔ فی زمانہ خالصتہً ادبی جریدہ اشاعت آشنا کرنا سَر سے کُنواں کھودنے کے مترادِف ہے۔ اللہ مزید توفیقاتِ خاص ارزانی کرے آمین۔ پرویز ساحر

● میرا یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے جسے میں ثالث کے لئے ارسال کر رہی ہوں۔ از راہ کرم موصول ہونے پر مطلع کرنے کی زحمت کریں، میں شکر گزار رہوں گی۔ اگر اشاعت کے قابل نہ ہو تو ایک بار ضرور اطلاع کر دیں گے، تا کہ امید اور انتظار کا سلسلہ دراز نہ ہو۔ مہربانی ہوگی۔ شبنم افروز

◂◂ ● ▸▸

ادب کے زندہ لہو کی گردش

سہ ماہی ''آمد'' پٹنہ

مدیر اعزازی

خورشید اکبر

آزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ-۸۰۰۰۰۷

ثـــــالـــــث